جلد : 13 | شمارہ : 11

وَلَقَدۡ یَسَّرۡنَا الۡقُرۡاٰنَ لِلذِّکۡرِ فَہَلۡ مِنۡ مُّدَّکِرٍ (القران)

اور ہم نے قرآن کو سمجھنے کیلئے آسان کر دیا ہے تو کوئی ہے کہ سوچے، سمجھے (پ۲۷ سورۃ القمر)

ربیع الاوّل : 1441ھ | نومبر : 2019ء

خصوصی اشاعت

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی

ISSN : 2305-6231

ماہنامہ

جھنگ

اہل ثروت حضرات سے تاحیات زرِتعاون بیس ہزار روپے یکمشت	سالانہ زرتعاون بشمول خصوصی اشاعت اندرونِ ملک 800 روپے	معمول کا شمارہ 50 روپے

اس شمارے کی قیمت 400 روپے

ترسیل زر بنام : انجمن خدام القرآن (رجسٹرڈ) جھنگ

Web site:
lwww.hikmatbaalgha.com
lwww.hamditabligh.net

Email: hikmatbaalgha@yahoo.com

پبلشر: انجینئر مختار فاروقی

طابع: محمد فیاض، مطبع: سلطان باہو پریس فوارہ چوک جھنگ صدر

قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ صدر

پاکستان پوسٹ کوڈ 35200

047-7630861-7630863

اَلۡکَلِمَۃُ الۡحِکۡمَۃُ ضَالَّۃُ الۡمُؤۡمِنِ فَحَیۡثُ وَجَدَ ھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا(ترمذی)

حکمت کی بات بندۂ مومن کی گم شدہ میراث ہوتی ہے جہاں کہیں بھی وہ اس کو پائے وہی اس کا حقدار ہے

(ادارہ) یہ رسالہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو حوالہ ڈاک کر دیا جاتا ہے۔ نہ ملنے کی صورت میں 10 تاریخ تک دفتر رابطہ فرمائیں 10 تاریخ کے بعد رسالہ ارسال نہیں کیا جائے گا

اُن

عاشقانِ جمال ذات (باری تعالیٰ)

کے نام جو مستقبل

کی اس ناگزیر (اسلامی، فلاحی، جمہُوری)

عالمی ریاست کا آغاز کریں گے

جو اسلام کی (اُس) حکیمانہ توجیہ پر قائم

ہو گی جس کا نام

فلسفۂ خُودی

ہے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

'حکمتِ اقبال' کا انتساب

انتساب

ان مسلمان خواتین و حضرات کی
سعید روحوں کے نام

- جنہوں نے گزشتہ ایک صدی میں
احیائے اسلام اور احیائے خلافت
کی کوششوں میں
مال اور وقت کی قربانی دی
گھر بار کی قربانی دی
مصائب جھیلے وطن چھوڑا
جان بھی قربان کر دی
اور ہمارے لیے لازوال، انمٹ نقوش چھوڑے
کہ اس قافلے کو اب منزل کے قریب کر دیں اور

- جو آج اسی مقصد کے لیے خدا بیزار اور
خدا ناشناس __ انسان دشمن اور اخلاق دشمن قوتوں
سے نبرد آزما ہیں اور

- جو آئندہ بھی اس سنگلاخ راستے پر
نکل کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیں گے

حافظ عاکف سعید
- امیر تنظیم اسلامی
- ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی
- مدیر ”ندائے خلافت“

14 اکتوبر 2019ء

پیغام برائے ماہ نامہ ’’حکمت بالغہ‘‘

بموقع خصوصی اشاعت نومبر 2019ء بعنوان: ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی

علامہ اقبال بلاشبہ ایک بلند پایہ مفکّر ہی نہیں، مجوز و مبشرِ پاکستان بھی ہیں، اور اس حوالے سے پاکستان کا ہر مسلمان کئی اعتبارات سے ان کا احسان مند ہے۔ مزید برآں، وہ ملت اسلامیہ کے نقیب بھی ہیں اور منحوس صہیونی عالمی برطانوی سامراج سے آزادی کے علم بردار بھی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ و عالمی خلافت کے قیام کے حدی خوان بھی ہیں اور مجددِ فکرِ اسلامی بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ حکیم الامت بھی ہیں جن کے نزدیک ملت اسلامیہ کے زوال کا سب سے بڑا سبب قرآن مجید کو چھوڑ دینا ہے اور اس کا واحد علاج تمسّک و اعتصام بالقرآن ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا اقبال شناسی میں نمایاں نام ہے۔ وہ اقبال اکیڈمی پاکستان کے بانی ڈائریکٹر تھے اور ان کی تصانیف ’’آئیڈیالوجی آف فیوچر‘‘، ’’فرسٹ پرنسپلز آف ایجوکیشن‘‘ اور ’’حکمتِ اقبال‘‘ اہل علم کے نزدیک فکرِ اقبال کو عام کرنے کی اعلیٰ علمی سطح پر مدلل کوشش ہے۔

ماہنامہ ’’حکمتِ بالغہ‘‘ کی یہ کاوش قابل تحسین ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو فکرِ اقبال اور دو قومی نظریہ کے فروغ کا باعث بنائے اور اللہ ہمیں اس ملک خداداد پاکستان کو بانیانِ پاکستان کی نیک امیدوں اور اُمنگوں کے مطابق حقیقی معنوں میں اسلام کا گہوارہ بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

نظریۂ خودی
اور
اتباعِ رسول ﷺ

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

علامہ اقبال

اپنے آپ کو حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ (کا اتباع کر کے ان کے قدموں) تک پہنچا۔ اگر تو اُن تک نہ پہنچا تو سب کچھ ابولہبی ہے۔

تمہید

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

1 سورۃ الحشر(59) آیات 19-21

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَ اتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا (سامان) بھیجا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو بے شک اللہ تمہارے سب اعمال سے خبردار ہے

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾

اور ان لوگوں جیسے نہ ہونا جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ نے انھیں ایسا کر دیا کہ خود اپنے تئیں بھول گئے یہ بدکردار لوگ ہیں

لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ھُمُ

اہل دوزخ اور اہل جنت برابر نہیں اہل جنت تو

الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾
کامیابی حاصل کرنے والے ہیں

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾

اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم اس کو دیکھتے کہ اللہ کے خوف سے دبا اور پھٹا جاتا ہے اور یہ باتیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں

2 سورۃ ق (59) آیات 36-37

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِى الْبِلَادِ ط هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ ﴿۳۶﴾

اور ہم نے ان سے پہلے کئی اُمتیں ہلاک کر ڈالیں وہ ان سے قوت میں کہیں بڑھ کر تھے وہ شہروں میں گشت کرنے لگے۔ کیا بھاگنے کی جگہ ہے؟

اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ﴿۳۷﴾

بے شک اس میں نصیحت ہے اُس شخص کے لیے جو دل (زندہ) رکھتا ہے یا دل سے متوجہ ہو کر سنتا ہے

3 سورۃ الشمس (91) آیات 07-10

وَنَفْسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا ﴿۷﴾

اور (قسم ہے) انسان کی اور اس کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا

فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا ﴿۸﴾

پھر اس کو بدکاری اور پرہیزگاری کی سمجھ دی

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ﴿۹﴾

کہ جس نے (اپنے) نفس (یعنی روح) کو پاک رکھا وہ مراد کو پہنچا

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ﴿۱۰﴾

اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ خسارے میں رہا

صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِيْمُ

بارگاہِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں چند لمحات

1

أَلَا وَإِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً

خبردار! (انسان کے) جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے،

إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ

اگر وہ صحیح سمجھ رکھتا ہے تو سارا جسم صحیح (انداز میں) کام کرتا ہے

وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ

اور اگر وہ خراب ہو تو سارا جسم خراب کام کرتا ہے۔

أَلَا وَ هِيَ الْقَلْبُ

اور خبردار! وہ (گوشت کا ٹکڑا) دل ہے

(بخاری عن نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ)

2

(حضرت وابصہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرمایا:)

يَا وَابِصَةُ جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ وَالْإِثْمِ؟

اے وابصہ! کیا تم نیکی اور گناہ کے بارے پوچھنے کے لیے آئے ہو؟

قُلْتُ: نَعَمْ

میں نے عرض کی: جی ہاں

قَالَ: فَجَمَعَ أَصَابِعَهُ، فَضَرَبَ بِهَا صَدْرَهُ وَ قَالَ:

راوی کہتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیاں جمع کر کے ان کے سینے پر لگائیں اور فرمایا:

(اسْتَفْتِ نَفْسَكَ، اسْتَفْتِ قَلْبَكَ) ثَلَاثًا

اپنے آپ سے پوچھ، اپنے دل سے پوچھ۔ یہ تین مرتبہ فرمایا۔

اَلْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ، وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ

نیکی وہ ہے جس پر تمہیں خود اطمینان ہو اور جس پر تمہارا دل مطمئن ہو

وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَ تَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ

اور گناہ وہ ہے جو مَنْ میں کھٹکے اور دل میں تردد پیدا کرے

وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ

اگرچہ لوگ تمہیں اس (کے جواز) کا فتویٰ دیں

(مشکاۃ)

فرمودۂ اقبال

1

خودی کا سرِّ نہاں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
خودی ہے تیغ، فساں لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

2

مرا دل سوخت بر تنہائیٔ او
کنم سامانِ بزم آرائیٔ او
مثالِ دانہ می کارم خودی را
برائے او نگہدارم خودی را

3

نقطۂ نُورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل اُو در آرزو پوشیدہ است
علامہ اقبال

حرفِ آرزو

انجینئر مختار فاروقی

ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور مدیر حکمت بالغہ انجینئر مختار فاروقی

- حکمت بالغہ ___ قرآن اکیڈمی جھنگ سے جنوری 2007ء سے باقاعدگی سے شائع ہورہا ہے اور بحمد اللہ انگریزی مہینے کے آخری دن (WORKING DAY) کو حوالۂ ڈاک کردیا جاتا ہے۔ فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ وَ الْمِنَّۃُ

- حکمت بالغہ ___ کا یہ بھی اعزاز ہے کہ ہر سال کسی دینی، اسلامی اور ملّی موضوع پر ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اب تک کی خصوصی اشاعتوں کی بالترتیب فہرست درج ذیل ہے:

نمبر شمار	نام کتاب	تاریخ اشاعت	صفحات
1	حقیت انسان نمبر	دسمبر 2007ء	96
2	حقیقت علم نمبر	اگست 2008	96
3	احیاء العلوم نمبر	مئی 2009ء	96
4	دوقومی نظریہ اور پاکستان کا نظریاتی نظام تعلیم نمبر	دسمبر 2010ء	128
5	حقوقِ نسواں نمبر	جون 2011ء	112

6	یاجوج ماجوج نمبر	ستمبر 2012ء	152
7	الصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اکتوبر 2013ء	160
8	ہندو مسلم نظریاتی کشاکش......	نومبر 2014ء	168
9	حکمت اقبال ہی نظریہ پاکستان ہے	نومبر 2015ء	248
10	احیائے فکر اقبال نمبر	نومبر 2016ء	224
11	بادشاہ، پرنس، ارب پتی یا درویش حکمران	نومبر 2017ء	280
12	وسائل رزق پر قبضہ اور ارتکاز دولت کے شیطانی طریقے، بنی اسرائیل اور یاجوج ماجوج کا گٹھ جوڑ اور بچاؤ کا راستہ	نومبر 2018ء	304
13	ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی	نومبر 2019ء	336

خصوصی اشاعتوں کے عنوانات پر طائرانہ نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جریدہ قرآن اکیڈمی جھنگ کے قیام کے مقاصد کے عین مطابق جدید تعلیم یافتہ حضرات میں علومِ قرآنی (قرآن وحدیث) کے فروغ کی نقابت کا ایک خود اختیار کردہ فریضہ سرانجام دینے میں مصروف ہے۔ ماضی قریب کے معروف اہل دین و دانش حضرات سب کے سب متفق ہیں کہ مسلمانوں کے موجودہ زوال کا سبب اُمت کے بیشتر حصے کا قرآن مجید سے دُوری اور بے اعتنائی کا رویہ ہے اور اُمت مسلمہ کو بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان کو بالخصوص زوال اور مغرب کی غلامی سے نکالنے کے لیے واحد اور مستند علاج صرف اور صرف اُمت کے ذہین و فطین طبقہ کا قرآن مجید کے تعلّم و تعلیم میں عشق کی حد تک مصروف ہو جانے میں مضمر ہے۔ کسی قوم کا یہ ذہین طبقہ (INTELLECTUAL MINORITY) تعداد میں کم ہوتا ہے مگر قوموں کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑا فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ذہین و فطین طبقہ بگڑ جائے تو قوم بگڑ جاتی ہے اور زوال کا شکار ہو جاتی ہے اور یہ طبقہ راہِ راست پر آ جائے اور آسمانی ہدایت قرآن مجید کے دامنِ رحمت اور اللہ کے دامنِ عفو میں آ جائے تو قوم پر اچھے دن آ جاتے ہیں۔

◐ یہ بات بھی عیاں ہے اور حکمت بالغہ کے صفحات اس پر شاہد عادل ہیں کہ کوئی قوم جب تاریخ، ماضی اور اسلاف سے کٹ جائے، اپنی تاریخ بھلا دے تو ایسی قوم کا کوئی اجتماعی نصب العین نہیں رہتا۔ یہ مجموعۂ افراد غیر منظّم ہجوم کی طرح ہوتا ہے اور اس قوم کی مثال ایک

کٹی پتنگ کی طرح ہوتی ہے کہ خارجی حالات کا دباؤ اور ہوا کا کوئی جھونکا اسے دائیں سے بائیں لے جائے اور کچھ دیر بعد کوئی دوسرا جھونکا کسی دوسری طرف اس کو ہانک دے۔ ایسی قومیں دوسری زندہ اقوام کی غلام بن جاتی ہیں۔ دوسری اقوام جو بیدار ہوں اور اپنے ماضی و اسلاف سے وابستہ ہوں اجتماعی نصب العین اور اجتماعی آدرش کا شعوری احساس رکھتی ہوں وہ ایسی بے مقصدیت کا شکار اقوام کو غلام بنا لیتی ہیں۔ گزشتہ دو صدیوں سے پوری اُمت مسلمہ بے مقصدیت کے اسی صحرائے تیہ میں سرگرداں ہے اور مغرب کی غلام ہے۔

◐ علامہ اقبال نے مسلمان اُمت کو جگانے کے لیے اُن کو شاندار ماضی اور آخری آسمانی ہدایت قرآن مجید کی حامل اُمت ہونے کا اِحساس دلایا ہے اور آمادۂ عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ اقبال کا اُردو کلام 'بانگِ درا' اسی نکتہ کی وضاحت کرتا ہے۔ 'بانگِ درا' کے لفظی معنی ہی گھنٹی کی آواز ہے جس سے سفر پر روانہ ہونے والے قافلوں کو چلنے کا اشارہ ملتا تھا۔

ماضی میں علامہ اقبال کی اُردو نظمیں: شکوہ، شمع وشاعر، جوابِ شکوہ، ساقی نامہ اور طلوعِ اسلام وغیرہ اسی سمت میں قوم کو جگا کر آمادۂ سفر کرنے کا مؤثر ذریعہ بنیں اور آج بھی ہیں۔

◐ حکمت بالغہ کی خصوصی اشاعتوں میں ملّتِ اسلامیہ کو جگانے کے لیے جذبۂ عمل اُجاگر کرنے اور ذہین و باصلاحیت افراد کو قرآنی تعلیمات سے آگاہ کرنے کا جذبہ ہی کارفرما ہے اور اس عظیم مقصد کے لیے علامہ اقبال کے کلام اور تعلیمات کو ہی ذریعہ بنایا گیا ہے اور مسلمانانِ پاکستان میں اجتماعی سطح پر بیداری پیدا کرنے کا یہی واحد قابلِ عمل اور مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

◐ یہ بات بڑی خوش قسمتی کی ہے کہ علامہ اقبال بھی انھی لوگوں میں شامل ہیں جو ملّتِ اسلامیہ کو زوال سے نکالنے کے لیے قرآن مجید کی طرف مائل ہونے کو ہی واحد ذریعہ سمجھتے ہیں بلکہ زمانی اعتبار سے وہ پہلے ہیں یعنی 'الفضل للمُتقدّم' کے مستحق بھی۔ وہ مفکّر و مجوّزِ پاکستان ہونے کے ناطے بھی مسلمانانِ پاکستان کے محسن ہیں ان کا پیغام بھی یہی ہے کہ مسلمانوں کے غلامی سے آزادی کے سفر اور زوال سے عروج کی طرف پیش رفت قرآن کے دامنِ رحمت میں آئے بغیر ممکن نہیں۔

خوار از مہجورئ قرآں شدی　　　　شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

(تمہاری رسوائی کا اصل سبب قرآن مجید کو چھوڑ دینا ہے۔اب تم گردشِ زمانہ کی سختی کا شکوہ کر رہے ہو)۔

☆　اس عظیم مقصد کے لیے دوقومی نظریہ، فکرا قبال اور حکمت اقبال کو ہی احیائے ملت اسلامیہ پاکستان کے لیے ذریعہ سمجھ کر ہی یہ اشاعتی کام کیا گیا ہے۔اس مقصد میں وہ کس حد تک کامیاب رہا ہے یہ فیصلہ قارئین کے کرنے کا ہے۔

مدیر حکمت بالغہ ــــ علامہ اقبال ــــ ڈاکٹر محمد رفیع الدین

☆　مدیر حکمت بالغہ کا علامہ اقبال سے ذہنی تعلق انہی اسباب کی بنیاد پر ہوا اور آج تک قائم ہے۔ راقم نے جھنگ پوسٹ گریجویٹ کالج سے 1967ء میں انٹرمیڈیٹ (پری انجینئرنگ) کر کے UET لاہور میں داخلہ لیا۔اپنے گھریلو دینی ماحول، MINDSET اور سکول وکالج کلاس فیلو دوستوں کے اثرات سے لاہور میں جلد ہی ڈاکٹر اسرار احمد (معروف دینی شخصیت) سے رابطہ ہو گیا تھا۔غالباً ان سے پہلی ملاقات 4 جنوری 1968ء کو ان کے مکان واقع کرشن نگر (حال اسلام پورہ) میں ہوئی تھی۔اس وقت نہ انجمن خدام القرآن لاہور قائم ہوئی تھی نہ تنظیم اسلامی (موجودہ سیٹ اپ کے ساتھ) تھی۔سمن آباد میں ایک ہفتہ وار درسِ قرآن ہوتا تھا، اس میں شرکت کے لیے ڈاکٹر صاحب نے دعوت دی اور راقم اس میں (جب تک لاہور میں رہا) شریک ہوتا رہا۔ بعد میں یہ درس مسجد خضراء سمن آباد اور پھر وہاں سے مسجد شہداء شاہراہِ قائداعظم منتقل ہوا۔ بعد ازاں قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن اور کچھ وقفے کے بعد قرآن آڈیٹوریم لاہور میں منتقل ہو گیا۔یہ سلسلہ اب ان کی وفات کے بعد بھی ان کے فرزندِ ارجمند ڈاکٹر عارف رشید صاحب جاری رکھے ہوئے ہیں۔

UET کی لائبریری سے راقم استفادہ کرتا رہا بلکہ فارغ وقت عموماً لائبریری ہی میں گزرتا تھا۔انجینئرنگ کی درسی کتب کے علاوہ اضافی مطالعہ کے ساتھ ساتھ دینی مذہبی کتب کا مطالعہ مستقل معمول میں شامل رہا۔ 1968ء کے اوائل میں ہی لائبریری سے ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی کتاب 'قرآن اور علم جدید' ISSUE کرائی اور مطالعہ کرتا رہا۔اس کتاب کے مندرجات سے کئی سوالوں کے جوابات مل گئے اور کئی نئے سوالوں نے جنم لیا۔اس کتاب کو میں نے کئی ماہ زیرِ مطالعہ رکھا اور بالآخر خواہش پیدا ہوئی کہ اس کتاب کے مصنف سے ملا جائے۔

ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے معلوم کیا تو ملاقات کے لیے کسی صاحب نے بھی صحیح رہنمائی نہ فرمائی (یا میں کسی ایسے واقف حال اور اہل آدمی تک رسائی نہ کرسکا)۔ جون 1968ء میں سال اوّل کے امتحان سے فارغ ہوئے گرمیوں کی چھٹیوں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ایک ملاقات میں 'قرآن اور علم جدید' کے مطالعے اور صاحب کتاب ڈاکٹر محمد رفیع الدین سے ملاقات کی خواہش کا تذکرہ ہوا تو انھوں نے مصنف سے اپنے ذاتی مراسم اور تعلقات کی بنا پر رہنمائی فرمائی اور ملاقات کی سبیل بھی پیدا فرمادی۔

☆ ڈاکٹر محمد رفیع الدین سے راقم کی ملاقات جولائی 1968ء کی ہے۔ یہ ملاقات ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی رہائش گاہ واقع چوبرجی پارک، چوبرجی سے سمن آباد کی طرف جانے والی سڑک پر پہلی ہی بائیں طرف والی گلی پر ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں کافی سوالات زیر گفتگو رہے ان کے پاس بھی کچھ وقت تھا۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چند ملاقاتوں تک پھیل گیا۔ اسی ملاقات میں انھوں نے "ISLAMIC EDUCATION" کا پہلا شمارہ بابت مارچ/اپریل 1968ء بھی عطا فرمایا جو میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ (اس کے پہلے صفحہ کی فوٹو کاپی ضمیمہ جات میں شامل ہے) اس کے بعد ان کی وفات تک تمام شمارے راقم نے حاصل کیے اور مطالعہ بھی کیا۔ ان کی دوسری کتابوں سے بھی تعارف حاصل ہوا اور اُن سے استفادہ کی اپنی حد تک کوشش بھی کی۔ پہلی ملاقات میں ہی "ISLAMIC EDUCATION" کا پہلا شمارہ عطا فرمانے پر راقم کی دلجوئی کے لیے انھوں نے میرے لیے ابتداء میں موجود فارسی اشعار کا ترجمہ اور مختصر تشریح بھی فرمائی۔ ان کا انداز اور لہجہ انتہائی مشفقانہ تھا جس کی چاشنی راقم کو اب بھی یاد آنے پر محسوس ہوتی ہے۔

☆ ڈاکٹر محمد رفیع الدین سے ملاقات میں ہی ان کے فرزند برادر شجاع الدین صاحب سے بھی خاص طور پر ملاقات ہوئی کہ موصوف بھی اس وقت UET میں ہی الیکٹریکل انجینئرنگ کے شعبے میں سال دوم کے طالب علم تھے۔ راقم نے سول انجینئرنگ کا شعبہ حاصل کیا تھا پھر ایک سال کا فرق بھی تھا۔ یونیورسٹی میں کبھی کبھی سر راہے ملاقات ہوجاتی تھی۔ (یہ بات یاد رہے کہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے ماحول میں اس وقت حد درجہ تعلیمی مصروفیت رہتی تھی اور پھر DAY SCHOLARS کے لیے آپس میں اس طرح ملاقات کا موقع بہت کم ہوتا تھا۔ البتہ راقم

آخری سال یونیورسٹی ہوسٹل (102-طارق ہال) میں قیام پذیر رہا)۔

☆ افسوس کی بات ہے کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کا ایک حادثہ میں، نومبر 1969ء کو کراچی میں موقع پر انتقال ہو گیا جس سے رابطہ اور ملاقات کے جانفزا لمحات کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

یونیورسٹی میں قیام اور پھر ہوسٹل میں قیام کی وجہ سے راقم نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اس وقت کی تمام کتابیں حاصل کر کے مطالعہ کر لیں (صاف ظاہر ہے یہ مطالعہ کوئی تحقیق یا ڈگری کے لیے نہیں تھا صرف دینی معلومات اور مزاجاً دین سمجھنے کے لیے ہی تھا اور اپنی ذہنی سطح کے مطابق ہی تھا)۔ 1971ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد کام کے سلسلے میں لاہور سے باہر رہا۔

☆ راقم لاہور سے کچھ عرصہ باہر قیام پذیر ہونے کے بعد دوبارہ 1974ء تا اوائل 1977ء کا عرصہ لاہور میں قیام پذیر رہا ہے مگر ڈاکٹر رفیع الدین کے حلقہ احباب اور ان کی سرگرمیوں سے زیادہ رابطہ نہ قائم ہوسکا۔ ڈاکٹر اسرار صاحب کی وساطت سے چودھری مظفر حسین کی رہائش گاہ فرینڈز کالونی جانے کا ایک سے زیادہ دفعہ اتفاق بھی ہوا مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔

☆ راقم 77ء سے 87ء تک کراچی میں رہا۔ کراچی میں 80ء میں نوائے وقت جاری ہوا تو اس میں راقم کے کچھ مضامین ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور ان کی تعلیمی کاوشوں کے بارے میں شائع ہوئے، مگر کاروباری مصروفیات کی وجہ سے تحریر کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

قرآن اکیڈمی جھنگ اور حکمت بالغہ کا اجراء

☆ 1987ء میں کراچی سے کاروبار سمیٹ کر واپسی ہوئی تو کئی جگہ پیشہ ورانہ مصروفیات رہیں اور دینی مصروفیات بھی ساتھ تھیں۔ پھر ڈی جی خان، ملتان، لاہور، واہ کینٹ، پنڈی اور ملتان میں وقت گزار کر راقم جولائی 98ء میں جھنگ دوبارہ منتقل ہوا تو حالات ایسے تھے کہ جھنگ میں قرآن مجید کی تعلیمات کے فروغ کے لیے انجمن خدام القرآن جھنگ کی تشکیل ہوئی۔ 2002ء-2003ء میں اکیڈمی کی عمارات ایک حد تک تکمیل پذیر ہوئیں تو دینی کام باقاعدگی سے اور بہتر انداز میں جاری ہو گیا اور الحمدللہ اب تک جاری ہے۔

☆ 2006ء میں 'حکمت بالغہ' کے نام سے ایک ماہنامہ کا ڈیکلریشن حاصل کر لیا تھا اور

جنوری 2007ء میں حکمت بالغہ کا پہلا شمارہ جاری ہوا جواب تک جاری ہے۔اسی جریدہ میں دیگر کئی اہم شخصیات کے علاوہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب کی کتاب حکمت اقبال کے کئی ابواب اور دیگر چند مضامین شائع ہوکر قارئین تک پہنچے ہیں۔ڈاکٹر شفیق عجمی صاحب کا ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے بارے میں ایک سوانحی خاکہ بھی شائع ہوا تھا(مئی 2011ء)۔اوراب یہ خصوصی اشاعت اسی سلسلہ کاCLIMAX ہے،جوآپ کے ہاتھوں میں ہے۔

☆ راقم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی قائم کردہ دینی جماعت تنظیم اسلامی سے 1985ء میں وابستہ ہوگیا تھا اوراب تک یہ سلسلہ بحمد اللہ جاری ہے۔ڈاکٹر صاحب مرحوم کی وفات 2010ء کے بعداب حافظ عاکف سعید صاحب مدظلہ اس قافلے کے امیر ہیں۔

---

2 رسالے کا اُسلوبِ بیان اور مضامین کی تقسیم

☆ حکمت بالغہ کا تیرھواں خصوصی شمارہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ اس شمارے کا موضوع خالص علمی و تحقیقی ہے مگر اس جریدہ میں اس موضوع پر جو مواد پیش کیا گیا ہے اس کا انداز، لہجہ اور اسلوبِ بیان پوسٹ گریجویٹ لیول کے کالجوں اور یونیورسٹیوں (جامعات) میں پیش کیے گئے تحقیقی مقالہ جات جیسا نہیں ہے۔

☆ ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی کے لیول پر جو مقالہ جات پیش کیے جاتے ہیں وہ کسی طالب علم کو اس کے ذوق یا وقت کی ضرورت یا اس کے استاد اور یونیورسٹی کے پیش نظر کوئی مسئلہ (یا قضیہ) ہوتا ہے جس کی کھود کرید اور متعلقہ مواد کی فراہمی کی خود ہمت نہیں پاتا یا فرصت کے لمحات میسر نہیں ہیں یا کسی سرکاری ادارے کو کسی خاص موضوع پر تحقیقی مواد درکار ہوتا ہے۔ ایسی تحقیق کو روبعمل لانے کے لیے ہر ایک طالب علم کے ساتھ ایک سینئر پروفیسر نگران کے طور پر متعین ہوتا ہے تاکہ وہ تحقیق کے طریق کار، اس سے مطلوبہ مواد کی فراہمی کے ذرائع کی نشاندھی اور دستیابی سے متعلق متعلقہ طالب علم کی رہنمائی بھی کرتا رہے، تعاون بھی کرتا رہے اور مشفقانہ سرپرستی کے ساتھ ہمت بھی بندھاتا رہے اور مختلف مراحل پر پیش رفت میں تاخیر پر طالب علم کو مایوسی سے بھی بچاتا رہے۔ پھر حاصل شدہ مواد کو پیش کرنے کا انداز بھی علمی اور بین الاقوامی کی جامعات کا سا اختیار کیا جاتا ہے تاکہ زیر بحث جو مقالہ تیار ہو کر پیش ہوگا وہ اہل علم اور اہل نظر کی نگاہوں میں آئے گا تو اس سے اس جامعہ کے معیارِ تحقیق اور اساتذہ کے انداز تعلیم اور معیار تحقیق کا اچھا تاثر پیدا ہو۔

☆ جامعات میں کی جانے والی تحقیقی مساعی اور اس میں شریک اساتذہ اور طلباء کا مقصد تحقیق و جستجو، نگران کے لیے ایک وظیفہ ملازمت اور طالب علم کے لیے ایک ڈگری کا حصول ہوتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے اچھی ملازمت حاصل کر سکے یا موجودہ ملازمت کو UPGRADE کر سکے اور ایک یا دو سکیل کی ترقی شمار کی جا سکے، اس سے آگے دینی وملیّ تقاضے اِلا ماشاءاللہ بہت کم پیش نظر ہوتے ہیں۔

☆ جامعات کی ان تحقیقی مساعی میں تحقیق کی کئی راہیں بند ہوتی ہیں اور

PROHIBITED AREA شمار ہوتا ہے۔ مثلاً امریکہ WOMENLIB کے ذریعے قانون سازی کرا کے ہماری دینی و مذہبی روایات کیوں ختم کرنا چاہتا ہے؟ تمبا کو (SMOKING) مضرِ صحت ہے تو سگریٹ بنانے کی فیکٹریاں بند کیوں نہیں کر دی جاتیں؟، امریکہ افغانستان کیوں آیا تھا اور اب جانے کی جلدی میں ہے تو کیوں؟، امریکہ میں RAND کارپوریشن کیوں بنائی گئی اور وہ اسلامی ممالک میں کیا کرتی رہی ہے؟ یا امریکہ میں 9/11 کے واقعے کا کون مجرم ہے؟، صرف میڈیا (اخبارات و رسائل و الیکٹرانک میڈیا) پر دستیاب مواد سے ہی کوئی حتمی نتیجہ کیوں نہیں نکالا جاسکتا! ممکن نہیں ہے، ہماری جامعات میں اسلامی روایات، پردہ، نماز، SEGREGATION OF SEXES پر مسلمان ہو کر بھی ہمارے ہاں اس پر مذہبی روایات کیوں دم توڑ رہی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اس موضوع کو ہاتھ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس سے مغربی بیانیہ کی ترویج اور زبردستی ٹھونسنے کے مشن سے ہے اور اگر کوئی جامعہ اس میں ہاتھ ڈالے تو اس کی ریٹنگ منفی ہو جائے۔ مغربی یونیورسٹیوں کے وظائف اور تعلیمی سہولتوں کے دروازے بند ہو جائیں گے وغیرہ۔

☆ اس خصوصی اشاعت میں پیش کی جانے والی یہ معلومات اپنے مقاصد، طرزِ تحقیق (یعنی حقیقت تک رسائی) اسلوبِ بیان اور وسائل کی فراہمی کے لحاظ سے بہت مختلف ہے۔ اس اشاعت میں ہمارے سامنے صرف مسلمانانِ پاکستان، ملت اسلامیہ اور اسلامی فرائض (QURANIC OBLIGATIONS) کے سوا کچھ نہیں ہے اور اس کے فروع کا مقصد بھی احادیث نبویہ میں واضح طور پر معین کر دیا گیا ہے کہ قربِ قیامت کے خلافت اسلامیہ کسی ملک میں وقوع پذیر ہو کر (غلبہ حاصل کر کے) دوسرے ممالک میں بھی 'تصدیر' (EXPORT) کے مراحل طے کرے گی اور بالآخر GLOBAL ہو جائے گی۔

☆ فکر و حکمت اقبال ہمارے نزدیک صرف اس لیے اہم ہیں کہ یہ ریاست پاکستان کی بنیادی فکر ہے اور پاکستان کو دنیا میں عزت کا مقام دلانے کے لیے اس فکر کو عملاً پاکستان میں اور بعد ازاں پوری (معلوم) دنیا تک پھیلانا ہوگا۔ اس نیک کام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینا ہر مسلمانِ پاکستان کا فرض بنتا ہے۔

☆ اوپر درج جملہ کوئی جذباتی یا ہیجانی کیفیت کا اظہار نہیں بلکہ قرآن مجید، احادیث

مبارکہ،فکرِاقبال اورتاریخ اسلامی اور بالخصوص جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی تاریخ ،صیہونی برطانوی سامراج کی آمداور مسلمانانِ ہند کا ایک علیحدہ وطن کا حصول اس بات کی طرف غمازی کرتا ہے جو فرمانِ رسالت ﷺ میں بیان ہوئی۔قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت محمد ﷺ ساری دنیا کے لیے آخری نبی اور رسول کے طور پر مبعوث ہوئے ہیں (09:61)۔عرب میں اللہ کے دین کا غلبہ آپ ﷺ کے دست مبارک سے اورآپ کی زندگی میں ہی ہوگیا تھا،اب عالمی اسلامی غلبہ یا عالمی خلافت اسلامیہ کا قیام(جس کے بارے میں قرآن کے الفاظ ہیں وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ اور وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ متقاضی ہیں کہ) کافروں اور مشرکوں یعنی یہود، نصاریٰ اور ہنود کے گٹھ جوڑ کے باوصف ہوکر رہے گا۔احادیث میں بھی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں صاف الفاظ ہیں کہ قیامت کے قریب اسلام پورے روئے ارضی پر غالب ہوکر رہے گا۔کلام اقبال کا حاصل بھی (اسی حدیث کے حوالے سے) یہی ہے

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری　　مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری　　تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

تاریخ انسانی کا منطقی نتیجہ بھی یہی ہے کہ ایک مرتبہ عالمی اسلامی جمہوری فلاحی حکومت ضرور قائم ہوگی اوراسی کا نام خلافت علیٰ منہاجِ النّبوۃ ہوگا۔

☆ 　لہٰذا عوامی سطح پر ابلاغ کے لیے مساجد میں جمعہ کے بیانات میں،قرآن وحدیث کے ذریعے مذہبی اجتماعات میں علماء حوالہ جات کے ساتھ سمجھائیں گے۔سکولوں کالجوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں تاریخ کے حوالے سے اور عوامی سطح کے اجتماعات میں کلامِ اقبال سے یہی حقیقت ذہن نشین کرائی جائے گی کہ اسلام کا نظامِ خلافت دوبارہ آئے گا اوراب وہ عالمی (GLOBAL) ہوگا۔

☆ 　یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ پاکستان میں تاحال جدید اور قدیم علوم کے حامل، دیہاتی شہری ہر مسلک کے علماء وعوام، خانقاہوں کے سجادہ نشین اوران کا حلقہ مریدین سب کی

زبان پر کلام اقبال ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ یہ تمام افکار کے لوگ جس ایک شخصیت پر متفق ہو سکتے ہیں وہ علامہ اقبال کی شخصیت ہے اور اس میں نہ کوئی مبالغہ ہے اور نہ شک وشبہ۔

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے کہ ''دشمن کے تیروں کی جہاں بوچھاڑ ہو رہی ہو سمجھو کہ وہیں حق ہے''۔ گزشتہ اسّی سال میں علامہ اقبال کے خیالات، افکار کو مسلمان عوام اور بالخصوص پاکستان کے عوام کے ذہنوں سے جس طرح مغرب نے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی ناپاک کوششیں کی ہیں نصاب سے نکلوادیا، سکولوں میں ان کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں وہ ختم کرادیں اور افسوس کی بات یہی ہے کہ یہ سب کچھ اس منحوس مغربی استعمار نے بدنصیب اور بدقسمت مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں ہی کرایا ہے اور آخر میں تو علامہ اقبال کے یومِ وفات پر سرکاری چھٹی بھی ختم کر دی گئی تاکہ نوجوان نسل کے ذہنوں سے علامہ اقبال کے افکار اور اُن کی عظمت کو کھرچ کھرچ کر نکال دیا جائے۔

اللہ جانتا ہے ان ناپاک کوششوں میں کس کس پردہ نشین کا حصہ ہے اور اس کرپشن کے دریا میں کون کون نہایا ہے اور کون کون کرپشن کا ICON بنا ہے یقیناً اللہ کے پاس جائے گا اور اللہ اُسے اس کے اعمالِ بد سے متنبہ فرمادے گا اور آخری فیصلہ جنت/دوزخ کا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ دنیا میں رسوائی اور آخرت کے برے انجام سے بچائے، آمین۔

---

3 مفکّر پاکستان علامہ اقبال
عصر حاضر کی جدید (عالمی، اسلامی، فلاحی، جمہوری)
ریاست کی علامت (ICON) ہیں

ایک شخص بیسویں صدی کے آغاز میں برطانیہ اور جرمنی کی درسگاہوں کا فاضل ہوکر اپنے ہم وطنوں (جو اسی عالمی برطانوی سامراج کے مظلوم و مقہور غلام ہیں) کو متغلّب سامراج کے خلاف کھڑے ہونے کو ممولے اور شہباز کا مقابلہ سمجھتے ہوئے بھی ساقی نامہ (بانگ درا۔ مطبوعہ 1933ء) میں یوں گویا ہو

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا — مری خاک جگنو بنا کر اُڑا
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دل مرتضیٰؓ، سوز صدیقؓ دے

____جو شخص قوم کو یہ پیغام دے

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

____جو شخص اپنے انگریزی خطابات میں، ایک جدید اسلامی ریاست کے قیام پر قوم کو CONVINCE کر رہا ہو اور علمی ارتقاء کا منطقی تقاضا قرار دے رہا ہو اور برطانوی سامراج کے زیر سایہ اپنے خطبہ الٰہ آباد میں یہ الفاظ کہے:

"I WOULD LIKE TO SEE THE PUNJAB, THE NORTH-WEST FRONTIER PROVINCE, SINDH AND BALUCHISTAN AMALGAMATED INTO A SINGLE STATE. SELF-GOVERNMENT WITHIN THE BRITISH EMPIRE, OR WITHOUT THE BRITISH EMPIRE, THE FORMATION OF A CONSOLIDATED NORTH WEST-INDIAN MUSLIM STATE APPEARS TO ME TO BE THE FINAL DESTINY OF THE MUSLIMS, AT LEAST OF THE NORTH-WEST INDIA."

(The All India Muslim League and Allama Iqbal's Allahabad Address, 1930)

اور گویا انگریز کی 'مراجعت اِلیٰ برطانیہ' اور مسلمانوں کی علیحدہ اسلامی ریاست جس میں مسلمان بادشاہوں (ملوکیت، ملکاً عاضًا) سے قبل کے دورِ خلافت کے اِحیاء کا منشور دیا گیا ہو۔

_____ جو شخص مطالبہ قیامِ پاکستان سے عصر حاضر میں مثالی اسلامی ریاست کے قیام کا دعویٰ کرے۔

_____ جس ریاست کا بانی گورنر جنرل اُسے قیام نظامِ خلافت کے لیے حصولِ وطن کا نام دے کیا _____ یہ سارے مراحل محض کتابوں کی ورق گردانی، تصانیف، تالیف اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر گفتگو تک محدود ہیں اور پاکستان میں مفکر پاکستان کے فکر، حکمت اور قیامِ پاکستان کے منطقی تقاضوں (کہ اسے ایک حقیقی اسلامی ریاست بنایا جائے جو ماضی کے دورِ ملوکیت کی چھاپ (STAMP) سے پاک ہو) کی تکمیل، علامہ اقبال کے شیدائیوں، خوشہ چینوں اور اقبال کے نام پر عزت پانے والوں پر کوئی حق نہیں رکھتی۔ فکر اقبال کے تقاضے پورے کرنا اقبال کے نام لیواؤں کا فرض بنتا ہے۔ اب فرزانگی سے دیوانگی اور کرمِ کتابی سے پروانگی تک کی تحریک برپا کرنا اقبال کی ریاست، پاکستان کا تقاضا ہے۔ یہ کام کلامِ اقبال سے ہی لیا جاسکتا ہے اور لیا جانا چاہیے۔

آج کا مغرب بھی اسلام کو بطور مذہب جاری رکھنے پر نہ معترض ہے نہ آڑے آتا ہے۔ عین وائٹ ہاؤس کے سامنے نماز، نوافل، اعتکاف، مواعظ وغیرہ کے لیے مسجد بنانے کی کھلی اجازت ہے بس پولیٹیکل اسلام کی اصطلاح استعمال نہ کریں اور اسلام کے غلبے کی بات نہ کریں۔

وجہ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص (یعنی علامہ اقبال) اسلام کے غلبے اور بعد ازاں عالمی غلبے کی بات کرتا ہے اس کا مطلب اور نتیجہ کیا ہے؟ ع عقلمند را اشارہ کافی

حصّہ اوّل

تعارفِ اقبال
شخصیّت کے مختلف
پہلوؤں پر عمومی نظر

1

علّامہ اقبال ایک کثیر الاطراف شخصیّت

1 علّامہ اقبال
ایک کثیر الاطراف شخصیّت

◐ کسی شخص کو بحیثیّت انسان جانچنے کے لیے کئی معیارات اور پیمانے ہوسکتے ہیں۔ سیاسی، قومی اور انتظامی لحاظ سے کچھ لوگ 'شہباز' (HAWKS یا دلیر) ہوتے ہیں اور کچھ لوگ صلح جو (DOVES یا بزدل) ہوتے ہیں۔ نفسیّات کے علم کے مطابق کچھ لوگ EXTROVERTS یا مردانِ کار ہوتے ہیں اور کچھ ENTROVERTS یا دُروں بیں ہوتے ہیں اور کچھ لوگ جامع صفات یا AMBIVERTS ہوتے ہیں، کچھ لوگ ذہین فطین اور VISIONARY ہوتے ہیں اور کچھ لوگ اوسط درجے کی صلاحیّتوں کے مالک۔ کچھ لوگ کسی ایک پیشے کے اعتبار سے ماہر ہوتے ہیں کچھ لوگ کسی دوسرے پیشے کے ماہر۔ ہندو مذہب کی تقسیم میں کچھ لوگ پیدائشی 'مقدس شخصیت' برہمن، سیّد، سردار وغیرہ ہوتے ہیں، کچھ ویش (دلیر یا فوجی) اور کچھ کھتری (تاجر) جبکہ بعض نیچ ذات کے شودر (دلت یا UNTOUCHABLES) ہوتے ہیں۔ ہندو مذہب کی یہ تقسیم BY BIRTH ہے اور بڑی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔

کچھ لوگ شاعر، ادیب اور علم کے میدان کے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ لوگ میدانِ عمل کے آدمی یعنی SPORTSMAN، رہنما اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک اور اچھے حکمران ہوتے ہیں۔

◐ علامہ اقبال کئی اعتبارات سے ایک منفرد شخصیت کے مالک تھے جس میں بہت سی خوب صورت اچھائیاں جمع ہوگئی ہیں اور یوں انہیں کثیر الاطراف یا MULTI DIMENSIONAL

شخصیت کا حامل فرد قرار دیا جا سکتا ہے۔

☆ علامہ اقبال ایک فرد ِفرید تھے اور اپنے ہم عصروں میں منفرد و یکتا تھے اور بلا شبہ ایسے انسان صدیوں بعد کسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں اور 'نرگس' صدیوں اپنی بے نوری و بے بضاعتی و محکومی و مقہوری پر رو رو کر تھک کر مایوس ہو جائے تو ایسے 'دیدہ ور' جنم لیتے ہیں۔

☆ آیئے دیکھتے ہیں کہ علامہ اقبال کی شخصیت اپنے کلام اور عملی زندگی کی مصروفیات میں کس کس پہلو سے اپنے ماحول میں نمایاں اور سر برآوُردہ تھے:۔

(i) علمی قابلیت:

علامہ اقبال اپنے دور کے معروف اور قابل رشک شہرت کے حامل تعلیمی اداروں کے فیض یافتہ تھے۔ عالمی صہیونی برطانوی استعمار کا غلبہ اور شہرہ تھا علامہ اقبال نے اسی استعمار کے تعلیمی اداروں مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ پنجاب (لاہور) کے اعلیٰ ترین مادرِ علمی گورنمنٹ کالج لاہور سے درمیانے اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کی۔ ایم اے (عربی) کی ڈگری لی اور یوں گھریلو مذہبی ماحول کے مطابق دینی لحاظ سے قرآن وحدیث کی تعلیم سے تمسّک اختیار کر لیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے وہاں قانون کی تعلیم حاصل کی اور اس شعبہ کی اعلیٰ ترین ڈگری بیرسٹرایٹ لاء کا اعزاز پایا۔ جرمنی تشریف لے گئے وہاں تعلیمی ماحول میں فلسفہ کے شعبہ میں ڈاکٹریٹ(Ph.D) کی سند حاصل کی۔ انگلستان میں اپنے مادرِ علمی ہی میں 'استاذ' ہونے کا شرف بھی حاصل کیا (پہلے گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی بطور استاذ مصروفِ عمل رہے)۔

(ii) وکالت بطور پیشہ:

اسلامی اعتبار سے بھی فقہ، فقیہ اور صاحب نظر مفتی بہت اعزاز کے الفاظ ہیں۔ برطانوی سامراج میں ایک غیر مسلم مقتدر طاقت کے غلبہ کے بعد محکوم قوم کا رابطہ اور انٹرایکشن (INTERACTION) قانونی لحاظ سے ہی تھا۔ علامہ اقبال نے قانون کا علم حاصل کیا اور بیرسٹرایٹ لاء کی ڈگری حاصل کر کے لاہور میں پریکٹس کرتے رہے اور نیک نامی کمائی۔ اس طرح انہیں اسلامی فقہ (قانون) اور سامراجی فقہ (قانون) کے مطالعے اور تقابلی مطالعے کا موقع ملا۔ اُس دور میں وکالت سب سے معزز پیشہ سمجھا جاتا تھا اور بہت کم اور صرف صاحب علم لوگ ہی اس

شعبہ سے وابستہ تھے۔

(ii) معلم (استاد)

علامہ اقبال نے اپنی علمی زندگی کا آغاز بھی بطور معلم کیا تھا اور انگلستان سے واپسی کے بعد بھی وکالت کے شعبہ سے وابستگی کے ساتھ قانون کی تعلیمی سرگرمیوں میں بھی مصروف عمل رہے۔ تعلیمی سرگرمیوں اور معلّمی کے فرائض ادا کرتے ہوئے انسان کو اپنی نئی نسل اور قوم کے نونہالان سے واسطہ رہتا ہے جو اپنی قوم اور ماحول کی نبض پر ماہر حکیم کی طرح ہاتھ رکھنے کے مترادف ہے جس سے قوم کی صلاحیتوں، اُمنگوں، حوصلوں کو جانچنے کا موقع بھی ملتا ہے اور ان کو نیا رُخ دینے، مثبت انداز میں ڈھالنے اور مستقبل کے تقاضوں کے مطابق تیار کرنے کا موقع بھی میسر ہوتا ہے۔

(iv) بطور سماجی کارکن (SOCIAL WORKER)

علامہ اقبال مزاجاً ایک ملنسار، ہنس مکھ، دوسروں کے دُکھ درد میں شریک رہنے والے انسان تھے۔ انہوں نے لاہور میں قیام کے دوران بھی (اور دوسری جگہوں پر بھی جہاں گئے) سماجی، فلاحی کاموں میں بھرپور حصہ لیا اور اُمت مسلمہ کی اجتماعی سرگرمیوں کا بھی حصہ بنے رہے، علماء اور اہل دل سے بھرپور رابطہ رکھتے تھے اور یہ جذبہ انھیں والد محترم کی طرف سے ورثے میں ملا تھا۔

اہل لاہور کے مسلمانوں کے ہر مسئلہ میں وہ پیش پیش رہتے تھے بلکہ مسلمانوں کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تھا (غیر ملکی غاصب سامراج کے دور میں یہ بات نہ صرف عام اور روزافزوں تھی بلکہ ہندوؤں کا کردار مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو بھکانے کا کام کرتا تھا) تو سماجی خدمات کے مواقع پر علامہ اقبال دوسرے مسلمان زعماء کے شانہ بہ شانہ نظر آتے تھے۔

(v) بطور شاعر

شاعر کا لفظ شعور سے بنا ہے اور جس باشعور شخص کو بات کرنے کا سلیقہ اور دوسرے تک ابلاغ اور قائل کرنے کا فن آجائے (بطور وکیل یہ فن علامہ اقبال کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا) وہ شخص ایک کامیاب شاعر قرار پانے کا اہل ہے۔ علامہ اقبال کی ذات و شخصیت میں شاعر کے یہ

عناصر ترکیبی بڑی خوبصورتی اور فطری نسبت وتناسب سے فاطر فطرت نے شامل کر دیے تھے۔ ان صلاحیتوں کو علامہ اقبال نے بھر پور انداز میں استعمال فرمایا۔ یہ بات علامہ اقبال کے خلوص و اخلاص اور للّٰہیت و اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے کہ انہوں نے بطور شاعر پیشہ اور شہرت کو کبھی مطمع نظر نہیں بنایا بلکہ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو صرف انسانی فلاح، اسلامی اقدار اور ملت اسلامیہ کے واضح، شاندار اور مثالی مستقبل کے حصول اور اس کے لیے مسلمانانِ ہند کو تیار کرنے پر لگا دیا حتیٰ کہ عین چالیس سال کی عمر کے لگ بھگ ہی انھوں نے اپنے آپ کو ملت اسلامیہ اور اُمت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی دنیوی و اُخروی بہبود کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ان کی شاعری کے آغاز کے مختصر سے دور کو چھوڑ کر (جس عمر میں انسان ابھی اپنے مقصد حیات اور زندگی کے نصب العین یعنی آدرش کو دوسرے غلط IDEOLOGIES سے چھانٹ کر الگ کر رہا ہوتا ہے) وہ اس میدان میں بدرجہ کمال یکسو نظر آتے ہیں۔

(vi) بطور مصلح (REFORMER):

مُصلِح_ قوم کی اصلاح و بہبود کا کام کرنے والا۔ یہ لفظ انگریزی سے REFORMER کے متبادل یا ترجمے کے طور پر ہمارے ہاں آیا ہے۔ اگرچہ یہ اصطلاح حضرت شعیب علیہ السلام کے تذکرے میں قرآن مجید (ھود 88:11) میں آئی ہے مگر عوامی لیڈروں اور رہنماؤں کے لیے اسلام میں یہ اصطلاح عام طور پر مستعمل نہیں ہے۔ علامہ اقبال کے خطباتِ مدراس ہوں یا اُردو، فارسی کلام پر مبنی کتابیں، 'عرضِ حالِ مصنف بحضور رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم' ہو یا 'پس چہ باید کرد، اے اقوامِ شرق'____ ان کی تمام تر کاوشیں مسلم قوم کے نوجوانوں کی اصلاح کے لیے ہیں ان کی نظریاتی رہنمائی کا باعث ہے اور ان مساعی کے ذریعے بالواسطہ یا بلاواسطہ امت کی جوان نسل اور نژادِ نو میں ایک جذبہ بیدار ہوا اور مسلمان پورے جوش و جذبہ کے ساتھ حصولِ آزادی کی خاطر میدانِ عمل میں آ گئے اور غلام قوم کے یہی نوجوان دو عشروں بعد ایک آزاد ملک کے حکمران طبقہ اور رہنماؤں میں شامل تھے اور علامہ کی نگاہِ دُوررس نے علی گڑھ میں نوجوان طلبہ کی پیشانیوں پر 'من بسیمائے غلاماں سر سلطاں دیدہ ام' کے مصداق، جو خلوص و اخلاص اور اسلام کی تڑپ دیکھی تھی وہ آرزو جلد ہی پوری ہو گئی اور علیگ حضرات نے ہی آزادی کے بعد 25 سال تک ملک و قوم

کی کشتی کو طوفانوں سے نکالنے کا کام کیا ہے۔

(vii) بطور رہنما (LAEDER):

تاریخ میں ایسے بے شمار لوگ اُٹھے جنہوں نے قوموں کی رہنمائی کی۔ ان میں بعض ایسے ہیں جنہوں نے صحیح رہنمائی کی اور اپنی اپنی قوموں کو قعرِ مذلت، غلامی اور جہالت سے نکال کر بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ بعض نے قوموں کو مروا دیا اور دنیا میں بھی ذِلت اور رسوائی کے سوا ایسے لیڈروں (رہنماؤں) کے ہاتھ کچھ نہ آیا اور نہ قوموں کو عزت مل سکی۔

بعض خودغرض رہنما اور موقع پرست لوگ اپنی قوموں کے منصب 'رہنمائی' پر خود ہی براجمان ہو جاتے ہیں اور 'قوم' کا جذبۂ عمل فروخت کر کے خود اقتدار حاصل کر کے عیش کرتے ہیں۔ ایسے موقع پرست رہنما قوموں کو بیچ کھاتے ہیں اور غدارانِ قوم کہلاتے ہیں۔

حقیقی رہنما وہی ہوتا ہے جو قوم کی قیادت کرے اور غیر منظّم قوم کو منظّم کر کے خطرات و طوفانوں سے نکال کر منزلِ مراد اور کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کر دے یا اس کا راستہ بتائے۔ علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کے فرد کی حیثیت سے اُبھر کر قوم کی رہنمائی کا حق ادا کر دیا نہ صرف قوم کو جذبہ دیا بلکہ سراغِ منزل بھی دیا، نظریہ دیا، راستہ واضح کیا، قوم و ملک کی تعمیر و تشکیل جدید کے طریقے باقاعدہ ہجے کر کے سمجھایا۔ قائداعظم جیسا رہنما ڈھونڈ کر نکالا۔ اپنی جگہ اس مردِ مومن کو کھڑا کیا جس نے علامہ اقبال کی 'نگاہ' سے منزل کو سمجھا اور قوم کو منزلِ مراد تک پہنچا دیا۔

قوم کی نہ صرف دنیاوی فلاح کا سامان کر دیا بلکہ آخرت کی بہبود کے لیے 'عالمی خلافت' کا ایسا 'روح افزا' پیغام دیا کہ مسلمان آج تک حیران ہیں کہ قرآن و حدیث پر مبنی یہ پیغام مدارس کے علماء و مفتیان و پیشوایان اور خانقاہوں میں موجود سدرۃ المنتہیٰ تک نگاہ رکھنے والے صوفیاء کا اپنے مریدین اور اُمت مسلمہ کو یہ نعرہ آج تک نہ دے سکنے کی وجہ کیا ہے؟

(viii) بطور انقلابی شاعر:

تاریخ انسانی میں کسی تبدیلی لانے میں جن لوگوں نے بنیادی کردار ادا کیا ہے ان میں شعلہ بیان خطیب، آتش نوا شاعر اور صاحب قلم و اہل علم شامل ہیں۔ اگر ان خوبیوں میں سے کسی

رہنما اور مقتدا میں ایک سے زیادہ خوبیاں جمع ہو جائیں تو اس شخصیت کے نظریات کی کاٹ دوآتشہ بلکہ سہ آتشہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ابلیس کی مجلس شوریٰ نظم (1936ء) میں علامہ اقبال نے مارکس کے بارے بجا طور پر کہا ہے کہ 'نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب'۔ یہی بات علامہ اقبال پر صادق آتی ہے۔ اُن کی شاعری اپنی جگہ، اُن کی آواز، ان کا علم، ان کا لہجہ اور سب سے بڑھ کر ان کے کلام میں آسمانی ہدایت کا نور جو روشنی پھیلا رہا ہے اس کا جواب گل و بلبل کی شاعری اور سفلی جذبات کی ترجمانی کرنے والے شعراء واُدباء کی قسمت میں کہاں! چنانچہ گزشتہ پون صدی میں علامہ اقبال کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے مغرب کے ایوانوں میں جو کچھ کیا گیا ہے وہ علامہ اقبال کے ان اشعار سے ظاہر و باہر ہے۔

ؔ ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا * نہیں، اسلام ہے!

* یہ بات گزشتہ 80 سال سے سب کے سامنے ہے۔

(ix) بطور داعیِ قرآن:

علامہ اقبال بلاشبہ ایک اعلیٰ پائے کے شاعر تھے مگر ان کی شاعری کو اثر پذیری عطا کرنے میں ان کے افکار کا قرآن مجید سے ماخوذ ہونے کو سب سے زیادہ دخل ہے۔ علامہ اقبال جیسا قادر الکلام شاعر ہو اور مضامین لاہوتی ہوں، خودی اور انسانیت اس کا موضوع ہو انسانی فلاح و بہبود اس کے پیشِ نظر ہو۔ تجارت، دنیاوی منفعت اور عہدہ و کرسی کا لالچ نہ ہو تو ایسے انسان کے منہ (اور قلم) سے نکلے ہوئے الفاظ ملکوتی اور DIVINE WISDOM کا پرتو ہی کہلا سکتے ہیں۔ ایسے افکار کے بارے میں باضمیر اور دانا اہلِ علم الہامی ہونے کا نام دیتے آئے ہیں۔ عصرِ حاضر

میں قرآن مجید کے سب سے بڑے داعی و متکلّم علامہ اقبال ہیں۔ علماء کرام اور مفتیان عظام و خانقاہوں میں جلوہ افروز اہل دل تو قرآن مجید کی شان بیان کرتے ہیں کہ وہ اسی کے عالم ہیں اور اسی کی بدولت عزت و شہرت کی بلندیوں تک پہنچے ہیں مگر ایک شخص جو بیرسٹر ایٹ لاء ہو۔ مغربی درسگاہوں کا فیض یافتہ مغربی منحوس استعمار کے دورِ عروج میں وہاں کی اعلیٰ درسگاہوں میں پڑھا ہو وہ وہاں سے پلٹ کر قرآن مجید کا مدح خواں بنا ہوا اور اپنے فکری مغالطّوں اور پیچیدگیوں کے لیے قرآن مجید میں پناہ گزیں ہو کر آسودگی محسوس کرتا ہو تو ــــــ یقیناً تعجب کی بات ہے بقول نظیریؔ

ے خلافِ رسم دریں عہد ز خرقِ عادت داں
کہ کار ہائے چنیں از شمار بو العجبی ایست

(x) بطور ترجمان القرآن:

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا آخری کلام ہے اور سیّدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخرالزماں و خاتم النّبیین والمرسلین پر اُترا ہے اب تا قیامت قرآن مجید کو حسب استطاعت سمجھنا اور اس کے مفہوم و معانی کو عام کرنا ہر مسلمان عورت مرد، عالم و عامی، شہری دیہاتی، کسان، ساھوکار کارخانہ دار اور مزدور جوان اور بوڑھے پر حسب لیاقت و استطاعت فرض ہے اور اس راستے میں جو رکاوٹیں بھی درپیش ہوں ان کو دور کرنا بھی ہر مسلمان پر حسب موقع و ضرورت لازم اور ضروری ہے اسی جدوجہد کو STRUGGLE اور جہاد کہتے ہیں اور مخالفتوں کے علی الرغم کامیابی کے لیے دامے درمے سخنے قلبے و دماغے سب کچھ کھپا دینا عین اسلام ہے اور اس راہ سے گریز اور فرار اختیار کرنا یا اس ضمن میں کام چوری، کاہلی اور سستی کرنا شرعاً عیب ہے اور اس کوتاہی اور گناہ سے تائب ہو کر جہاد میں شامل ہو جانا ہر جانثار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنے اپنے درجے کے لحاظ سے فرض ہے۔ اسلام کا اس ضمن میں جو تقاضا ہے اس پر عمل کے اعتبار سے مسلمانوں اور اہل ایمان کی دو قسمیں علامہ اقبال نے واضح کر دی ہیں

انداز بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات
یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست

یہ مذہب مُلّا و جمادات و نباتات

اور یہ بات قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے اور اس کے تقاضے ادا کرنے سے آتی ہے

؎ تیرے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزولِ کتاب

گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

؎ خوار از مہجوری قرآں شدی

شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

(xi) بطور عاشق رسول ﷺ:

مسلمان ہو کر، کلمہ اسلام ادا کر کے، اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر محمد ﷺ کی غلامی اختیار کرنا اور ان سے اپنے آپ، اپنے والدین اور اپنی اولاد بلکہ تمام نوعِ انسانی اور علائق دینوی سے بڑھ کر محبت کرنا جو عشق کی حد تک پہنچی ہو ــــ یہ عین تقاضائے اسلام ہے۔ فرماتے ہیں

؎ بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

گر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

؎ عشق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام

میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب

حضرت محمد ﷺ سے ایک جگہ عرض کرتے ہوئے کہتے ہیں:

گر دلم آئینۂ بے جوہر است　　ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

روزِ محشر خوار و رُسوا کن مرا　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

مقامِ مصطفےٰ ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے معراج النبی ﷺ کے ضمن میں فرمایا:

عبد دیگر عبدہٗ چیزے دگر　　ما سراپا انتظار او منتظر

(xii) بطور داعی انقلاب:

علامہ اقبال اپنی تمام جہتوں اور حیثیتوں سے بہت بلند ایک عالمی، انسانی، فطری،

فلاحی، جمہوری انقلاب کے داعی تھے جو خود شناسی (خودی، ضمیر، روح اور باطنی حیات جس کو 'حیا' کہا جاتا ہے) اور خدا شناسی کا منطقی اور لابدی تقاضا ہے۔ علامہ اسی ضمن میں زندگی کے آخری عشرے میں ہمہ وقت مصروفِ کار رہے اسی فلاحی انسانی آسمانی انقلاب کے مختلف گوشوں اور مرحلوں کی وضاحت فرماتے رہے۔ خود (نامعلوم کس اعلیٰ باطنی وروحانی کیفیت میں) فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہیں

گفتند جہانِ ما آیا کہ بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن!
با نشہ ٔدرویشی درساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

انقلاب کے بارے میں ایک نظم کا آخری شعر ہے

یا بگُش در سینۂ من آرزوے انقلاب ؎
یا دگر گوں کن نہادِ ایں زمان و ایں زمیں

یا ؎ اے کہ می نازی بقرآنِ عظیم
تا کجا در حجرہ ہا باشی مقیم
در جہاں اسرارِ دین را فاش کن
نکتہ شرع مبیں را فاش کن

اور اس انقلاب کا مطلب کیا ہے

کس نہ گردد در جہاں محتاجِ کس — نکتہ شرع مبین ایں است و بس
مکتب و ملا سخن ہا ساختند — مومناں را ایں نکتہ نہ شناختند

اور معاشی میدان میں سودی نظام کے بارے میں فرمایا:

ایں بنوک ایں فکر چالاک یہود — نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام — دانش و تہذیب و دیں سودائے کام

☆ بنوک: بینک کی جمع

اور ـــــــ اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

سماجی سطح پر تبدیلی کے بارے میں فرمایا:

الحذر! آئین پیغمبر سے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

(xiii) بطور داعی جہاد (STRUGGLE اور مسلسل محنت)

علامہ اقبال کا 'نظریۂ خودی' جس کے بارے میں انھوں نے جوانی میں ہی 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بیخودی' جیسی معرکہ آرا کتابیں لکھ دیں تھیں، صرف یہی نہیں بلکہ علامہ سمجھتے تھے کہ 'خودی' یا ضمیر (CONSCIENCE) کا تعلق انسان ہونے سے ہے۔ لہٰذا یہ نظریۂ خودی فطرتِ انسانی کا خاصّہ ہے۔ واقعتاً ایسا ہو تو پھر اس نظریہ کو پھیلا کر عام کرنا چاہیے اور دنیا سے حیوانیت بلکہ درندگی (BEASTALITY) کو یکسر ختم کر دینا چاہیے۔

قرآن مجید بھی اسی انسانی فطرت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سورۂ حدید (25:57) میں وارد ہے کہ جو کام فطرتِ انسانی کا تقاضا ہو انسان دوست کام ہو، خداشناسی اور خودشناسی کی طرف لے جانے والا ہو اس کام کے لیے جہاد (UTMOST STRUGGLE) کرنا بھی لازم ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں فرماتے ہیں:

گفتند جہانِ ما آیا کہ بتو می سازد؟ گفتم کہ نمی سازد! گفتند کہ برہم زن!
با نشہ ٔدرویشی درساز و دمادم زن چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پوچھا کہ میرا جہاں تمہیں پسند ہے؟ میں نے عرض کیا کہ نہیں، مجھے پسند نہیں ہے (انگریز کا راج ہے اور اسلام اور مسلمان محکوم ہیں اسلام کسی جگہ غالب نہیں ہے)۔ حکم ہوا کہ اس نظریہ تبدیلی کو پہلے دل میں رکھو اور درویشی کے ساتھ اس کو پھیلاؤ، عام کرو، چرچا کرو، جب لوگ معتد بہ تعداد میں تیار ہوں اور تربیت پا کر پختہ ہو جائیں تو اسلام دشمن حکمرانوں (جم ـــ ایران کے حکمران کا لقب) سے ٹکرا جاؤ۔

دوسرے مصرعے میں اس مقصد کے لیے حکومتوں سے ٹکرا جانے سے گریز نہ کرنے کا

داعیۂ جہاد کا ہی مرحلہ ہے۔ علامہ حق کے لیے اس کے ماننے والوں سے انتہاء درجے کی جدوجہد کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہی عصر حاضر میں علامہ اقبال کی شان ہے۔

(xiv) بطور مبشرِ پاکستان:

علامہ اقبال ایک ایسے خود شناس و خدا شناس تھے اور تاریخ کے بہاؤ سے باریک بینی سے واقف تھے کہ پہلی جنگ عظیم (1914ء_1918ء) سے قبل ہی شکوہ (1911ء)، شمع و شاعر (1912ء) اور جوابِ شکوہ (1913ء) میں فرمادیا تھا کہ اگرچہ ابھی غلام ہیں اور دور دور تک مستقبل میں آزادی کا کوئی زوردار جذبہ اور تحریک مسلمانانِ ہند میں سامنے نہیں ہے پھر بھی جوابِ شکوہ میں فرمایا:ـ

وقت فرصت ہے کہاں؟ کام ابھی باقی ہے　　　نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے

اور فرمایا

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری　　　مرے درویش! خلافت ہے جہاں گیر تری
ماسوی اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری　　　تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں　　　یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

خطبہ الٰہ آباد میں 30 دسمبر 1930ء کو فرمایا: یہ تقدیر مبرم (DESTINY) ہے کہ انگریز جائے تو شمال مغربی ہند (موجودہ پاکستان) میں مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل اگر ایک آزاد اسلامی ریاست قائم ہو جائے تو ہمارے لیے موقع ہوگا کہ اسلام کی عدلِ اجتماعی کی تعلیمات پر جو پردے دورِ ملوکیت (ملکاً عاضاً) کے دوران پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر دنیا کو اسلام کی حقیقی تعلیمات عدلِ اجتماعی کا نمونہ دکھا سکیں گے۔ (مفہوم خطبہ)

انہوں نے نہ صرف پاکستان کے قیام کی خوش خبری دی بلکہ اس ملک کے لیے عدالتی و قانونی ضرورت پوری کرنے کے لیے کوششیں فرمائیں تا کہ نئی اسلامی حکومت میں جدید طرز پر CODIFIED LAW کا نمونہ پہلے سے تیار کیا جا سکے۔ (افسوس کہ ان کی یہ کوششیں بار آور ثابت نہ ہو سکیں ورنہ آج پاکستان کے جو حالات ہیں اس کی جگہ پاکستان عصر حاضر میں اسلامی نظامِ عدل اجتماعی کا نمونہ ہوتا۔ مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ

(xv) بطور نقیب عالمی غلبۂ اسلام یعنی عالمگیر خلافت اسلامی کے نقیب:

علامہ اقبال کے فکر کی چوٹی (ZENITH OR CLIMAX) ہے ان کا تعلیمات اسلامی کی روشنی میں (قرآن مجید کے اشارے اور احادیث صحیحہ میں وارد بشارتیں) قربِ قیامت میں اسلام کا پہلے کسی ملک میں غالب ہونا اور بڑھتے بڑھتے اس عالمی اسلامی جمہوری خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا فی الواقع وقوع پذیر ہوجانا۔

علامہ اقبال (1923ء) میں طلوعِ اسلام نامی نظم کے شروع میں فرماتے ہیں

؎ عطا مومن کو پھر درگاہِ حق ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی ، نطق اعرابی

یا فرمایا: ؎ شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے
آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی

(xvi) اقبال ایک VISIONARY انسان تھے:

علامہ اقبال عقل رسا کے مالک تھے، خود شناسی اور خدا شناسی کے ساتھ اسرارِ خودی ور موز بے خودی سے آگاہ تھے، ان کی نگاہِ دور بین 80 سال قبل بھی ایک صدی سے زیادہ بعد کے حالات کا صحیح ادراک رکھتی تھی۔ عالمی مغربی صہیونی استعمار پنجے گاڑے ہوئے تھا ہم اس کے غلام تھے علی الاعلان تو یہ بیانیہ سامنے لانا ناممکن تھا مگر شاعرانہ انداز میں (اور 'عقل مندرا اشارہ کافی' کے مصداق) آئندہ درپیش آنے والے حالات وواقعات کا کماحقہ نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔

؎ ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاکِ کاشغر

(یادرہے کہ موجودہ CPEC کا ون بیلٹ ون روڈ کا منصوبہ کاشغر سے شروع ہوکر گوادر تک جارہا ہے اورادھر سعودی عرب میں NEOM شہر سے مصر کے دارالحکومت قاہرہ تک لے جایا جائے گا واللہ اعلم)

؎ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

یادرہے کہ علامہ اقبال کی شاعری اور دیگر زعمائے ملت اور رہنمایانِ امت مسلمہ کے کام سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں ایسا ملّی و دینی جذبہ بیدار ہوا کہ صرف 3.2 ارب سیکنڈوں (گذشتہ سوسال) میں 3 عالمی مغربی صہیونی سپر پاورز ماضی کے دھندلکوں میں گم ہوکر عالمی حیثیت گنوا کر قصہ ماضی ہوچکی ہیں۔ برطانیہ 1947ء، USSR 1990ء اورامریکہ بمع NATO افغانستان سے 2014ء میں اپنی اکثر فوج انگور کھٹے ہیں کہہ کر نکال کر جاچکا ہے اب واپسی کا باعزت راستہ تلاش کررہا ہے۔

یا سپین کے سفر میں فرمایا:

؎ آبِ روان کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

علامہ اقبال کی شخصیت کے یہ (XVI) پہلو یا اطراف (DIMENSIONS) ہم نے بطور مثال ذکر کردیے ہیں جس سے قارئین کرام پر یہ واضح کرنا مطلوب ہے کہ علامہ اقبال کوئی پیشہ ور شاعر، غزل خواں، نعت خواں یا مرثیہ نگار یا قصیدہ گو شاعر نہیں تھے بلکہ ایک بیدار مغز، خودشناس، خداشناس حالات حاضرہ کی نبض پر ایک ماہر طبیب کی طرح ہاتھ رکھے ہوئے تھے اور انہیں قرآنی تعلیمات کا بھی گہرا شعور تھا اور ادراک بھی اور چودہ صدیاں قبل زبانِ حق ترجمان لسان رسالت ﷺ سے نکلی ہوئی پیش گوئیوں کے فہم اور موجودہ حالات پر تطبیق کے ہنر سے بھی آگاہ تھے اور اس نازک ذمہ داری کو انھوں نے جس انداز میں نبھایا ہے، یہ انہیں کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ آرام عطا فرمائے۔ آمین

2

علّامہ اقبال بحیثیت حکیم الاُمّت

2 علّامہ اقبال بحیثیّت حکیم الاُمّت

حکیم کا لفظ عوام میں بطور طبّ یونانی کے ماہر معالج کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر اہل علم اور اہل نظر کے ہاں یہ لفظ مسلمانوں اور ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی مسائل پر گہری نظر رکھنے والے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو ماحول میں میسّر امکانات اور مواقع کے مطابق ان مسائل سے نکلنے کا کوئی عملی حل بھی بتائے اور قوم کو اس پر چلنے کی ترغیب دے۔ یعنی ملّتِ اسلامیہ کے اجتماعی امراض کی تشخیص اور علاج کی طرف متوجّہ ہو۔ علامہ اقبال کے ایک ہم عصر مولانا اشرف علی تھانوی کے بارے میں بھی اُمّت مسلمہ حکیم الامّت کے الفاظ استعمال کرتی ہے۔ بعینہٖ ـــــ انہیں خطوط پر حکیم الامت کے یہ الفاظ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال پر صادق آتے ہیں۔

ذیل میں مختصراً بیسویں صدی کے پہلے چار عشروں میں ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مسائل اور ان کے ضمن میں علامہ کی مساعی کا تذکرہ پیش خدمت ہے، تا کہ اس بطل جلیل کے کارہائے نمایاں کا کما حقہ ادراک کیا جا سکے اور بعد ازاں ان کی تحسین کی جا سکے۔

بیسوی صدی کے آغاز میں ملّتِ اسلامیہ کی زبوں حالی

- یوں تو مغربی استعمار سترھویں صدی کے آغاز پر کلکتہ میں قدم جما کر دہلی تک رسائی حاصل کر چکا تھا۔ مغربی استعمار کی یہ اوّلین کیفیت بڑی معصومانہ اور بظاہر مظلومانہ تھی کہ مغل بادشاہ جہانگیر کے دربار میں ایک برطانوی طبی ماہر اپنے ایک کامیاب علاج کے بدلے اور صلے کی امید

میں ملت اسلامیہ جنوبی ایشیا اور در پردہ سلطنت مغلیہ کی جڑوں پر کلہاڑا رکھ کر وار کرنے کا ارادہ لیے کھڑا تھا۔ مشرقی بادشاہوں اور مطلق العنانی کے استکبار کے باعث مغل بادشاہ اپنے سامنے کھڑے گورے انگریز سائل کے مکّار ذہن کو نہ پڑھ سکا۔ سائل کے مطالبہ پر بہ اندازِ خسروانہ برطانوی تجارتی مال پر محصول (IMPORT TAX) کی معافی کا پروانہ جاری کر دیا گیا۔

☆ مطلق العنان بادشاہ جہانگیر کے اس شاہانہ بے سمجھے اور عاجلانہ فیصلے کے اثراتِ بد اتنے دُوررَس ہوئے کہ آج تک اُمت مسلمہ بھگت رہی ہے۔ ہوا یہ ہے کہ برطانوی تجارتی مال پر ان بدیشی پریشان حال تاجروں پر رحم فرماتے ہوئے درآمدی ٹیکس کی معافی کا ان برطانوی تاجروں نے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حد درجہ ناجائز فائدہ اٹھایا۔

☆ واضح رہے کہ برطانیہ سے پرتگال اور افریقہ کے مغربی ساحل سے ہوتے ہوئے جنوبی افریقہ سے چکر کاٹ کر عدن پہنچنا اور پھر یمن، خلیج فارس، ساحل گوادر، گجرات، سومنات، بمبئی سے گذر کر سری لنکا کے پاس سے گزر کر کلکتہ پہنچنے والے یہ تاجر کوئی عام تاجر نہ تھے بلکہ صہیونی دماغ کی بچھائی ہوئی عالمی شطرنج کے مہرے تھے۔ رُبع صدی قبل لکھی گئی کتاب 'تہذیبوں کا تصادم' (CLASH OF CIVLISATIONS) کا مصنف سیموئل پی ہنٹنگٹن صاف لکھتا ہے کہ مغرب کی یہ یلغار کسی نظریہ، فلاحی پروگرام یا کسی انسانی عقلی برتری کی بنیاد پر نہ تھی بلکہ مکر وفریب، دجل، سازشوں اور وعدہ خلافیوں اور بعد ازاں ظالمانہ انداز حکومت کے جلو میں دنیا بھر کے وسائل پر بھرپور قبضہ کرنا تھا۔ یہی برطانیہ جس کا تاجر مغلیہ سلطنت کے بادشاہ سے معصوم بن کر مراعات کی بھیک مانگ رہا تھا____ دراصل سترھویں صدی کے آغاز میں صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی کے تحت دنیا بھر کے وسائل پر قبضہ جمانے کے پروگرام کے تحت 1602ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی (E.I.C.) بنا چکے تھے اور اس عرصے میں اس تجارت کو مالیاتی تحفظ دینے کے لیے 1605ء میں بینک آف انگلینڈ بھی قائم ہو چکا تھا۔ آج اسی بینک کی بدولت ساری دنیا میں سود پر مبنی معیشت کا ابلیسی نظام قائم ہے۔

☆ اس برطانوی تاجرانہ یلغار کے کارپردازوں نے ٹیکس معافی کے پروانہ کے احسان کا بدلہ یوں دیا کہ ٹیکس معافی کے بعد مال کی تفصیلی CHECKING نہ ہونے کی آڑ میں اسلحہ لائے

اور بظاہر مال گودام بنا کر اس میں اسلحہ کا ذخیرہ جمع کرتے رہے اور مستقبل کے جنوبی ایشیا پر قبضے کے منصوبے بناتے رہے۔ (شاید برطانوی اور صہیونی ڈکشنریوں میں کسی کے احسان کا بدلہ احسان سے دینے کے یہی معنی درج ہیں)

☆ برطانوی استعماری قوت .E.I.C کا مال ساحلی بندرگاہوں پر آتا تھا اس مال کو CONSUMER تک پہنچانے کے لیے مقامی منڈیاں درکار تھیں اور مقامی تاجر درکار تھے اس لیے کہ سترھویں صدی تک یورپی انگریز تاجر پورے ملک میں آزادانہ نہیں گھوم سکتے تھے۔ مسلمان اقتدار کے نشے میں تھے، ہندو نے اس موقع پر پیش قدمی کی۔ ہندو ذات پات میں برہمن کے بعد تاجر کا نام آتا ہے۔ ہندو ویسے بھی مسلمانوں کے اقتدار سے خائف اور ناراض تھا لہٰذا مفادات کی بدولت ہندو نے انگریزی تجارت کو ملک میں مرحلہ وار پھیلانے میں ہراول دستے کا کام کیا۔ بی جے پی (BJP) اور RSS کے علاقہ مشرقی ہندوستان کے لوگوں کے تجارتی روابط EIC سے جلد ہی استوار ہو گئے تھے۔ ہندو، مسلم اقتدار کو کمزور کرنے اور بالآخر ختم کرنے کی نیت سے غیر ملکی استعمار کے ہاتھ میں کلہاڑے کے دستے کی طرح فٹ (FIT) ہو گیا۔

☆ اٹھارھویں صدی کے آغاز پر 1707ء میں اورنگزیب کی وفات پر مغل سلطنت انتشار کا شکار ہو گئی۔ سلطنت تھی بھی بہت وسیع اور دشمن عرصے سے منصوبہ بندی کے ساتھ مغلوں کے زوال کا منتظر تھا۔ برطانوی استعمار کے پس پشت دراصل صہیونی عالمی طاقت تھی، جو چھپ کر رہتی ہے۔ یہودی دنیا میں ایک لمبے عرصے سے قیمتی دھاتوں اور مصالحہ جات کی مشرق و مغرب کی تجارت میں پیش پیش تھے اور تمام دنیا کے تجارتی مراکز اور حکومتی مراکز میں براجمان تھے اور ہیرے جواہرات سونا چاندی وغیرہ کی تجارت سے حکومت بنانے بگاڑنے کے عمل میں بنیادی کردار ادا کرتے تھے بلکہ بیرونی حملہ آوروں کو کمزور مملکتوں کا راستہ بتانا اور بلا کر مقامی طور پر LOGISTIC SUPPORT دینا بھی ان کا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور اب بھی ہے۔ بڑی حد تک آج بھی اسلحہ کی تجارت اور سودی قرضے کا معاملہ اسی طبقہ کے پاس ہے۔

☆ اورنگ زیب نے نصف صدی حکومت کی مگر اس نے مرہٹہ قوت کو دبائے رکھا۔ اس کی وفات کے بعد حکومت کمزور ہو گئی۔ عالمی صہیونی طاقتوں، EIC اور مرہٹہ قوت نے اس سے بھرپور

فائدہ اُٹھایاصہیونیوں نے ایران سے 'نادر شاہ' کو بھیج کر 'سونے کی چڑیا' ہند میں مسلم دارالحکومت کو لوٹا اور مال ایران پہنچایا۔ مرہٹہ قوت کو دہلی آنے کا اشارہ ملا۔ ملک میں مرکز گریز قوتوں نے سر اٹھایا۔نزدیک ودُور ہندوسر پرستی اور انگریزی حمایت میں خودمختار ریاستیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ 1757ء میں EIC نے مقامی مسلمانوں سے مل کر بنگال پر حملہ کر دیا۔ غیر ملکی اسلحہ کی بنا پر سراج الدولہ کو شکست ہوئی اور یوں بنگال پر EIC کا قبضہ ہوگیا۔ یہ قبضہ، قبضہ مخالفانہ تھا۔مگر مغلیہ سلطنت میں جان نہیں تھی کہ وہ دہلی سے بہت دور بنگال میں انگریز سے لڑ کر بنگال کا قبضہ لے سکتی۔

☆ اس موقع پر دہلی میں بیٹھے ایک بوریا نشین شخص شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہِ دُور رس نے دیکھا کہ مغلوں کی اقتدار پر گرفت کمزور ہوتی جارہی ہے اور مرہٹہ قوت انگریز کی شہ پا کر دہلی کی طرف بڑھ رہی ہے اگر دہلی پہنچ کر مرہٹہ اقتدار پر قابض ہوجاتے ہیں تو سپین کی طرح ہند میں مسلم اقتدار اور نتیجتاً مسلمان حرفِ غلط کی طرح ختم کر دیے جائیں گے (اور شاید یہی عالمی صہیونی قوت کا منصوبہ آج بھی ہے جیسے کہ پہلے تھا)۔

لہٰذا انہوں نے افغانستان میں قندھار کے حاکم احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا کہ ہند میں صدیوں بعد مسلم اقتدار اور مسلم عوام عظیم خطرے سے دوچار ہیں، لہٰذا جلدی دہلی پہنچ کر مرہٹہ قوت کو روکو، تاکہ مسلمان اُمت کا مستقبل محفوظ ہو سکے۔ حاکم قندھار احمد شاہ ابدالی جلد ہی فوج لے کر جلال آباد کے راستے پشاور سے ہند میں داخل ہوا۔ اس کے پاس جرمن ساختہ اسلحہ تھا فوجیں تھیں مقامی مسلمان ساتھ شامل ہوتے گئے۔ دہلی سے شمال کی طرف پانی پت کے علاقے میں 1761ء میں پانی پت کی مشہور تیسری جنگ لڑی گئی، 3 لاکھ مرہٹہ قوت کو ایک لاکھ افغان قوت نے شکست سے دوچار کر دیا۔ احمد شاہ ابدالی ہمت کر کے مرہٹہ قوت کا دُور تک صفایا کرتا تب اس فتح کا نتیجہ مختلف ہوتا، مگر عالمی صہیونی قوت نے قندھار میں بغاوت کرادی جس کی وجہ سے اسے جلدی واپس ملک لوٹنا پڑا۔ (مرہٹہ قوت کی یہی شکست آج بھی افغان بھارت دشمنی کی بنیاد ہے۔ سابقہ کاری زخم، محمود غزنوی نے سومنات فتح کر کے 1026ء میں ہندوؤں کو لگایا تھا اب یہ تازہ زخم بھی ہندو کے لیے بھلانا مشکل ہے۔ حالیہ امریکی یلغار میں بھارت نے افغانستان میں افغانوں کو دبانے کے لیے اسی ذہنیت کے تحت انتقام کی غرض سے حصہ لیا ہے اور فعال کردار

ادا کر رہا ہے۔ بھارت کی اس منفی ذہنیت کا منطقی تقاضا ہے کہ افغانستان سے گذشتہ 1200 سال کی تاریخ کی طرح کوئی فاتح اُٹھے اور بھارت کو اس نظریاتی جنگ میں غزنوی و غوری و ابدالی کی طرح کا ایک آخری سبق سکھا دے۔)

☆ احمد شاہ ابدالی افغانستان واپسی پر اپنی خراب/ ناکارہ توپیں گجرات کے ایک سکھ خاندان کے سربرآوردہ شخص کو ایک احسان کے بدلے تحفتاً دے گیا تھا۔ اس خاندان نے ان توپوں کی مرمت کرائی اور ان کے ذریعے پورے پنجاب پر عسکری برتری حاصل کر کے انگریز کی اشیر باد اور ہندوؤں کی منشا کے مطابق 1789ء میں پہلے پنجاب کے وسطی علاقے اور بعد ازاں آہستہ آہستہ بڑھ کر ملتان سمیت پورے پنجاب، موجودہ صوبہ کے پی کے، زیریں کشمیر، چندی گڑھ تک پنجاب اور کابل تک اپنی سرحدیں بڑھا لیں۔ افغانستان سے متوقع مسلمانوں کی عسکری امداد کو ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر سکھ سلطنت بنا کر روک دیا تاکہ انگریز کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ نہ رہے اور ہندوؤں کی مرہٹہ قوت کو بھی۔ 1803ء تک سکھ حکمران رنجیت سنگھ لاہور میں دارالحکومت کے ساتھ وسیع رقبہ پر حکمران بن بیٹھا تھا۔

☆ برطانوی استعمار نے پہلے ریاست میسور کے حکمرانوں سے جنگ کا آغاز کیا جو بالآخر سازشوں کے تہ در تہ پروگرام کے بعد مئی 1799ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت پر ختم ہوئی۔ مسلمانوں کی طرف سے سلطان ٹیپو آخری چٹان کے طور پر تھا، وہ رکاوٹ بھی ختم ہوئی۔ یوں عالمی برطانوی صہیونی سامراج نے ہندوؤں کے تعاون سے 1803ء میں دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ مغل حکمران کو معزول نہیں کیا گیا بلکہ اس کو انگریز ریذیڈنٹ کے احکام کا پابند بنا دیا گیا۔ یوں انگریز انیسویں صدی کے آغاز میں ہی دہلی پر قبضہ کے بعد پورے جنوبی ایشیا پر قابض ہو گیا تھا۔

☆ 1843ء میں انگریز جنرل نیپئر نے مختصر فوج کے ساتھ حیدرآباد میں مسلمان حکمران تالپور خاندان سے جنگ کے بعد قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں آغا خان اوّل (جو 1838ء میں ایران سے آئے تھے) نے اپنی فوج کے ساتھ جنرل نیپئر کی مدد کی، جس کے صلے میں انہیں اس وقت کے مختصر کراچی سے ملحقہ کئی ہزار ایکڑ رقبہ تحفتاً دے دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ گارڈن کا علاقہ چڑیا گھر سے لے کر ایئر پورٹ تک کا بہت سارا علاقہ معمولی رقم کی لیز پر آج بھی آغا خان خاندان کی ملکیت ہے

جبکہ حکومتی ادارے ان کو کرایہ دیتے ہیں۔ برطانوی سامراج نے کچھ علاقوں پر براہِ راست اور باقی علاقوں پر علاقے کے مقتدر لوگوں کو شہ دے کر آزاد خود مختار ریاستیں بنوا دیں۔

☆ انگریز نے پورے ہندوستان پر قبضے کے بعد مستقبل کی طویل حکمرانی کے لیے پہلے کلکتہ کے پاس ایک خاص علاقے پر اپنے برطانوی سٹاف کے لیے کالونیاں، رہائشیں اور انتظامی تربیتی ادارے بنائے۔ جنوبی ایشیا میں ایک زبان اُردو کو ترجیح دے کر (مسلمانوں کے آزاد منش اور لبرل طبقے کو خوش کر کے) اس کو برطانوی لوگوں کے لیے مقامی غلاموں اور محکوموں سے رابطے کی زبان قرار دے دیا اور انگریز افسروں اور فوجیوں کو وہاں کسی انتظامی ڈیوٹی سے پہلے اردو سکھانے کا بندوبست کر دیا۔ سرکاری زبان فارسی سے انگریزی کر دی گئی (1835ء) اور یوں مسلمانوں کا زوال شروع ہو گیا، مسلمانوں پر سرکاری ملازمت، فوجی ملازمت اور عدلیہ کی ملازمت کے دروازے بند کر دیے گئے جبکہ ہندوؤں نے اس مرحلے پر مسلمانوں کو نیچا دکھانے کے جذبے سے انگریز کے ساتھ تعاون میں پیش قدمی کی اور غیر ملکی سامراج نے بھی ان کو مسلمانوں پر ترجیح دی۔

☆ تعلیمی میدان میں بھی لارڈ میکالے کا بدنامِ زمانہ تعلیمی اصلاحات کا پروگرام روبعمل لایا گیا اور برطانوی حکمرانوں کو مقامی لوگوں میں وفاداری اور اطاعت گزار خدمت گار فراہم کرنے کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم کے ادارے کھولے گئے جس کے ساتھ عیسائیت کی تعلیم بھی اور جگہ جگہ مسلمانوں کو عیسائی بنانے اور پھر ان کے لیے چرچ بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

☆ 1857ء آتے آتے مسلمانوں کو احساس ہوا کہ انگریز نے مغل حکمرانوں کے گرد گھیرا تنگ کر دیا ہے اور مغل بادشاہوں کی حکمرانی شاہی محلات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور ملکی معاملات میں بھی ہر طرح سے مسلمانوں کو دبایا جا رہا ہے اور ہندو غیر ملکی سامراج کی چاپلوسی میں پیش پیش ہے اگرچہ قلیل تعداد میں ہندو مذہب کے عوام و زعماء مسلمانوں کے ساتھ بھی تھے مگر حقیقتاً وہ بھی صرف اس لیے مسلمانوں کے حمایتی تھے کہ مسلمان اُٹھ کر بظاہر مقتدر سامراج سے ٹکرا جائیں اور سامراج انہیں ختم کر دے تاکہ ہندو بلاشرکت غیرے غیر ملکی سامراج کے زیر سایہ حکمرانی کے مزے لوٹے۔ برطانوی سامراج گلوبل ویو (GLOBAL VEIW) رکھتا تھا جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کو ہی دبا کر رکھنا چاہتا ہے کہ وہ عظیم سلطنت عثمانیہ کو کمزور کر کے پوری دنیا کے وسائل

پر قبضہ کر سکے۔

☆ مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف تیاری کر کے پہلے سکھ حکمرانوں سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور دہلی سے مجاہدین براستہ سندھ شکار پور بولان قندھار غزنی کابل جلال آباد پشاور پہنچے تھے کہ مسلمان حکومت کی پشت پناہی حاصل رہے۔ پشاور کے علاقے میں چند عارضی کامیابیوں کے بعد مسلمانوں کی یہ عظیم تحریک، تحریک شہیدین بھی ناکام ہوگئی اور 4 مئی 1831ء کو بالاکوٹ (کشمیر) کے مقام پر اس تحریک کے زعماء نے جامِ شہادت نوش فرمایا اور وہیں مدفون ہیں۔

☆ 1857ء کی جنگ آزادی میں تحریک شہیدین کے وارثان ہی پیش پیش تھے جبکہ ہندو بحیثیت قوم اس تحریک آزادی میں شریک نہیں تھے اور نہ ہی وہ انگریز سے آزادی چاہتے تھے بلکہ وہ اندر سے خوش تھے جبکہ یہود اور ہنود میں بہت سے مذہبی تصورات مشترک ہیں اور بعض اہل علم کے نزدیک تو ہندو آریہ یہودیوں کے بارھویں قبیلہ کے افراد ہی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں صحرائے تیہ میں راستہ بھول کر ہند آ گئے تھے۔ (واللہ اعلم)

وارثانِ تحریک شہیدین نے جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد بھی برطانوی سامراج سے کسی قسم کی مداہنت کرنے سے گریز کیا۔ جبکہ مسلمانوں میں سے ایک طبقہ سر سیّد احمد خان کے ساتھ ہوگیا جو انگریزوں سے مفاہمت اور صلح کے قائل تھے اور مغربی علوم وفنون حاصل کر کے بقائے باہمی کے اصول پر زندہ رہنا چاہتے تھے۔ برطانوی سامراج نے ویسے ہی مسلمانوں کے جذبہ جہاد سے خائف ہو کر ایک فرضی اور جعلی نبی قادیان سے کھڑا کر دیا جس نے مسلمانوں کے لیے جہاد کو حرام قرار دے دیا اور بہت سے جدید تعلیم یافتہ لوگ اس طبقے میں شامل بھی ہوگئے اور آج ڈیڑھ صدی بعد بھی برطانیہ واسرائیل اس طبقے کی سرپرستی کر رہا ہے۔

☆ 1860ء کے بعد جب بے شمار مسلمان ACTIVISTS کو تختہ دار پر لٹکایا جا چکا تو برطانوی سامراج نے جنوبی ایشیا میں اپنے اقتدار کو مستحکم کر کے EIC سے اقتدار تاجِ برطانیہ کو منتقل کر دیا۔ چنانچہ اب شہری اور SETTLED علاقوں میں سکول، کالج، کچہریاں، تھانے، پولیس ٹاؤن، کمیٹیاں، کونسلیں وغیرہ بنیں جبکہ 625 ریاستیں تھیں جو انگریز کے ماتحت ہونے کے باوجود اپنے راجے اور حکمرانوں کے زیر انتظام تھیں ان پر انگریز کا بالواسطہ کنٹرول تھا۔ چنانچہ قانون کی

عملداری کے لیےقوانین جاری ہوئے جوآج بھی جاری ہیں سب کے سب مجریہ 1860ء یااس کے بعد کے ہیں۔

☆ برطانوی سامراج سے آزادی کے لیے ہندوؤں میں (70% ہونے کے باوجود) کوئی ملک گیر قابل ذکر تحریک نہیں چلی۔ مسلمانوں میں وقتاً فوقتاً جذبہ آزادی اُبھرتا رہا (اور بعض علاقوں جیسے سندھ میں حروں کے ہاں 1941ء تک مزاحمت جاری رہی اور پنجاب میں گوگیرہ کے علاقے میں کھرل خاندان نے 1920-1925ء تک حکمرانوں کو چین نہیں لینے دیا)۔ مجموعی طور پر پورے جنوبی ایشیا پر انگریز اطمینان سے حکومت کرنے لگا۔ مسلم لیگ 1906ء میں بنی۔ برطانوی سامراج نے یہودی اور صہیونی منصوبہ کی تکمیل کے لیے عثمانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور خلافت کی مقدس امانت بھی ختم کر دی جس پر ہند کے غلام ابن غلام مسلمانوں نے اپنے آقاؤں کے خلاف زبردست تحریک چلائی کہ برطانوی اقتدار ڈول گیا اور قریب تھا کہ انگریز یہاں سے دفع ہو جاتا مگر گاندھی نے اپنے پیروکاروں سمیت اس میں شرکت اختیار کر لی یہ شرکت منافقانہ اور سیاسی تھی گاندھی کی نگاہ نے بھانپ لیا تھا کہ اگر اس تحریک کے نتیجے میں برطانوی اقتدار ختم ہوگیا تو جنوبی ایشیا دوبارہ مسلمانوں کے زیر تسلط آجائے گا لہٰذا اس نے منافقت سے اس میں حصہ لیا اور انگریز کی طرفداری کر کے اس تحریک کو اندر سے نقصان پہنچایا کہ تحریک ماند پڑ گئی۔

☆ 1857ء کے بعد کی ساری تاریخ علامہ اقبال کے سامنے تھی اور وہ انگریزوں کو ان کے وطن میں جا کر دیکھ آئے تھے لہٰذا ان کے مشاہدہ اور انگریزوں کے تعامل باہمی سے جو نتیجہ انہوں نے نکالا وہ یہ تھا کہ انگریز دراصل ہندو کی سرپرستی کر رہا ہے اور برطانوی اقتدار اور ہندو من حیثیت القوم مسلمانوں کے خلاف متحد ہیں کہ ان کو کہیں اقتدار نہ مل جائے۔ یہی بات علامہ اقبال نے 1936ء کی ابلیس کی مجلس شوریٰ میں ابلیس کی زبانی کہلوائی ہے کہ

ے خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

☆ علامہ اقبال نے اپنی شعوری زندگی کے تجربہ اور مطالعہ سے جو سبق سیکھا اور تحریک خلافت میں مسلمانوں کا جو والہانہ جذبہ دیکھا تو انہیں اُمید ہوگئی کہ ابھی مسلمان قوم زندہ ہے اور

یہ اپنے اجتماعی ضمیر کے مطابق اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے لیے قربانیاں دے سکتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے طلوعِ اسلام جیسی نظمیں لکھیں اور اپنی اردو نظموں کو دوبارہ شائع کرا کے عام کرایا جس سے قوم میں خود شناسی کا جذبہ پیدا ہوا اور اپنے مستقبل کی فکر دامن گیر ہوئی۔

☆ بیسویں صدی کے آغاز اور اس سے تھوڑا عرصہ قبل برطانوی سامراج کے بارے میں یہ بات دنیا جانتی تھی کہ اس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ اس منحوس سامراج کے مقبوضات اتنے وسیع اور چہار دانگ زمین پر پھیلے ہوئے تھے کہ کہیں نہ کہیں دن رہتا تھا اور لندن میں برطانوی سامراج کا دفتر خارجہ (FOREIGN OFFICE) چوبیس گھنٹے کھلا رہتا تھا اور کام کرتا تھا۔

اس صورت حال سے برطانوی قوم میں تکبر، غرور اور فرعونیت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا اور اس کا لہجہ، فرعونی اور خدائی لہجہ ہو گیا تھا۔ برٹرینڈ رسل ایک برطانوی فلسفی، ماہر تعلیم اور دانشور شخص گزرا ہے (1872ء-1970ء) وہ اپنی سوانح حیات میں لکھتا ہے کہ جب میں بھرپور جوان تھا (30 سال کی عمر، گویا 1900ء کے بعد) تو ہر برطانوی نوجوان یہ سمجھتا تھا اور اسے یقین تھا کہ موجودہ برطانوی اقتدار اتنا مستحکم اور ہمہ گیر ہے کہ وہ کبھی ختم نہیں ہو گا بلکہ ہمیشہ جاری رہے گا۔ تاریخ میں یہی دھوکا ہے جو اکثر حکمرانوں کو ہوا جس سے انہوں نے خدائی کا دعویٰ کر دیا اور فرعونی لہجہ اختیار کر لیا اور بالآخر چند عشروں میں ان کے اقتدار کا شیش محل زمین بوس ہو گیا۔

تاریخ میں بیسویں صدی کے آغاز میں یہی دھوکا برطانوی اقتدار کے اعلیٰ دماغوں کو لگا اور انہوں نے ناپاک صہیونی مقاصد کے حصول کے لیے مسلمانوں سے ٹکر لے لی اور سلطنت عثمانیہ کو سازش سے ختم کر دیا۔

☆ خالق کائنات نے پہلے انگریز کے غرور و تکبر کو مسلمان غلام قوم کے ذریعے تحریک خلافت برپا کرا کے ختم کر دیا اور پھر اگلے 20 سالوں میں دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانوی وسیع حکومت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی جو نصف صدی بعد صرف جزائر برطانیہ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ فَاعۡتَبِرُوۡا یَا اُولِی الۡاَبۡصَارِ

حصّہ دوم

علاّمہ اقبال کی شخصیّت کے مختلف پہلوؤں پر عمومی نظر

1

علامہ اقبال بحیثیت مزاج شناسِ مغرب

1 علامہ اقبال بحیثیت ’مزاج شناسِ مغرب‘

○ خالق کائنات نے دنیا بنائی ہے اور آسمان، زمین، افلاک کی دنیا میں حیات پیدا فرمائی اور پھر انسان کو اشرفُ المخلوقات بنایا۔ یہ دنیا اللہ نے انسان کی صلاحیتوں کو جانچنے اور قوت فیصلہ واختیار کے صحیح استعمال کرنے یا نہ کرنے کی جانچ کرنے کے لیے بنائی ہے۔ یوں خیر کی قوتوں کے ساتھ شر کی قوت بھی امتحان کے لیے پیدا فرمائی ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (02:67)

”اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے“۔

پھر ایک دوسری زندگی میں اس امتحانی عمل کا نتیجہ نکلے گا یا ہمیشہ ہمیش کی پرسکون دائمی زندگی یا مسلسل عذاب اور تکلیف دہ کیفیت۔

○ اس دنیا میں شر کی قوتوں کا سرخیل ابلیس یا شیطان یا LUCIFER ہے، جو شر محض ہے اور اللہ کی رحمت اور بھلائی کی قوتوں اور ان کے اچھے اثرات سے ہمیشہ کے لیے محروم ہے۔

جو انسان اپنی زندگی میں ’خیر‘ کا راستہ چھوڑ کر خود ہی برائی کی طرف لڑھک جاتے ہیں وہ شیطان کے ہتّھے چڑھ جاتے ہیں اور شیطان کی پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں اس سطح

پر سمجھنے کے لیے دو ہی دھڑے یا پارٹیاں ہیں: ایک حزب اللہ یعنی اللہ کی پارٹی جو خیر کی علمبر دار ہے اور دوسری حزبُ الشیطان جو شیطان کی پارٹی ہے۔ بلا لحاظ مذہب وملت اور رنگ ونسل لوگ بظاہر کچھ ہیں مگر حقیقت میں وہ ان دو پارٹیوں میں سے ایک کے علمبر دار ہیں۔

☆ آج کی دنیا میں بھی ایسا ہی ہے، چند ہزار سال پہلے بھی ایسا ہی تھا اور چند صدیاں بعد بھی ایسا ہی ہوگا جب تک یہ دنیا قائم ہے اور انسان روئے ارضی پر موجود ہیں خالق کائنات کی طرف سے یہ امتحانی مراحل بھی درپیش رہیں گے اور لوگ اپنے اعمال کی بدولت اپنی زندگی کا مستقبل خود بناتے رہیں گے۔ اس کائنات میں اکثریت کو یہ دھوکا لگا ہوا ہے کہ کوئی بات نہیں یوسف بھائی کو قتل کردو (یعنی ایک بڑا گناہ کرلو) بعد میں توبہ کرلینا۔ حالانکہ آسمانی تعلیمات کے مطابق اعمال اور جزا وسزا اور توبہ کا یہ تصور نہیں ہے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ انسان زندگی فرعون جیسی گذارے اور قیامت کے دن انجام موسیٰ علیہ السلام جیسا ہوجائے یا زندگی موسیٰ علیہ السلام جیسی گذارے اور انجام فرعون جیسا ہوجائے۔ اعاذنا اللہ من ذالك

☆ ابلیس، شیطان اور شر کی قوت کا تصور دنیا کے تمام مذاہب میں پایا جاتا ہے اور اس قوت کا احساس ہر انسان کو باطنی طور پر ہوتا ہے جب وہ اپنے اندر سے محسوس کرتا ہے کہ کچھ کام نیکی کے ہیں وہ کرنے چاہئیں مثلاً سچ بولنا، پورا تولنا، خدمت خلق وغیرہ وغیرہ اور اس کے مد مقابل کچھ کام ایسے ہیں جن سے انسان کے اندر کی ایک باطنی قوت ضمیر اس کو منع کرتا ہے مثلاً کسی کو دھوکا دینا، وعدہ خلافی کرنا، کسی کی عزت پر حملہ کرنا، کم تولنا وغیرہ وغیرہ۔ ضمیر کے منع کرنے کے باوجود انسان وہ کام کرے تو ضمیر اندر سے کاٹتا ہے۔ جس کو انگریزی میں GUILTY CONSCIENCIOUS کہتے ہیں اور لوگ یہ جملہ بولتے ہیں کہ MY CONSCIENCIOUS IS BITING ME (میرا ضمیر مجھے کاٹ رہا ہے)۔ انسان کو برائی پر آمادہ کرنے والی قوت کا نام نفسِ امّارہ ہے (جس کا ذکر قرآن مجید میں تیرھویں پارے کی پہلی آیت میں ہے)۔ ضمیر کے احساس کا تذکرہ سورۂ قیامہ (02:74) میں آیا ہے۔ نفس انسانی شر کی قوت بن جائے تو انسان بگڑ جاتا ہے۔ اس کی اصلاح ہوجائے تو نفسِ لوّامہ اور پھر کامل انسان ہوجائے تو نفسِ مطمئنّہ کے مقام تک پہنچ جاتا ہے (27:89)۔ نفس مطمئنہ یا آسمانی ہدایت کے مطابق اچھا انسان بننا آخرت کی جواب دہی کا شدید

اور حقیقی احساس پیدا کرتا ہے تاکہ انسان ہر کام آخرت میں باز پرس کے شعور کے تحت کرے حتیٰ کہ دنیاوی وسائل رزق اور مال و دولت کو باعث عزت نہ سمجھے بلکہ ایک LIABILITY سمجھے کہ قیامت کے دن اس کے صحیح یا غلط استعمال کا جواب دینا ہے۔ جتنا کم مال ہو اچھا ہے اور جتنا زیادہ مال ہو اتنا حساب زیادہ اور سخت ہوگا اور نتیجہ یا جنت یا دوزخ ہوگی۔

☆ غیر مسلم اکثر اقوام مذہب کے تصور سے عاری ہیں تو آخرت کے احساسِ جوابدہی سے بھی نابلد ہیں۔ آسمانی مذاہب میں یہودی اور عیسائی ہیں وہ آخرت کو مان کر کام کر سکتے ہیں مگر بالعموم مذہبی ذہن خراب ہوتا ہے تو وہ آخرت کو مان کر مختلف باطل سہارے ڈھونڈھ کر اپنے اندر کے انسان (ضمیر) کو جھوٹی تسلی دے لیتا ہے کہ میں آخرت کو مانتا ہوں حالانکہ آخرت کو مان کر اپنے لیے کوئی چور دروازہ بنالینا ـــــ آخرت کے انکار ہی کے مترادف ہے۔

☆ یہود و نصاریٰ نے آخرت کو مان کر چور دروازے بنا لیے تھے۔ آج سے کوئی صدی بھر پہلے مغرب میں عیسائیوں اور یہودیوں (بنی اسرائیل) میں 2 یا 3 فیصد لوگ باضمیر اور آخرت کے صحیح ماننے والے ہوں گے مگر آہستہ آہستہ یہ شرح کم ہو کر اب ایک فی صد سے بھی کم رہ گئی ہے۔ خود مسلمانوں میں بھی یہ شرح دو صدیاں قبل کے مقابلے میں اب آدھی بھی نہیں ہے تاہم مسلمانوں میں یہ شرح کم از کم 10% سے بلند ہے۔ واللہ اعلم

☆ یہود و نصاریٰ کے بے ضمیر ہو جانے اور CONSCIENCE سے تہی دست ہونے کا عمل کوئی یکا یک (OVER NIGHT) نہیں ہو گیا بلکہ ایک طویل عرصے کی 'شر' کی حمایت اور خود خیر پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے صورت حال یہاں تک پہنچی ہے۔ یہود و نصاریٰ قرآن مجید کی اصطلاح میں بنی اسرائیل کہلاتے ہیں اور اسرائیل (حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب) کی اولاد ہونے کی وجہ سے بنی اسرئیل کہلاتے ہیں۔ جیسے عرب میں بنو ہاشم، بنواُمیہ، بنوعباس وغیرہ اور ہمارے ہاں لالیکا (لالے کا)، مانیکا (مانے کا) مرید کے وغیرہ کے الفاظ مستعمل ہیں۔ بنی اسرائیل میں سے اکثر بگڑ گئے تھے حتیٰ کہ سات آٹھ صدیوں بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں بہت سے الٹے اور خلاف تورات کام کرتے رہے پھر ایسے بگڑے کہ 600 ق م کے لگ بھگ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے فرستادہ پیغمبروں کو پہلے جھوٹا کہا اور پھر عرصے تک ہر آنے والے پیغمبر کو قتل

کر دیتے تھے۔قرآن مجید میں یہود کا سب سے بڑا جرم یہی بتایا گیا ہے کہ وہ 'قتل انبیاء' کے مجرم تھے اوراس فعل کے لیے قرآن مجید میں ماضی استمراری کا صیغہ استعمال ہوا ہے کہ وہ (بنی اسرائیل) یہ فعل بدطویل عرصے تک کرتے رہے۔ پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام (انجیل برنباس) کو بھی سولی کے تختے تک پہنچانے والا بنی اسرائیل کا اپنا ایک طبقہ علماء یہود ہی تھا۔پھر 600 سال اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ روک دیا اور آخر میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں مبعوث فرمایا۔گویا 600ق م سے 600ء تک (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر آغاز وحی 610ء میں ہوا) دنیا آسمانی ہدایت سے خالی رہی۔تورات، زبور اور انجیل غائب کر دی گئیں جبکہ پیغمبر (نبی) قتل کر دیے جاتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام رسول تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے بچالیا۔

☆ یہی طبقہ بنی اسرائیل کا بگڑا ہوا گروہ مدینہ میں 600 سالوں سے آباد تھا اور اپنی کتابوں کے مطابق آخری پیغمبر کا انتظار کر رہا تھا۔ یہود ـــــ اس آخری پیغمبر کا انتظار ان پر ایمان لانے کے لیے نہیں کر رہے تھے کہ یہود کے مدینے میں آباد تین قبیلوں کے قریباً دس ہزار میں سے چند افراد ہی ایمان لائے باقی ZIONS تھے اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تمام کرنے کے لیے مدینہ میں آباد تھے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہی رویہ روا رکھا تھا۔ جنگ بدر، اُحد اور خندق کے موقع پر بدعہدی کی وجہ سے جلاوطن ہوئے پھر جنگ خیبر میں وہاں سے نکال دے گئے۔

☆ قتل انبیاء کے جرم پر آپ غور فرمائیں کوئی باضمیر انسان کسی عام اچھے باضمیر انسان کو نقصان اور گزند پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا کجا یہ کہ ـــــ اللہ تعالیٰ کی کائناتی حکومت کے سرکاری اہلکاوروں کو (ON DUTY) قتل کر دیا جائے بلکہ چھ صدیاں یہ عمل جاری رہے۔یہ خبیث کام کوئی خبیث ذہنیت کا فرد یا قوم ہی کر سکتی ہے۔اسی وجہ سے مسلمانوں کے نزدیک سورۃ فاتحہ کے الفاظ 'غیر المغضوب علیہم' میں مغضوب علیہم سے مراد اگر کوئی قوم ہے تو وہ بنی اسرائیل کا یہی بگڑا ہوا گروہ ہے اور اس بگڑے ہوئے گروہ سے مسلمانوں کو خبردار کرنے کے لیے قرآن مجید کے پہلے پارے میں مسلسل دس رکوع اسی گروہ کے جرائم کا ذکر ہے اور مسلمانوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ یہود سے عبرت حاصل کر کے اس راستے پر نہ جائیں۔

ﷺ علامہ اقبال کا فلسفہ خودی اور ضمیر

☆ علامہ اقبال اس حقیقت سے واقف تھے قرآن مجید کے مطابق انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دو وجود بخشے ہیں: ایک جسد خاکی جو مٹی سے بنا ہے اور یہ حیوانی وجود ہے اور اس کے تقاضے بھی سراسر حیوانی ہیں۔ دوسرا وجود روحانی وجود ہے جو 'نور' ہے۔ اور روح اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس سے ہر انسانی وجود میں ڈالی ہے۔ اسی روح کے احساس کی وجہ سے انسان میں ضمیر کا احساس ہے اور کئی دیگر زمرّد و یاقوت سے بھی قیمتی احساسات انسان میں ہیں جو خوبیاں بن کر انسان میں (روح کے احساس کی وجہ سے) ظاہر ہو کر نمایاں ہو جاتی ہیں۔

☆ اسی روح کی وجہ سے انسان میں ضمیر اور CONSCIENCE کا احساس ہے (یہ انگریزی لفظ CONSCIENCE بھی عجیب لفظ ہے۔ CON کا سابقہ انگریزی الفاظ میں کسی کام کی طرف کئی اطراف سے اس وصف کا جمع ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ جیسے FERENCE سے CONFERENCE، VERGE سے CON-VERGE، TACT سے CONTACT، SPIRE سے CONSPIRE وغیرہ) گویا وہ انسانی خوبی جہاں ساری SCIENCES جمع ہو جاتی ہیں وہ ضمیر یا CONSCIENCE ہے۔ قرآن مجید ضمیر انسانی کو شرفِ انسانی قرار دیتا ہے روحِ نظر نہیں آتی اگر روح واقعتاً انسان کے باطن میں ایک زندہ قوت ہو تو اسی باطنی زندگی کے لیے عربی میں 'حیا' لفظ آتا ہے جو 'حیات' سے ہی ماخوذ ہے گویا انسان میں حیا کا مادہ ہی ضمیر کی زندگی کا عکاس ہے۔

☆ روح کی تازگی اور زندگی یعنی انسانی نفسیاتی عوامل پر مکمل HOLD ہو تو روح زندہ ہے اور اگر یہ HOLD اور گرفت ڈھیلی پڑ جائے یا ختم ہو جائے تو اسی کو بے ضمیر اور پھر مردہ ضمیر کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اسی باطنی زندگی کی علامات میں سے سب سے بڑی علامت انسان میں نیکی اور بدی کی تمیز کا احساس ہے یعنی ایک MORAL LAW کا احساس ہوتا۔ نفس لوامہ کی اصطلاح اسی کیفیت کے لیے آئی ہے اس باطنی زندگی کی علامات میں سے اہم علامت انسان کا یہ احساس ہے کہ میرا کوئی خالق و مالک اور رب ہے۔ پھر اس رب سے محبت (یعنی آدرش سے محبت) کا احساس ہے کہ مجھے اپنے محسن اور رب سے محبت کرنی چاہیے۔

اسی باطنی زندگی کی علامتوں میں سے انسان کو لباس کی ضرورت کا احساس بھی ہے اس لیے کہ جانوروں میں بے لباسی کا کوئی شعور اور احساس نہیں پایا جاتا اور انسان بھی بے ضمیر ہو جائے تو لباس کی ضرورت اور ناگزیر ہونے کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

اسی باطنی زندگی کا ایک اہم احساس یہ ہے کہ انسان کا ضمیر زندہ ہو تو انسان کو ماحول میں رشتوں کی تمیز کا احساس رہتا ہے جب کہ یہ ضمیر مردہ ہو جائے یا روح کا تعلق جسد انسانی سے منقطع ہو جائے بقول اقبال ؏ روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد' یعنی زندگی ہی میں بعض انسان کی بداعمالیوں پر روح کا اثر جسد پر ختم ہو جاتا ہے انسان بے ضمیر ہو جاتا ہے اور انسان پھر صرف جسد خاکی کا نام رہ جاتا ہے جس سے وہ صرف جانور رہ جاتا ہے گویا شکل انسانوں جیسی رہتی ہے مگر حقیقتاً اس کا وجود (FOR ALL PRACTICAL PURPOSES) حیوان ہی شمار ہوتا ہے۔ جانورں میں کوئی رشتوں کی تمیز نہیں ہے جبکہ انسانوں میں تو 'غیرت' کا لفظ بڑا اہم ہے۔ ضمیر مردہ ہو جائے تو غیرت بھی ختم ہو جاتی ہے اور رشتوں کی تمیز اور تقدس بھی پامال ہو جاتا ہے۔

ب۔ روح کی زندگی ــــ اور ــــ ضمیر

اوپر جو تفصیلات نوکِ قلم پر آ گئی ہیں وہ قرآنی تعلیمات کا خلاصہ اور مسلمانوں کے ہاں بالعموم باطنی تجربہ نہ سہی ابھی تک زبانوں پر تو یہ اصطلاحات اور الفاظ جاری ہیں اور ان الفاظ کی CONNOTATIONS بھی کمزور ضمیر کے انسان بھی سمجھتے ہیں۔

پھر یہ حقیقت بھی کانوں سے سنی اور آنکھوں سے اس کے اثرات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم مختلف مواقع پر کئی الفاظ اور محاورے بولتے ہیں جن کا تعلق روحانی زندگی سے ہی ہے

(i) روشن ضمیر انسان، زندہ ضمیر انسان، باضمیر انسان

(ii) کبھی کبھی کسی انسان کی بدتمیزی کی شدت کی وجہ سے ہم کہتے ہیں انسان بنو ــــ جس سے لامحالہ یہ تصور ہوتا ہے کہ انسان بننے کے کچھ تقاضے ہیں حیوانی رویوں اور انسانی رویوں میں فرق ہے اور انسان بننا ایک حد تک اچھائیوں کو اپنے اندر سمو لینے کا نام ہے۔

(iii) پھر MAN سے ہی MANNERS کا لفظ بنا ہے جس کا مطلب انسانی اوصاف اور رویے ہیں جو روح کی موجودگی اور زندگی ہی کہ وجہ سے کسی انسان میں پرورش پا سکتے ہیں۔

(iv) ہمارے معاشرے میں کسی کو بے ضمیر اور مردہ ضمیر کہہ دیا جائے تو گویا اس شخص کے کردار کا ایک نقشہ یا اس کے باطن کی الفاظ میں تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔

ہمارے آقا سیّدنا حضرت محمد ﷺ کے ایک فرمان میں حیا کے بارے میں بہت معنی خیز الفاظ استعمال ہوئے ہیں:

اِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ بِمَا شِئْتَ

''جب تجھ میں حیا نہ رہے تو جو چاہے کر''

یعنی اگر تمہارے باطن میں روحانی زندگی (اور ضمیر مردہ ہوگیا ہو) اور 'حیا' ختم ہو جائے تو پھر جو چاہے کرے تجھے اندر سے کوئی قوت روکنے والی نہیں ہوگی۔ آدمی حلال وحرام کی تمیز، لباس کا اہتمام، رشتوں کے تقدس کا لحاظ اسی 'حیا' کی بنیاد پر ہی کرتا ہے۔ گویا حیا ختم ہوگیا تو باطنی زندگی اور ضمیر کی زندگی یا زندہ ضمیری یا روشن ضمیری کی کیفیت مفقود ہوگئی۔

ج۔ روح ـــ خودی

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں اسی قرآنی اصطلاح کو فارسی لفظ 'خودی' کہہ کر اس سے مراد روح ہی لی ہے۔ خودی کے لفظ کو عام انسان کے لیے قابل فہم اور آسان بنا دیا ہے۔

علامہ اقبال نے خودی کے بارے میں اپنے کلام میں کئی اوپر دی گئی تفصیلات کی طرف سے انسانی (قارئین کے) ذہن کو مبذول کرنے کی کوشش فرمائی ہے ایک جگہ فرماتے ہیں

ے ہے ذوقِ تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

ایک نظم میں فرماتے ہیں ع اک دانش نورانی، اک دانش برہانی

اسی نظم میں مزید فرماتے ہیں

ے اس پیکر خاکی میں ایک شئے ہے، سو وہ تیری
میرے لیے مشکل ہے اس شئے کی نگہبانی

اور ایک جگہ فرماتے ہیں

ع نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی ست

گویاقرآنی اصطلاح روح اورخودی کاایک ہی مفہوم اداہوگیا۔

قرآن مجید (سورۃ ص) میں آیا ہے کہ آدم کا جسد خاکی تیار ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں اس جسد خاکی میں اپنی طرف سے ایک روح ڈالنے والا ہوں جب 'میں وہ روح ڈال دوں تو تمام جن اور فرشتے اس آدم کے سامنے سجدریز ہوجاتا''

فَاِذَا سَوَّيۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِىۡ فَقَعُوۡا لَهٗ سٰجِدِيۡنَ (72:38)

''جب اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا''

گویاانسان کا اشرف المخلوقات ہونا اور مسجود ملائک ہونا اسی خودی یا روح کی وجہ سے ہے اور روح کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے رُوۡحِىۡ۔

روح کا اللہ تعالیٰ سے خاص تعلق ہے۔وہ تعلق کیا ہے؟فرماتے ہیں جیسے کرن کوسورج سے تعلق ہوتا ہے۔

یہ نکتہ میں نے سیکھا بوالحسن سے
کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے
چمک سورج میں کیا باقی رہے گی
اگر بیزار ہو اپنی کرن سے!

حاصل کلام یہ ہے کہ وہی بات جوقرآن مجید میں 'روح' کی نسبت فرمائی گئی ہے وہ تمام شانیں علامہ اقبال نے لفظ 'خودی' استعمال فرماکراس سے منسوب کردی ہیں اور اس اصطلاح کو عام فہم بنادیا ہے۔

د۔ خودی اور مغرب (یورپی اقوام)

☆ گذشتہ صفحات میں جنوبی ایشیا میں یورپی اقوام کی آمد،تجارتی سرگرمیوں کا آغاز صنعتی ترقی اور سائنسی ترقی کے جلو میں برطانوی صہیونی سامراج کا ہند پر قبضہ مغلوں کے اقتدار کا خاتمہ جنگ آزادی ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ اور تاج برطانیہ کی براہِ راست عملداری اور حکومت یہ وہ ماضی ہے جس نے علامہ اقبال کی آنکھیں کھولیں۔مقامی تعلیمی اداروں میں حصول تعلیم کے بعد مغرب

کے براہ راست 'وطن' اور جامعات میں مغربی فکر سائنسی انکشافات اور صنعتی ترقی کا مطالعہ کرنے کی غرض سے یورپ روانگی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے بعد واپسی کے دوران علامہ اقبال اسلامی فکر کی روشنی میں مغربی چکا چوند ترقی اور اس کے پیچھے نظریات کا مطالعہ کر کے گہرائی میں حقیقت تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔

☆ علامہ اقبال کے نزدیک مغرب نے موجودہ عروج کے دور میں پہلے عیسائیت کو علمی سطح پر خیر باد کہا پھر مذہب اور سیاست یا مذہب اور حکومت کو علیحدہ کر دیا تاکہ حکومتی معاملات اور پالیسیاں سیکولر انداز میں چلائی جاسکیں۔

☆ علامہ اقبال اس حقیقت تک بھی جلد پہنچ گئے کہ 'فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے' گویا مغربی تہذیب، اس کی اقدار، اس کے مقاصد اور مقاصد کے حصول کے لیے طریق کار سب کا سب پہلے سے طے کردہ ہے اور وہ سب کچھ پس پردہ قوت یہود کے ہاتھ میں ہے۔

☆ یہودی یا بنی اسرائیل (یہود اور عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ طبقہ دراصل ایک ہی ہیں) جب قتل انبیاء کا جرم جاری رکھے ہوئے تھے اور خدا کی طرف سے پے در پے عذابوں کا نشانہ بن کر بھی توبہ پر آمادہ نہیں تھے تب اللہ تعالیٰ نے انہیں 70ء میں رومی بادشاہ TITUS سے پٹوایا اور شکست دلوائی جس نے بعد ازاں انہیں فلسطین سے نکال دیا۔ اس کے بعد کے دور کو وہ اپنے لیے DAISPORRA کہتے ہیں عالمی تجارتی مراکز میں پہلے سے جاری روابط کی بنیاد پر جہاں سینگ سمائے وہاں پہنچ گئے۔ مدینہ میں آباد ہوئے مگر وہاں سے پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے ہاتھوں ذلیل ہو کر نکالے گئے۔ تاہم بنی اسرائیل کے دل میں بیٹھا یہ خواب کہ ہم نسلی طور پر باقی دنیا سے افضل ہیں اور حکومت ہمارا حق ہے اور ہمیں پوری دنیا پر قبضہ کرنا ہے لہٰذا نسلاً بعد نسل یہ خیال ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا اور صدیوں اسی خیال کو عملی جامہ پہنانے میں لگے رہے عالمی تجارتی روابط اور قیمتی دھاتوں اور ہیرے جواہرات کی تجارت کی بنیاد پر دنیا کے تمام اہم دارالحکومتوں اور بادشاہوں سے ان روابط تھے۔ حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ اور ان کی گرانے اور بنانے کا طویل تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔

☆ مدینہ سے نکالے جانے کے جلد ہی بعد، اور اپنے تجارتی روابط کی بدولت 750ء کے قریب تہران سے اوپر CASPIAN SEA کے قریب روسی علاقے کے ایک اہم قبیلے نے

من حیث المجموع یہودیت اختیار کرلی۔ جس قبیلے کو بنی اسرائیل نے حضرت یعقوبؑ کے بارہ بیٹوں کے نام سے بارہ قبیلوں پر اضافہ کر کے 13th TRIBE کا نام دیا۔

اس قبیلے کو یہ FAVOUR دینے کے بدلے ان سے مطالبہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل اور وہ روسی قبیلہ مل کر کوشش کریں گے۔ وہ قبیلہ فرنٹ پر رہے گا جبکہ بنی اسرائیل در پردہ اس کو رہنمائی اور SUPPORT فراہم کریں گے۔ تاکہ بنی اسرائیل (یہود) کا فلسطین میں دوبارہ داخلہ ہو سکے اور وہاں حکومت بنا سکیں۔ گذشتہ چھ صدیوں کی تاریخ اسی معاہدے کی عملی تفسیر ہے جو ہر اس شخص پر عیاں ہو جاتی ہے جو علامہ اقبال کی طرح یورپی تاریخ کا ذرا گہرائی میں مطالعہ کرتا ہے۔

☆ بنی اسرائیل نے گذشتہ چھ صدیوں سے حالیہ مغربی تہذیب کی پشت پناہی کر کے سوئٹزرلینڈ میں ایک عالمی جیوش کانفرنس کراوئی جس میں فلسطین میں اسرائیل کے قیام کا صد سالہ منصوبہ منظور ہوا (1897ء)۔ جس کے تحت پہلی جنگ عظیم برپا ہوئی اور سلطنت عثمانیہ ختم کر دی گئی ترکی نام کا ملک رہ گیا۔ کمال اتاترک نے خلافت کے علامتی ادارے کا خاتمہ کر دیا اور اسلامی عدالتی نظام کی بجائے رومن لا نافذ کر دیا۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد مئی 1948ء میں اسرائیل کا قیام عمل میں لایا گیا۔ علامہ اقبال سے یہ ساری باتیں مخفی نہیں ہو سکتی تھیں، وہ 1934ء میں مصر، فلسطین گئے تھے فلسطین میں عالمی کانفرنس میں شرکت بھی فرمائی تھی۔

☆ بنی اسرائیل کے تیرھویں قبیلہ ہی کے افراد ہیں جو جنگ عظیم اوّل اور دوم میں فریقین کی مالی امداد کرتے رہے تاکہ جو فریق بھی جیتے بنی اسرائیل اپنی مرضی کے فیصلے ان سے کرالیں اور اسرائیل ریاست قائم کرلیں۔ FORD, ROTHCHILD اور اس طرح درجن بھر خاندان ہیں جو دنیا کی مالیات پر قابض ہیں اور عالمی مالیاتی اداروں کے ذریعے مفت میں گھر بیٹھے کما رہے ہیں وہ دنیا کی سیاسی بساط پر اپنی مرضی سے تبدیلیاں لاتے ہیں اور تھرڈ ورلڈ کے بیسیوں ممالک میں مرضی کے حکمران لاتے ہیں۔

☆ علامہ اقبال کی نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ (1936ء) اسی عالمی یہودی قبضہ کی تفاصیل کا بیان ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ برطانوی سامراج کے دورِ عروج میں غلام قوم کا فرد اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اور کیا کہہ سکتا ہے۔ جمہوریت کیا ہے؟ کہیں کہیں بادشاہت کیوں ہے؟ کارل

مارکس یہودی کی شرارت کیا ہے۔ روسی انقلاب یہودی عزائم کی راہ میں رکاوٹ کیوں نہیں؟ ان سب سوالوں کا جواب یہی نظم ہے۔

☆ پہلی جنگ عظیم کے زمانے یا بیسویں صدی کی دوسری دہائی تک بنی اسرائیل نے انسان کی ایک مادی توجیہ کے لیے کئی یہودی آدمی کھڑے کر کے مرضی کے فلسفے تراشے اور مغربی جامعات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں کے نام پر تحقیق کے ذریعے عام کر دیے تاکہ حقیقی انسان جو جسد اور روح سے عبارت ہے اس کا تصور ہی ختم ہو جائے۔ چنانچہ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء یا فرائڈ کی نفسیات یا کارل مارکس کے معاشی نظریات ہوں، وہ یہودی نظریات کے حامل افراد تھے اور پہلے سے طے شدہ منصوبہ کے تحت غلط نظریات کو عام کرنے کا ذریعہ بن گئے جس سے یہودیوں کے منصوبے کو تقویت ملی اور وہ کامیابی سے ہمکنار ہو گیا۔

علامہ اقبالؒ ___ کی مغرب شناسی

'علامہ اقبال مغرب شناس تھے'۔ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ اوپر درج تاریخی حقائق، حالیہ مغربی تہذیب و افکار کے پیچھے بنی اسرائیل کا عیار ذہن، مغرب کے معاشی نظریات، سرمایہ دارانہ نظام اور سودی حقیقت کا یہود سے براہِ راست تعلق کو علامہ اقبال بدرجہ احسن سمجھتے تھے اس گہرے فہم اور مغربی افکار و نظریات کی حقیقت تک رسائی ہی کا اثر ہے اور علامہ اقبال کے کلام میں مندرجہ ذیل الفاظ آ گئے

ایں بنوک * ایں فکر چالاک یہود نورِ حق از سینۂ آدم ربود
تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

ع فرنگ کی رگِ جاں پنجہ یہود میں ہے *بینک کی جمع بنوک

ع ہے مگر کیا اس یہودی* کی شرارت کا جواب * کارل مارکس

یا ابلیس کا یہ فرمان کیا امامانِ سیاست کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی میری ایک ہو!

2

تہذیب مغرب کی متاعِ گم گشتہ ___ خُودی

2 تہذیب مغرب کی متاعِ گم گشتہ ___ خودی

◯ اس وقت ٹوکیو سے واشنگٹن یا اس سے آگے لاس اینجلس تک ہر تعلیم یافتہ انسان کی زبان پر یہی بات ہے کہ اس وقت دنیا پر مغرب کا غلبہ ہے، مغربی تہذیب غالب ہے۔ مگر لفظ 'مغرب' کے استعارے میں کون پوشیدہ ہے جسے مغرب کہا جاتا ہے اور دنیا کے نقشے میں مشرق کہاں سے کہاں تک ہے اور مغرب کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہوتا ہے؟ یہ ذرا مشکل سوال ہے اور جب ہماری زبان پر مغرب کی بالا دستی اور مغربی تہذیب کا غلبہ جیسے الفاظ آتے ہیں تو اس سے ہماری مراد کونسا ملک، کونسی قوم، کونسی زبان بولنے والے لوگ ہوتے ہیں جبکہ مغربی تہذیب کے الفاظ سے ایک عام آدمی کے ذہن میں کون سے لوگ آتے ہیں جن کے رہن سہن اور لائف سٹائل کو مغربی تہذیب کہا جا سکے۔

◯ یہ نکتہ دیکھنے میں بڑا سادہ اور بسیط لگتا ہے مگر وضاحت کرنے بیٹھیں تو یہ نکتہ بڑا پیچیدہ اور کسی واضح نشاندہی (DEMARCATION) سے عاری نظر آتا ہے اسی اِبہام کی وجہ سے ہر شخص دوسرے سے دھوکہ کھا رہا ہے اور کوئی اسے دھوکہ دے رہا ہے۔

◯ بات کو سمجھنے کے لیے گفتگو بنیاد سے شروع کرتے ہیں۔ کہیں آپ کھلی جگہ صبح کے وقت چڑھے سورج کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں اور اپنے بازو لمبے پھیلا کر کندھوں کے برابر سیدھے لے آئیں۔

سب جانتے ہیں کہ آپ کے سامنے کی طرف مشرق ہے۔ آپ کی پشت کی طرف

مغرب ہے (جہاں سورج چڑھتے چڑھتے نصف النہار پر جا کر نیچے کی طرف سفر کر کے 10 یا 12 گھنٹے میں ڈوب جائے گا) آپ کے دائیں ہاتھ جنوب ہوگا اور بائیں ہاتھ کی سیدھ میں شمال ہوگا تو اس شمال کی طرف رات کو ستارہ نظر آتا ہے جو قطب شمالی کہلاتا ہے اور یہ ستارہ زمین کے لحاظ سے کبھی بھی اپنی پوزیشن نہیں بدلتا اسی ستارے (جسے قطبی ستارہ کہتے ہیں) سے ساری سمتیں اور راستے متعین کیے جاتے ہیں۔ آپ ایک مرحلہ اور آگے سوچیں۔ زمین اور پلاٹ پر سمتیں اس طرح متعین کی جاتی ہے لیکن جب کسی پلاٹ (یا رقبہ) کا نقشہ اور ڈرائنگ بنائی جاتی ہے تو کاغذ کی ایک پھیلائی ہوئی شیٹ پر یہ چاروں سمتیں کس طرح بنتی ہیں۔
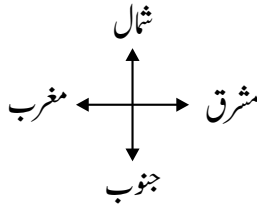
ایک کاغذ نقشے میں دکھایا گیا ہے (یہ کاغذ یا امتحانی گتہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہے) ان سمتوں کی نشاندھی کے لیے طے ہے کہ آپ کے سامنے جو کاغذ ہے اس کے دائیں طرف مشرق، بائیں ہاتھ مغرب، اوپر کی طرف (یا سامنے کی طرف) شمال اور آپ کی طرف (یا آپ کے سینے کی طرف) جنوب لکھے جاتے ہیں۔ یہاں تک بات سمجھنا بہت آسان ہے۔

جب دیوار پر کوئی نقشہ لگا ہوتا ہے یا سکولوں میں دنیا کا نقشہ دیواروں پر آویزاں کر دیا جاتا ہے اس وقت چاروں سمتیں زمین پر بچھے نقشے کو دیوار پر لٹکا دینے کی طرح ہوتی ہیں۔ دائیں مشرق، بائیں مغرب، نقشے کے چھت (آسمان کی طرف) والی سمت شمال اور نیچے یا فرش کی طرف سمت جنوب کہلاتی ہے۔

علمی دنیا میں مشرق مغرب کی تقسیم

عصر حاضر میں غالب تہذیب کے زیر اثر مذہب کی اہمیت کم ہوگئی ہے اور سائنسی انکشافات کو حتمی تصور کر لیا گیا ہے، تاہم دنیا کے نقشے میں بیت المقدس فلسطین کو مرکز مان کر ایک جغرافیائی تقسیم کی گئی ہے جو متداول ہے۔ یہ تقسیم کب اور کیسے ہوئی کس نے کی ہے یہ بات اتنی عام

نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی و دینی مرکز (کعبہ) کا محل وقوع بھی بیت المقدس کے طول بلد سے زیادہ دور نہیں ہے لہٰذا یہی علاقہ دنیا کا مرکز تسلیم کر لیا گیا فلسطین کے مغرب میں بحیرہ روم ہے لہٰذا مشرقی علاقے سے پہلی اصطلاح مشرق وسطیٰ زبان زد عام ہے پھر ایران افغانستان پاکستان اور بھارت، بنگلہ دیش وغیرہ مشرق شمار ہوتے ہیں جبکہ اس سے اور زیادہ دور علاقے مشرقِ بعید کہلاتے ہیں جبکہ مکہ ــــــ فلسطین اور قسطنطنیہ کو ملانے والے خط سے مغرب کی طرف کے علاقے مغرب کہلاتے ہیں۔

☆ تاریخ انسانی میں پانچ ہزار سال کی معلومات میں زیادہ انسانی آبادی خط استواء سے کوئی 3000 کلومیٹر بجانب شمال یا کوئی 0°ــــ35° تا 40° عرض بلد کی پٹی (BELT) ہے جو مراکش سے شروع ہو کر بنگلہ دیش اور برما تک جاتی ہے یہی علاقہ انسانی آبادی اور تہذیب وتمدن کا گہوارا رہا ہے۔ یہی وہ جغرافیائی پٹی ہے جہاں دن رات کا ایک واضح تصور پایا جاتا ہے اور دن رات میں گرمی سردی میں چار گھنٹے قریب کے فرق ہوتا ہے۔

☆ یورپ کا جنوبی ساحلی علاقہ تہذیبی طور پر FERTILE رہا ہے کہ وہ اسی بیلٹ کا حصہ تھا۔ اس سے شمال کی طرف جائیں تو موسم سرد، پہاڑی علاقہ اور وسائل زندگی کی دستیابی (2000 سال قبل) بہت کم تھی۔ پھر اس تقسیم میں یورپ مغرب کہلاتا ہے لیکن کسی خارجی دباؤ یا مذہبی لگاؤ یا کسی نامعلوم AFFILIATION کی بنیاد پر بحر اسود اور کیسپین کا شمالی نصف یورپ مغرب میں شمار ہوتا ہے۔ بحر اسود کا جنوبی ساحل اور اس سے ملحقہ ممالک ASIAMINOR کہلاتے ہیں اور مشرق شمار ہوتے ہیں حالانکہ جارجیا، ماسکو وغیرہ کے علاقے تہران سے قریب اور شمال میں ہیں مگر تہران مشرق اور جارجیا مغرب (یورپ) شمار ہوتا ہے۔

فلسطین سے بنگال تک کا علاقہ انسانی تہذیب کا گہوارہ

قدیم تاریخ انسانی کا مطالعہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ انسانی تہذیب کا گہوارہ یہی علاقہ رہا ہے جہاں رات دن کا نمایاں احساس پایا جاتا ہے سال میں بالعموم چار موسم بدلتے ہیں۔ اور وہ علاقے جہاں سردی نسبتاً کم اور گرمی کا دورانیہ زیادہ ہوتا وہاں انسانی تہذیب وتمدن، علم وہنر، تعلیم وفنون نے ترقی کی ہے۔ یہیں تعمیرات، محلات، سیر گاہیں، تفریح کے لوازمات، طرح طرح

کے لباس، زیب وزینت کا سامان اور زراعت نے ترقی کی ہے۔آج سے پانچ چھ صدیوں پہلے جب بجلی، پٹرول، گاڑیاں، انجن وغیرہ نہیں تھے تو اس بیلٹ سے اوپر شمالی علاقہ جات میں زندگی بہت مشکل تھی (اور بعض غیر ترقی یافتہ علاقوں میں اب بھی مشکل ہے) جہاں سورج سال میں 3 مہینے نظر آتا ہو یا جہاں چھ ماہ کی رات اور چھ ماہ کا دن ہو (جیسے بعض SCANDANAVIAN COUNTRIES) وہاں آپ سوچ سکتے ہیں کہ زندگی کا تصور کیا ہوگا۔ یہی وجہ سے تاریخ میں سائبیریا کا وسیع علاقہ جہاں برف اور سردی کا راج تھا اور تہذب وتمدن نام کو نہیں تھا وہاں سے غیر متمدن لوگ نکل کر وقفے وقفے سے (یہ وقفے چار پانچ یا چھ صدیوں پر محیط ہیں) نیپال یا قراقرم یا جارجیا کے پاس سے اس متمدن دنیا کی BELT پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں اور غیر متمدن وحشی ہونے کے ناطے ظالم سفاک، خونخوار انسانیت سے نابلد تھے لہٰذا متمدن دنیا کے لوگوں سے جنگ میں کامیاب ہوتے رہے بعض دفعہ یہی طبقات ماسکو اور جارجیا سے مغرب کی طرف یورپ پہنچتے رہے۔اسی وجہ سے سائبیریا کے علاقے کو عالمی فاتحین کا گھوارہ کہا جاتا ہے۔ایک ضخیم کتاب اسی عنوان سے ملتی ہے:.THE CYBERIA___CRADLE OF CONQUERERS

☆ غالب اِمکان یہ ہے کہ مذہبی روایات کے مطابق (بائبل بھی یہی کہتی ہے) آدم اور حوا (پہلا انسانی جوڑا) اسی متمدن بیلٹ میں اُترا اور غیر متمدن لوگ آکر اسی خطے سے آباد ہوتے رہے اور یہی قرین قیاس ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحشی وغیر متمدن لوگوں کا اس BELT میں آباد ہوکر کچھ انسانی اخلاق واطوار (MANNER) سیکھنے کے بعد ہی ان کی طرف پیغمبر معبوث فرمائے۔ زیادہ پیغمبر بھی اسی بیلٹ میں مبعوث ہوئے ہیں۔(واللہ اعلم)

مغرب اور مغربی تہذیب کیا ہے؟

متمدن انسانی دنیا کی اس BELT جس کا اوپر تذکرہوا ہے اس کے علاوہ شمالی اور جنوبی دنیا میں قطب شمالی اور قطب جنوبی تک کیا تھا۔آج کی جدید سہولتوں سے بہت پہلے (چار ہزار سال قبل سے 1500 سال قبل) کی تاریخ میں (یورپ جو مغرب کہلاتا ہے) تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے کیا تھا؟ اس کا سمجھنا زیادہ مشکل نہیں۔ وہاں زندگی کا تصور ہمارے پیمانوں کے اعتبار سے بڑا بچگانہ بلکہ 'احمقانہ' تھا۔انسان غیر متمدن اور وحشی تھا۔

لہٰذا ان مغرب کے علاقوں میں موجودہ تہذیبی چکا چوند کے اصول، نظریات، ذہنی پیمانے، روایات، کلچر سب کا سب سائبیرین طرز کا ہے جہاں اخلاق، کردار، انسانیت، تہذیب، تمدنی اصول، تعلیم، علوم وفنون وغیرہ کا شدید فقدان تھا۔ اغلباً آسمانی ہدایت سے بھی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پہلے کے زمانے کا تصور کریں 2019 سال قبل) یہ علاقے محروم ہی رہے۔

☆ حالیہ چند صدیوں کی مغربی ترقی اور علوم وفنون کی چکا چوند جن بنیادوں، ذہنی ساخت (MINDSET) اور اسلاف (ANCESTORS) کی روایات کو لے کر یہ تہذب پروان چڑھی ہے اور جوان ہوئی اس کو تصور میں لانے میں خاصی دقت ہوتی ہے۔

☆ آسمانی ہدایت سے عاری اس ماضی (2000 سال) کے بعد صدیوں کی روایات سے جو تہذیب اور کلچر، رہن سہن، زندگی کے اصول بنے وہ اپنی جگہ 300ء میں سلطنت روم کے بادشاہ قسطنطین (CONSTANTINE) کے قبول عیسائیت سے جو اثرات یورپ پر پڑے وہ آسمانی ہدایت کے اعتبار سے بہت PRIMITIVE تھے کہ عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جلد ہی بعد ہمارے نزدیک سینٹ پال کی تثلیث کا شکار ہوگئی تھی اور آسمانی ہدایت کی ٹھوس بنیادوں، توحید، آخرت، وحی، کتاب سے بہت دور چلی گئی تھی (یاد رہے کہ انجیل بھی 70ء سے پہلے ہی دنیا سے غائب کردی گئی تھی)

☆ یہی نہیں، سلطنت روما کُل کی کل عیسائیت میں داخل تو ہوگئی مگر اس کا قانون رومن لا، اس کا اخلاق حیوانی (اس لیے کہ تورات بھی غائب، انجیل بھی غائب اور سینٹ پال کی تثلیث کی گھما گھمی) تھا اسی لیے یورپ میں آج سے آٹھ سو سال قبل جب سپین کی یونیورسٹیوں سے یورپی نوجوان مسلمانوں کے علوم پڑھ کر یورپ لوٹتے اور تحقیق وجستجو کے راستے پر چلنے کا ارادہ کرتے تو مذہب آڑے آجاتا۔ اسی لیے جلد ہی سائنسی تحقیقات کا راستہ مذہب نے یورپ میں روک دیا۔ اسی کے نتیجے میں اس علمی تحریک (RENAISANCE یعنی احیاء العلوم) کے ذریعے جلدی ہی لوگوں کو احسان ہوا کہ مذہب اور سائنس عیسائیت کی دنیا میں اکٹھے نہیں چل سکتے لہٰذا نیا پروٹسٹنٹ طبقہ (فرقہ) سامنے آگیا۔ سود جائز قرار دے دیا گیا اور مذہب اور سیاست یا مذہب اور ریاست کو الگ کردیا گیا یعنی حکومتی معاملات چلانے میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا وہ سیکولر چلیں گے۔

مذہب زیادہ سے زیادہ انسان کا انفرادی اور نجی معاملہ ہوگا۔(یا اسفا! ماتم کا مقام ہے)

مغربی تہذیب کی حقیقی بنیادیں

قارئین کرام! بات طویل ہوگئی کہ یہ تفصیل بالعموم نہ ہمارے مدارس میں علماء پڑھ کر نکلتے ہیں کہ مسجد ومحراب ومنبر سے یہ خیالات عام ہوں اور نہ جدید تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی ہیں کہ ان کی دُکھتی رگ پر ہاتھ پڑتا ہے اور اسلام کے خلاف ذہن سازی کا سارا پروگرام اُلٹا ہوجائے گا۔اب قارئین کوشاید یہ بات سمجھ میں آجائے کہ حالیہ مغربی تہذیب کیا ہے؟ اس کی فکری اساسات کیا ہیں اور یہ تہذیب کن VALUES اور MORALS کو PROMOTE کرنا چاہتی ہے اور کونسی چیزیں اور اعتقادات پھیلنے سے اس تہذیب کی کاٹ ہوتی ہیں اور اس کی فکری جڑیں کٹتی ہیں۔

حالیہ مغربی تہذیب میں آدھا مشرقی یورپ جو کبھی سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا اور پہلی جنگ عظیم میں یا اس سے کچھ عرصہ قبل علیحدہ ہوئے تھے ان میں مسلمانوں سے میل جول کے اثرات تھے اور جرمنوں کی بدولت ہی یورپی اقوام میں مسلمانوں کے بارے میں معلومات اور مسلمان مفکرین کے افکار(کچھ صحیح کچھ غلط) پہنچے تھے۔

☆ اسی وجہ سے جرمنی میں مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی تہذیبی روایات اور ایرانی عربی روایات کا اثر تھا۔ مولانا روم کی مثنوی اور اسلام کے تصورِ انسانی روح کا تذکرہ جرمنی کے مفکرین میں پایا جاتا تھا۔ مگر یہ تصور بڑا PRIMITIVE اور غیر مدوّن یا جزوی تھا۔

حالیہ مغربی تہذیب اور خودی

☆ یورپ (اور یورپ سے امریکہ میں جا بسنے والے قدیم برفانی انسان میکسیکو کی تہذیب کے بانی تھے) ان میں انسانی ضمیر، روح (اندرونی احساس گنا) یا (GUILTY CONSCIENCOU) کا تجربہ تھا جس کی بنا پر ان کی زبان میں گناہ، نیکی، CONSCIENCE کے الفاظ مستعمل تھے۔تو وہ بھی پروٹسٹنٹ کلچر کے عروج، سود کے پھیلاؤ اور جان بوجھ کر پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت پھیلائے گئے خدا بیزار، وحی بیزار اور انسان دشمن نظریات (از قسم ڈارون تھیوری، کارل مارکس کا اقتصادی نظریہ، اور میکڈوگل وغیرہ کے نظریات) کے زیر اثر

بیسویں صدی کے آنے پر تیزی سے زوال پذیر تھے اور اخلاق اور MORALS کے الفاظ ان کی زبان اور ڈکشنریوں سے بالارادہ نکال دیے گئے تھے۔ تاکہ خالص سائبیریں کلچر اور ذہن جو خالص حیوانی ہے (بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہے) کو عام کیا جاسکے۔

☆ بیسویں کے وسط میں 1960ء کے قریب ایسا نظام تعلیم عام کردیا گیا تھا جس سے فارغ ہونے والا نوجوان مکمل طور پر VALUELESS اور MORALLESS ذہن رکھتا تھا آج اس ذہن کے ساتھ پختہ ہوکر تیسری نسل مغرب کے حکومتی ایوانوں میں براجمان ہے اور فیصلے کررہی ہیں۔

علامہ اقبال کی مغرب شناسی

علامہ اقبال 1905ء میں یورپ گئے تھے اور ایک سچے مسلمان اور فلسفی کی حیثیت سے مغربی تہذیب وتمدن، رہن سہن، سماجی ومعاشرتی اقدار، مذہبی روایات اور اخلاقی حیثیت سب کو دیکھ کر مغرب کی حقیقت کو سمجھ چکے تھے اور انہوں نے 1908ء میں واپسی پر اس لیے اپنی فارسی شاعری میں 'خودی' کو موضوع بنایا۔ اس لیے کہ روح اور خودی کے تصور کے بغیر مغربی معاشرہ تو حیوانی معاشرہ ہے جہاں اخلاقی سطح پر 'جنگل کا قانون' نافذ ہے۔ وہاں کا انسان حیوانی سطح پر گر چکا ہے بلکہ حیوانوں سے بھی بدتر ہے اس لیے کہ کوئی جانور اپنے جیسے جانور کو ازراہِ تفنن قتل نہیں کرتا مگر رومن بادشاہت میں غلام کو انسان ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اور لاکھوں غلام 1100 سالہ رومن عیسائی حکمران (300 عیسوی سے 1453ء تک) نے بلاوجہ شغلاً موت کے گھاٹ اتار دیے۔ اپنے مخالفین کو TORTURE کرنے کے ایسے طریقے ایجاد کر کے استعمال کیے کہ انسانیت لرزہ براندام ہوجاتی ہے یہی حال اس سے قبل یونانی بادشاہوں کا تھا اور یونانی اور رومی بادشاہت ہی آج کی مغربی تہذیب کی IDEALS ہیں (آپ انٹرنیٹ پر WESTERN CULTURE یا WESTERN CIVILISATION لکھ کر سرچ کریں تو سینکڑوں SITES کھل جائیں گی جو آپ کو بتائیں گی کہ مغربی تہذیب یونانی علم الاصنام اور رومی طرز حکومت کا مجموعہ ہے۔

علامہ اقبال اور مغرب

☆ ان حالات میں علامہ اقبال نے مغرب اور مغربی افکار کی کاٹ کے لیے یورپ سے

واپسی پر پہلی فرصت میں 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بےخودی' جیسی معرکہ آرا شاعری کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیا اور اس کاوش کا اثر بھی ہوا۔ علامہ اقبال اپنے اساتذہ سے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوں گے اور وہ ان کے خیالات سے واقف ہوں گے بلکہ کسی حد تک متأثر بھی۔ اس لیے کہ یہ انسانی فطرت ہے اور انسانی حقیقت کا اصلی چہرہ ہے 'خودی'۔ حقیقت انسان ایک صدی پہلے کا مغربی انسان نہیں (علامہ اقبال آج کے مغربی انسان کو دیکھتے تو نہ معلوم کیا محسوس کرتے؟ ان کے احساسات کا کچھ عکس ضربِ کلیم میں محسوس کیا جا سکتا ہے)۔

☆ علامہ اقبال کی بر موقع یہ دو کتابیں شائع ہوئیں اور مغرب کے علمی ایوانوں تک بھی پہنچیں اور زندہ ضمیر (CONSCIENCE) لوگوں کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کی طرح روحانی سکون دے گئیں اس لیے جلد ہی علامہ اقبال کے استاد پروفیسر رینالڈ نکلسن نے علامہ اقبال کی ان دونوں کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا تاکہ یہ 'حقیقت انسان' اہل یورپ پر بھی کھل سکے۔ اس کتاب کے لیے PREFACE لکھنے کی خواہش خود علامہ اقبال سے کی گئی۔ جو علامہ اقبال نے لکھا۔ "THE SECRETS OF SELF" کے نام سے یہ کتاب 1930ء میں چھپی اور یورپ میں پڑھی گئی۔ اس کتاب پر امریکہ کے ڈاکٹر ہربرٹ ایڈ نے تبصرہ بھی لکھا تھا جو ضمیمہ جات میں درج ہے۔

☆ مغرب اور اہل مغرب کے ساتھ مغربی تہذیب کی UNPRECEDENTED گراوٹ ہی کا نتیجہ ہے کہ ایک صدی قبل مغرب کی ڈکشنریوں اور وہاں کے اہل علم میں ضمیر اور CONSCIENCE کے الفاظ مستعمل تھے مگر آج یہ الفاظ اور ضمیر کی خلش یا GUILTY CONSCIENCOUS یا VIRTUE اور اخلاق کے الفاظ ان کی زبان سے نکل گئے اور متروک ہو چکے ہیں اسی اخلاقی اور علمی قحط کا نتیجہ ہے کہ اب ان کی شاعری (بالخصوص امریکہ) میں ترفع، معنویت، بلند خیالی، تصوراتی پاکیزگی مفقود ہے اور وہاں کے لوگ حیوانی سطح تک گر چکے ہیں۔ وہ زوال جسے علامہ اقبال ایک صدی قبل دیکھ آئے تھے وہ اب پختہ ہو کر مغرب کو اندر سے کھوکھلا کر چکا ہے اور وہی بات جو علامہ اقبال نے بانگ درا میں کہی لگتا ہے وہی پوری ہونے والی ہے۔

ع تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
شاخ نازک پہ جو آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

حیوانی جبلتوں پر استوار معاشرہ میں اخلاق، کردار، انسانیت، عفت وعصمت اور ناموسِ زن تلاش کرنا کارِعبث سے بھی بدتر فعل ہے۔

خودی مغرب کی گم شدہ متاع ہے

علامہ اقبال کا فلسفہ خودی کا حاصل یہ ہے کہ مغرب کی چکا چوند ترقی، چمک دمک، چلت پھرت، فاسٹ فوڈ تھیٹر، نائٹ کلب، پاپ کلچر، فلمیں، فلمی ستارے، تفریح کے اسباب اور لائف سٹائل سے ظاہر ہے کہ یہ معاشرہ انسانی سطح سے گر چکا ہے اور خودی نام کی کوئی چیز اس معاشرہ میں باقی نہیں ہے۔

☆ علامہ اقبال کے نزدیک لفظ مغرب میں ہر وہ معاشرہ اور تہذیب شامل ہے جو حالیہ مغربی غلبہ کے نتیجے میں مغرب کی غلام ہے یا مغرب سے مرعوب ہے یا مغرب سے خائف ہے۔ مغربی معاشرہ میں خودی مر چکی ہے خودی کی موت انسان میں حقیقی جذبہ عمل جو صحیح بنیادوں پر نصب العین کی طرف حرکت کا نام ہے وہ جذبہ یعنی عشق ختم ہو جاتا ہے انسان کے لیے جذبہ محرکہ صرف عقل رہ جاتی ہے جو حیوانات سے مشابہ ہے حیوانات بھی اپنی عقل استعمال کر کے اپنی جبلی خواہشات پوری کرتے ہیں انسان کو اس سطح تک نہیں گرنا چاہیے یعنی خودی کی حفاظت کرنا چاہیے۔

☆ علامہ اقبال کو ایک بامروّت انسان کی حیثیت سے احساس تھا کہ یہ مغربی معاشرہ اور مغربی تہذیب 'خودی' سے بیگانہ ہو کر کہاں جا رہی ہیں۔ سوائے تباہی اور بربادی کے کیا انجام مقدر ہو سکتا ہے۔

خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ (11:22)

''دنیا میں بھی نقصان اٹھایا اور آخرت میں بھی۔ یہی تو صریح نقصان ہے''۔

3

علامہ اقبال کا مغرب کے نام پیغام ــــ خودی کی بازیافت

3 علامہ اقبال کا مغرب کے نام پیغام
__ خودی کی بازیافت

’خودی‘ کی وضاحتیں اور جہتیں بہت بیان ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خودی ایک نوری چیز ہے (جسے قرآن رُوح کہتا ہے) جسد خاکی سے اس روحانی حقیقت (روحانی وجود) کا رابطہ اتصال کہاں ہے؟ کیسے ہے؟ کتنا ہے؟ خودی کی معرفت اور ”مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ“ کا یہ حصہ علم قرآن کا ایک پورا شعبہ ہے۔ مختصراً یہ جیسے دو کُرّے یا دو گیند آپس میں ہر صرف نقطہ پر ہی ملتے ہیں اسی طرح جسد خاکی اور جسد روحانی (خودی) جس نقطہ پر ملتے ہیں وہ نقطہ انسان کے دل میں واقع ہے۔ اس اتصال کو انسان صرف محسوس کرسکتا ہے بیان نہیں کرسکتا ان کیفیات کے لیے قرآن میں نفس مطمئنّہ، نفس، نفس لوّامہ اور نفس امارہ کے الفاظ آئے ہیں جب انسان کے دل میں خیالات اچھے ہوں انسان دوست، اخلاق دوست خدا شناس، وحی شناس ہو تو یہ نفس مطمئنہ کی کیفیت ہیں جب انسان کچھ اچھائیاں اور برائیاں کرتا ہو مگر برائی پر اندر سے کوئی احساسِ ندامت ہوتا ہو (GUILTY CONSCIENCOUS) وہ نفس لوّامہ ہے اور اگر انسان کے مسلسل غلط کام کرنے سے کیفیت یہ ہو جائے کہ اب وہ ہر وقت برائی ہی کا سوچتا رہے، اچھے خیالات یا ندامت کم رہ جائیں تو اس کیفیت کو بالعموم نفس امّارہ کہتے ہیں اور بھلائی اور ندامت کا احساس ہی ختم ہو جائے تو قرآن مجید میں اس کے لیے ’ختم قلوب‘ کا لفظ آیا ہے اور عام الفاظ میں دل پر مہر لگ جاتی ہے گویا SEAL کر دیا جا تا ہے۔ اب ہدایت داخل نہیں ہوسکتی۔ (اللہ تعالیٰ اس باطنی STAGE سے بچائے آمین) اردو میں ان کیفیات کے لیے ’ضمیر‘ (بمعنی مضمر اور چھپا ہوا

احساس) کا لفظ بولا جاتا ہے اور اس کے ساتھ سابقے لگا کر اس کی کیفیات کو ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ 'مردہ ضمیر' کا لفظ ہمارے معاشرے میں 'ختم قلوب' ہی کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ پھر زندہ ضمیر اور باضمیر کے الفاظ ہیں پھر 'روشن ضمیر' کی اصطلاح تو علامہ اقبال نے بڑی بامعنی اور خودی کے اعلیٰ مقامات کے لیے استعمال کی ہے۔

خودی ___ ضمیر ___ فطری چیز ہے اور ہر انسان کے اندر ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے، اس کے لیے رہنمائی کی ضرورت تھی، اس کا ایک حصہ فطرتِ انسانی میں INBUILT رکھ دیا ہے کہ ہر انسان کو ہر لحظہ نیکی / بدی کا شعور ہے۔ دوسرا حصہ اس ضمیر کی حفاظت وصیانت پر منحصر ہے اور وہ حصہ انبیاء کرام علیہم السلام اور وحی کے ذریعے دنیا میں انسانوں تک پہنچایا گیا ہے۔ گویا جو انسان پہلا سبق یاد رکھتا ہے ضمیر کو نفس لوامہ کی حد تک ہی زندہ رکھتا ہوا اچھا انسان ہے اور جب کبھی آسمانی ہدایت یا خداشناسی کی دعوت اس تک پہنچتی ہے تو وہ اس کو قبول کر لیتا ہے اور مردہ ضمیر اس کو قبول نہیں کر سکتا۔ ضمیر کی زندگی کے لیے زندہ ضمیر اور باطنی زندگی اور حیاء (حیاء معنی حیات) کا لفظ مستعمل ہے۔ پھر ضمیر کی یہ کیفیات حقیقتاً کہاں تک صحیح ہیں یا غلط حتمی طور پر یا انسان خود جانتا ہے یا اللہ جانتا ہے، کوئی دوسرا انسان کسی کی باطنی ضمیر کے درجات تک رسائی نہیں رکھتا۔ ہم تو ہر معقول انسان کو نیکی و بھلائی کی دعوت دیں گے البتہ قبول وہ کرے گا جس کے اندر کا انسان اور ضمیر زندہ ہوگا۔ ضمیر مردہ ہو جائے تو انسان کو ہدایت نہیں مل سکتی یا ایمان پیدا نہیں ہو سکتا۔ بعض اوقات ہم کمزور ضمیر کو بھی مردہ کے معنی میں بولتے ہیں اس میں احتیاط کی ضرورت ہے ضمیر زندہ ہو اور انسان تک قرآن یا حضرت محمد ﷺ کا پیغام پہنچ جائے تو اب وہ آدمی ایک امتحان اور عرصۂ محشر کی گھڑی میں ہے۔ دل گواہی دے گا اب اس کو قبول کر لے تو باضمیر اور صاحبِ خودی ہے اور اگر انکار کر دے تو بے ضمیر یا آخری درجے میں مردہ ضمیر ہے۔ محمد ﷺ یا پیغمبروں کی دعوت (یا آج کے قرآن مجید کے پیغام اور دعوت) کو ٹھکرانے والا کسی داعی کا کوئی نقصان نہیں کرتا انبیاء کرام تو صرف اللہ کے پیغام پہنچانے والے ہوتے تھے۔ اسی لیے فارسی کی اصطلاح عام فہم اور معنی خیز ہے یعنی پیغام بر یا پیغمبر۔ ان کے ذمہ لازمی مسلمان کر کے اور گھیر کر لانا نہیں تھا، پیغام پہنچانا تھا۔ حساب لینا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

فَاِنَّمَا عَلَیۡکَ الۡبَلٰغُ وَعَلَیۡنَا الۡحِسَابُ (40:13)

''آپ کا کام (ہمارے احکام) پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے''۔

زندہ خودی والا یا باضمیر انسان اللہ سے ایک خاص تعلق رکھتا ہے

جب انسان کی خودی بیدار ہو یا انسان باضمیر ہو اس کے اندر نیکی بدی کا احساس زندہ ہو تو انسان کا اپنے رب سے ایک گونہ تعلق ہوتا ہے۔ مولانا روم نے اس کیفیت کے لیے فرمایا ہے

اتصالِ بے تکیف بے قیاس

ہست رب الناس را با جانان ناس

اس باطنی کیفیت کو صرف محسوس (FEEL) کیا جا سکتا ہے عقل میں اور بیان سے باہر ہے۔ اسی کیفیت کے لیے علامہ اقبال نے بھی خطبات میں فرمایا ہے کہ

GOD IS A PERCEPT NOT A CONCEPT.

اللہ پر ایمان ایک باطنی احساس (MYSTIC EXPERIENCE) ہے نہ کہ 'تصور خدا' کا نام ہے۔

زندہ خودی ــــ باضمیر انسان کے احساسات

انسان کی خودی زندہ ہو تو اس کے باطنی اور قلبی احساسات کی ایک خاص کیفیت ہوتی ہے، اس کچھ اثرات اس عملی زندگی، رویوں، دوسرے انسان کے ساتھ تعامل (INTERACTION) اور کیفیات سے ظاہر ہوتا ہے۔ انہیں رویوں سے ہی انسان پہچانا جاتا ہے۔ ایک انتہاء پر روشن ضمیر ہوتا ہے تو دوسری انتہاء پر مردہ ضمیر اور بے ضمیر ہوتا ہے۔

خودی کی زندگی کی علامات از روئے قرآن و حدیث حسبِ ذیل ہیں:

1۔ معرفت رب: انسان کا یہ احساس کہ میرا کوئی پیدا کرنے والا ہے۔

2۔ اللہ کی اطاعت کا جذبہ یا محبت الٰہی: اپنے خالق و مالک و رب سے محبت کرنا کہ اس کے احسانات بے پایاں ہیں۔

3۔ انسان کا اپنے اندر نیکی بدی کا احساس رکھنا۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا:

وَ نَفۡسٍ وَّ مَا سَوّٰىهَا O فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا O (91:08-07)

''اور (قسم ہے) نفس انسانی کی اور اس کی جس نے اس کے اعضا کو برابر کیا پھر اس کو بدکاری اور پرہیز گاری کی سمجھ دی''۔

4۔ لباس کا احساس: یہ احساس بھی ضمیر اور خودی سے منسلک ہے۔ بے ضمیر انسان بے لباسی کو ترجیح دیتا ہے یا ضمیر کو موت یا باطن کی موت 'حیا' (باطنی زندگی) کے ختم ہونے کا نام ہے۔ (آج کا مغرب خودی کو گم کر کے بے لباسی میں جہاں کھڑا ہے وہ نا قابل بیان ہے) جانوروں میں اپنے لیے لباس کا احساس ہی نہیں ہے۔

5۔ رشتوں کی تمیز: (محرم اور غیر محرم رشتے) جانوروں میں بھی رشتوں کی کوئی تمیز یا احساس نہیں۔ حقیقی انسان اور صاحب خودی با ضمیر انسان میں رشتوں کی احساس شدید ہوتا ہے مگر ضمیر مردہ ہو جائے یا خودی مر جائے تو پھر انسان جانوروں کی سطح پر گر جاتا ہے اور رشتوں کی حرمت کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اسی خودی کی موت اور بے ضمیری کے باعث آج کا مغرب رشتوں کی تمیز سے عاری جانوروں بلکہ ڈارون کے تصور انسان پر کھڑا ہے امریکہ کے صدر کلنٹن نے 1998ء میں ایک بیان میں کہا تھا کہ 50% سے زیادہ امریکی وہ ہیں جن کو اپنے باپ کی نام معلوم نہیں (اور نہ والدہ اس کو بتا سکتی ہے)۔

اسی خودی کی موت پر نسلوں کے بیت جانے کے بعد اب مغربی معاشرہ VALUELES اور MORALESS بن گیا ہے اسی طرز کے معاشرے کو SECULALR یا LIBERAL معاشرہ کہتے ہیں اور اردو میں (ان بے ضمیروں نے عوام کو دھوکہ دینے کے لیے) لبرل ازم کا ترجمہ روشن خیالی کر کے خود کو ایک جھوٹی تسلی دے رکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان کیفیات سے محفوظ رکھے، آمین۔

پیغامِ اقبال خودی کی بازیافت

ہر معاشرے اور آبادی میں باضمیر بھی ہوتے ہیں تو بے ضمیر اور مردہ ضمیر بھی ہوتے ہیں عام اچھے معاشرے میں باضمیر انسانوں کی تعداد 20 سے 25 فیصد ہوگی جبکہ معاشرہ مغربی ہو جائے اور مغربی تہذیب اور کلچر عام ہو جائے جیسے امریکہ کا کلچر ہے تو باضمیر لوگوں کی تعداد کم ہو کر ایک یا دو فیصد رہ جائے گی اور مردہ ضمیروں کی تعداد ایک دو فیصد سے بڑھ کر 20 سے 25% ہو جائے گی۔

درمیان کے عوام تو مرغِ بادنما ہوتے ہیں۔ نیکی کا غلبہ ہوا ادھر منہ کر لیتے ہیں اور بُرے لوگ غالب ہوں تو وہ بھی ویسے ہی بن جاتے ہیں۔ جیسے کہا جاتا ہے: اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوکِھِمْ (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں)۔ سیّدنا حضرت محمدﷺ کی بعثت سے پہلے جو صورت حال تھی وہ بہت خراب تھی مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جیسا انسان اور عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم جیسے لوگ وہیں سے دریافت ہو گئے۔

اسی پر قیاس کر لیں علامہ اقبال کے دور کا مغرب جو خودی کی معرفت میں زوال پذیر تھا اسی لیے علامہ اقبال نے اس معاشرے کو خودی کو پیغام دیا ہے اور اس کی طرف دعوت دی ہے اور یہی خودی کا مقام ہی انسان کی پہچان ہے اور اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے۔

انسانی خودی ہی دراصل قرآن مجید کے نزدیک انسان کو انسان اور مسجودِ ملائک بناتی ہے اور اسلام کی دعوت کا 'مخاطب' یہی انسانی خودی ہے جس انسان کی خودی 'مر' جائے وہ اب انسان نہیں حیوان ہے اور زندوں میں شمار نہیں ہوگا وہ مردوں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ اسی لیے قرآن پرلے درجے کے کافروں اور اسلام مخالفوں کی (جو اسی حالت میں مر گئے) چلتی پھلتی لاشیں کہتا ہے اور علامہ اقبال نے بھی کہا ہے

ع روح سے تھا زندگی میں بھی تہی جن کا جسد

مرزا منور صاحب ___ ایک نامور اقبال شناس ہیں وہ بالعموم بے ضمیر انسان کی کیفیات کے لیے چوپایہ کے وزن پر دوپایہ اور 'دوپایہ پن' کا لفظ استعمال فرماتے تھے۔

علامہ اقبال کا پیغام مغربی معاشرے کی اسی اقلیت کے لیے تھا اس میں سے ڈاکٹر رینالڈ نکلسن جیسا بندہ تو نکلا جس نے فوراً اس کو قبول کر کے اپنی قوم کے لیے اس پیغام کا ترجمہ کر دیا مگر ___ یہ پیغام کتنوں کی سمجھ میں آیا اور کتنوں نے قبول کیا یہ الگ بات ہے۔

جنوبی ایشیا کے محکوم مسلمانوں کے لیے مستقبل کی آزاد ریاست کی ضرورت

1

آزاد مسلمان ریاست کی تشکیل و تعمیر کا خواب اور علامہ اقبال

آزاد مسلمان ریاست کی تشکیل وتعمیر کا خواب اور علامہ اقبال

جنوبی ایشیا میں مغل بادشاہ اکبر کے مرتد ہونے اور اسلام کو چھوڑ کر نیا دینِ الٰہی ایجاد کرنے سے اسلام کو جو نظریاتی نقصان کا امکان پیدا ہوا کہ ہندو اور برطانوی صہیونی سامراج کے زیرِ اثر سارا جنوبی ایشیا ہی سپین کی طرح اسلام سے خالی ہو جائے گا تو دستِ قدرت نے مجدّدینِ ملّت کا سلسلہ مشرقِ وسطیٰ سے اٹھا کر جنوبی ایشیا میں منتقل کر دیا۔ یہی سلسلۂ حفاظتِ اسلام یا سلسلۂ مجدّدین ہے جو مسلمانانِ ہند میں اسلام کے اِحیاء کی ایک نئی روح پھونک گیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، شیخ عبدالحق محدّثِ دہلوی، شاہ ولی اللہ، تحریک شہیدین، جنگ آزادی، شیخ محمود حسن، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہم جیسے نابغہ عصر لوگ یہیں پیدا ہوئے جن کی ٹکر کا کوئی آدمی باقی عالم اسلام میں نہیں آیا حتیٰ کہ قرآن مجید کی جتنی تفسیریں جنوبی ایشیا میں لکھی گئیں اس کے علاوہ پورے عالم اسلام میں نہیں اتنی نہیں لکھی گئیں۔ یہ اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف ہے کہ اب اسلام کا مستقبل جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔

سلطنتِ مغلیہ کو زوال آیا تو برطانوی سامراج آ گیا اور پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کا نیا نقشہ جو سامنے آیا اس میں سوائے ترکی کے کوئی مسلمان علاقہ آزاد نہیں تھا۔ صہیونی برطانوی سامراج نے ایک خاص ذہن کے ساتھ گذشتہ چند صدیوں اپنے عالمی غلبہ کے لیے سلطنت

عثمانیہ کوختم کرنے کا ٹاسک پورا کرلیا۔ اس غلامی کے دور میں علامہ اقبال نے پہلے شکوہ، شمع و شاعر، جوابِ شکوہ اور پھر طلوعِ اسلام (1923ء) جیسی نظمیں لکھیں کہ مسلمانانِ ہند میں اسلام کے حوالے سے شعور پیدا ہوا۔

یوں تو ہر مسلمان کے ذہن میں اسلام کا شاندار مستقبل انگڑائیاں لینے لگا مگر مسلمان زعماء کو اس میں سنجیدگی سے فکر دامن گیر ہوئی کہ سامراج کے زوال کے بعد مسلمانوں کا کیا بنے گا۔ ہر ذی شعور مسلمان اور تمام مسلمان زعماء اس فکر میں تھے اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ پر خیال آرائی کا آغاز ہوگیا۔ اس سلسلہ میں 'حق بحق دار رسید' کے مصداق، فاطر فطرت نے علامہ اقبال کو وہ فضلیت عطا فرمائی کہ انہوں نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے مستقبل کے لیے ایک سہانا اور واضح خواب دیکھا۔ طلوعِ اسلام نظم میں انھوں نے اس حقیقت کو بیان فرمایا اور یقین واذعان سے اُمت مسلمہ کو یہ چونکا دینے والی خوش خبری سنائی (جب کہ مسلمان غلامی میں جکڑے ہوئے تھے)

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہن ہندی، نطق اعرابی

یہ خواب سچا ثابت ہوا اور اس کی شروعات کا پہلا مرحلہ (PHASE) متشکل ہوکر خطبہ اِلٰہ آباد (1930ء) سے یوم آزادی پاکستان (1947ء) تک، مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے آگیا۔

ا۔ خواب کی تعبیر ___ آزاد ریاست

مسلمانانِ ہند کا مستقبل میں ہندو اکثریت کے امپریلزم سے بچاؤ کے طریقے بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں مسلمان زعماء کی فکرمندی کا سبب بنے ہوئے تھے اور سب مستقبل کے موہوم خاکوں میں استدلال اور شواہد کا رنگ بھرنے میں مصروف تھے۔ علامہ اقبال کا اپنا الگ اور منفرد رنگ تھا۔ ان کا استدلال اور قوتِ متخیّلہ کی جولاں گاہ ان کا مسلمانوں کی تاریخ پر گہری نظر اور حالیہ مغربی سامراج کے دیو استبداد کے پیچھے صہیونی عزائم کی واضح شناخت تھی۔

علامہ اقبال کے فکر کی حقیقی بنیاد قرآن وحدیث کا مطالعہ ہی تھا اور ان کا ذہن الفاظ سے ایسے معانی نکال لاتا تھا جو نتائج دوسرے علماء حالاتِ حاضرہ سے صرف نظر کر کے اخذ نہیں کر سکتے تھے۔ اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے آزاد مسلم ریاست کے قیام کو تقدیر مبرم

(DESTINY) سمجھا تھا۔ ان کے ذہن نے خطبہ الٰہ آباد سے کئی سال قبل ہی مستقبل کے اس واقعہ کو حقیقت کے روپ میں محسوس کیا تھا اور اس نوزائیدہ ریاست کی ضروریات کو فراہم کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ چنانچہ

☆ انہوں نے مدراس میں اپنے مشہور خطبات میں اس مستقبل کی ریاست کے جواز، تشکیل پانے اور استحکام کے لیے مسلمانوں کی عملی مشکلات کو موضوعِ بحث بنایا۔ ایک طرف جدید عالمی علمی اُفق پر اُبھرتے سوالوں کا مدلل جواب دیا پھر اس ریاست کے عملی مسائل کی طرف گہرائی میں جا کر عملی رہنمائی پر بحث کی جو آج بھی تشکیل ریاست و استحکام ریاست کے لیے رہنما کتاب ہے۔

☆ 1929ء میں علی گڑھ تشریف لے گئے وہاں طلبہ سے ایک خطاب میں اپنے اسی مسئلہ کے سلسلے میں طلبہ کے لیے ان کے دل کی خواہش ان الفاظ میں ظاہر ہوئی ـــــ جو قدرت نے امر کر کے انہی سامعین طلبہ کے مقدر میں لکھ دی۔ آپ نے طلبہ سے فرمایا

؎ من بسیمائے غلاماں سر سلطاں دیدہ ام
شعلہ محمود از خاکِ ایاز آید بروں

☆ اسی علی گڑھ کے طلبہ اور جدید تعلیم یافتہ حضرات تھے جنہوں نے مختلف علاقوں میں مسلم لیگ کا جھنڈا اُٹھایا اور پاکستان بننے پر تقریباً 30 سال انتظامی معاملات پر چھائے رہے۔

ب۔ خطبہ الٰہ آباد (1930ء)

قدرت نے اگلے مرحلہ کے لیے ایک انوکھا، ملک گیر اور نہایت اہم فورم انہیں عطا فرما دیا جہاں مستقبل کی اس ریاست کے سچے خواب کا اظہار کر دیا جائے۔

مسلم لیگ 1906ء میں بنی تھی اور آغا خان سوم اس کی کرسی صدارت پر رُبع صدی براجمان رہے۔ پھر سامراج کے دست شفقت اور کسی غیبی اشارے سے ان کو تاجِ برطانیہ کے تحت ایک اہم عہدہ مل گیا۔ مسلم لیگ کی سربراہی کا مسئلہ پیش آیا۔ یہ قرعہ علامہ اقبال کی قسمت میں نکلا اور 1930ء کا سال وہ مسلم کے صدر رہے اور سالانہ اجلاس سے انہوں نے خطاب فرمایا۔ یوں اس خواب کے حقیقت کا روپ دھارنے کی طرف پہلا قدم اُٹھ گیا۔

علامہ اقبال نے ایک حدیث مبارکہ کا حوالہ دے کر مفصل گفتگو فرمائی، حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لیا، مسلم لیگ کا کام اور ذمہ داریاں گنوائیں اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ایک اعلان فرمایا۔

ایک طویل حدیث جو حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور مسند احمد میں موجود ہے، اس حدیث (لسانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیانیہ) میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک آنے والے حالات میں مسلمانوں کو رہنمائی دیتے ہوئے فرمایا کہ مسلمانوں پر یہ پانچ ادوار آنے ہیں:۔ پہلا دور نبوت یعنی جب تک اللہ چاہے گا رسول اللہ حیات رہیں گے دوسرا دور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یہ دور بھی جب تک اللہ چاہے گا دنیا میں جلوہ فگن رہے گا۔ تیسرا دور آہستہ آہستہ مسلمانوں میں حکمرانی ملوکیت میں بدل کر بادشاہ عیاش اور ظالم ہو جائیں گے، کاٹ کھانے والی بادشاہت کا دور (تقریباً بارہ صدیاں)۔ چوتھا دور مسلمان غیر مسلم اقوام کے غلام بن جائیں گے (ملکاً جبریًا) اور پانچواں دور پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور ہونا (جواب عالمی (GLOBAL)) ہوگا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔

علامہ اقبال کے خطبہ الٰہ آباد میں اسی حدیث پاک سے استدلال تھا کہ اب ہم مُلکاً جبریًا ـــــ غلامی کے دور سے گذر رہے ہیں یہ دور یقیناً ختم ہوگا دائمی نہیں ہے (یہ خیال صہیونی برطانوی سامراج کے ذہن کے خلاف تھا) پھر خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا دور دوبارہ آنا ہے۔

اس دورِ خلافت کے لیے مسلمانوں کو آزادی درکار ہے اور اس کے لیے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کی ضرورت ہے جہاں وہ اکثریت میں ہوں اور 'دین' کے احکام نافذ کر سکیں (یہ بات متحدہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کے ساتھ ممکن نہیں تھی)۔ مزید براں تمام فقہی تفاصیل ملکاً عاضًا کے دور میں طے ہوئی ہیں اُن میں حکومتی مفادات بھی در آئے ہیں۔ لہٰذا ملوکیت کے دور میں جو پردے اسلامی عدلِ اجتماعی (SOCIO- PLITCO- ECONOMIC SYSTEM) پر پڑ گئے تھے ان کو ہٹا کر خلافت راشدہ کے دور کا نمونہ دنیا کو دکھانا ہے۔ اگر یہ ملک قائم ہو گیا تو ہمیں یہ سنہری موقع مل جائے گا۔

ان تفاصیل کے ساتھ خطبہ الٰہ آباد سامنے آیا۔ بات چونکہ فرمانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی

ہے لہٰذا یہ بات اٹل ہے کہ شدنی امر ہے۔ یہ تقدیر مبرم ہے۔ عین یہی الفاظ علامہ اقبال نے خطبے میں ارشاد فرمائے۔

ج۔ اسلامی ریاست کا قانون

اسلامی ریاست کا فیصلہ ابھی پردۂ افلاک میں ہے مگر علامہ اقبال کے بقول ان کو اس شعر کا مصداق ؎ حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے

عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں

یقین کامل تھا کہ جلد ہی اس ریاست کا وجود میں آنا مقدر ہے۔ اس خیال سے انہیں احساس تھا کہ اس میں دورِ ملوکیت کی فقہ اور قانون نہیں بلکہ آزاد مسلمان ریاست کے شایانِ شان (عصر حاضر کی اصطلاحات و مسائل کو مدنظر رکھ کر) نئے CODIFIED LAW (نئی تحریر کردہ فقہ) کی ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو اس کام کا اہل سمجھ کر کئی اقدامات کیے جو نہایت اہم ہیں۔

اس مسئلہ کی اہمیت کی بحث کی تفاصیل جناب اسعد گیلانی صاحب کی کتاب ''اقبال، دارالاسلام اور مودودی'' کے باب پنجم میں سے چند صفحات یہاں درج کیے دیتے ہیں تاکہ موضوع گفتگو واضح ہو سکے۔

د۔ اقبال اور تدوین جدید فقہ اسلامی

اقبال کے افکار کی دنیا میں سفر کرتے ہوئے فکری تحقیق کا مسافر جب اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ جدید فقہ کی ترتیب اور تدوین کے لیے سخت مضطرب تھے اور اس کام کو سرانجام دینے کی خاطر مسلسل اور پیہم فراہمیٔ اسباب کے لیے کوشاں رہے تو جہاں ان کے اخلاص اور تجدید و احیائے دین کے عمل صالح کے بارے میں مکمل اطمینان حاصل ہوتا ہے، وہاں یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی نظامِ حیات جس کے لیے وہ ساری عمر تڑپتے رہے اور نفاذِ کتاب و سنت جو ان کی زندگی کا ماحصل تھا، اس کی ترتیبِ نفاذ اور تدبیرِ کار میں ان کے ہاں کوئی فکری خلا ضرور موجود تھا۔

علامہ کی نظر میں سب سے ضروری کام رسول اکرم ﷺ کی سنت کا اِحیاء اور اسلامی قوانین کا نفاذ تھا، اس کام کے لیے ان کے نزدیک ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ تین سو سال کے ارتقائی

عمل کے خلا کو پُر کرنے کے لیے ایک مجلس قانون ساز بیٹھے اور اپنی فکری کاوشوں سے اس خلا کو پُر کردے۔ وہ مجلس ایک جدید ریاست کی جدید ضروریات کے مطابق قانونِ اسلامی کو مرتب و مدوّن کرے اور موجودہ حالات میں اسے عدالتوں میں نفاذ کے قابل بنانے کے لیے دفعہ وار (CODIFY) ترتیب دے۔ بہرحال جو اسکیم بھی ان کے ذہن میں رہی ہو، اس میں شک نہیں کہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے ان کے ذوق وشوق کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ بعض اوقات وہ اس سمت میں کوشش کرتے ہوئے تنکوں تک کا سہارا لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اور یہی ان کے اخلاصِ عمل کی بہترین دلیل بن گئی ہے۔ انھوں نے فرمایا:

''موجودہ دور میں اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی تدوین جدید ہے، تاکہ زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا جائے، جن کو موجودہ قومی اور بین الاقوامی، سیاسی، معاشی اور سماجی ارتقاء نے پیدا کیا ہے۔''

انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت............ میں یہ تجویز پیش کی۔

''میری تجویز ہے کہ علماء کی ایک جماعت قائم کی جائے جس میں ایسے مسلمان قانون دان بھی شامل ہوں، جنھوں نے جدید علم قانون کی تعلیم حاصل کی ہو۔ مقصد یہ ہے کہ جدید حالات کی روشنی میں اسلام کے قانون کی حفاظت کی جائے۔ اس کو پھیلا دیا جائے اور بہ شرطِ ضرورت اس کی ازسرِنو تشریح کی جائے اس طرح سے کہ اس کے بنیادی اصولوں کی تہہ میں جو روح کارفرما ہے وہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے''۔

............وہ مولانا سیّد سلیمان ندوی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:

''یہ میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نظر سے زمانۂ حال کے اصولِ قانون (JURISPRUDENCE) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت ثابت کردے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم وہی شخص ہوگا۔ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری ناقص رائے میں مذہب اسلام گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جارہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس

سے پہلے کبھی نہیں آیا۔''

مولانا سیّد سلیمان ندوی کے نام اس نوعیت کے مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبالؒ حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر اسلام کے مستقبل کے بارے میں کتنے فکر مند تھے اور جدید سائنسی علوم جس نوعیت کا چیلنج اسلام کے سامنے رکھ رہے تھے اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے ان میں کس قدر اضطراب پایا جاتا تھا۔ انہوں نے خود بھی فکر ونظر اور فلسفہ وکلام کے میدان میں اس چیلنج کا مؤثر جواب دیا لیکن قانون کے میدان میں اسلامی قانون کے اصولوں کی برتری ثابت کرنے کے لیے وہ ایک پوری مجلس کی ضرورت محسوس کرتے تھے جو اسلامی قانون کو دورِ حاضر کی تمام ضروریات پوری کرنے کے قابل بنا دے اور اسلام کے قانونِ انصاف میں دورِ حاضر کے ہر مسئلے کا حل موجود ہو۔ انہی ضرویاریاتِ دورِحاضر کو سامنے رکھ کر وہ زندگی کے ہر میدان میں اسلام کو زمانے کے چیلنج کا بہترین جواب ثابت کرنا چاہتے تھے جس میں قانون کا شعبہ بھی شامل تھا۔ چونکہ ان کی چشمِ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ مغربی تہذیب کی کوکھ سے نظریات کے جتنے فتنوں نے جنم لیا تھا وہ فطرتِ انسانی اور عقلِ انسانی سے ٹکرا ٹکرا کرنا کام ثابت ہوتے جا رہے تھے اور اب زمانے کو کسی ایسے ہی نظام کی تلاش تھی جیسا نظام خود اسلام تھا۔ انہوں نے سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھا:

> ''اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ حالات میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔ ندوۃ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلباء کو بھی اپنے ساتھ ملا لیجیے تاکہ اقوامِ اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی حقیقت معلوم ہو''۔

انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے لیے ایک تعلیمی اسکیم پیش کرتے ہوئے تدوین فقہ جدید کی ضرورت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ''ہمیں دیو بند اور لکھنؤ سے ایسے ذہین اور طباع لوگ منتخب کرنے چاہئیں جو قانون کا خاص ذوق رکھتے ہوں۔ چونکہ قانونِ محمدیؐ سراسر تعمیری تشکیل کا محتاج ہے،

ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں اصولِ فقہ وقانون سازی کے اصولوں کی تعلیم دیں، اور شاید اقتصادیات اور اجتماعیات کی جامع تعلیم دینے کی بھی ضرورت پیش آئے۔ اگر آپ چاہیں تو ان کو ایل ایل بی بنائیں اور پھر ان سے کہا جائے کہ سیاسی نظریۂ اسلامی اور اسلامی فقہ کا ارتقاء وغیرہ مضامین کے لیکچروں میں شریک ہوں۔ بعض کو وکالت کا پیشہ اختیار کرنے کی بھی اجازت دی جائے۔ کچھ اپنے آپ کو قانونی ریسرچ کے لیے وقف کر دیں۔ اس ملک میں قانونِ محمدی جس طریق سے عمل میں لایا جاتا ہے وہ نہایت تاسف انگیز ہے اور بعض دشواریاں ایسی ہیں جو صرف مجلسِ قانون سازی کے قیام سے ہی دور ہو سکتی ہیں''۔

1933ء میں اپنے ایک خطبۂ صدارت میں انہوں نے فرمایا:

''میں علماء کی اسمبلی کے قیام کا مشورہ دوں گا جس میں مسلمان وکلاء بھی شامل ہوں، جو فقہ سے واقف ہوں۔ اس کا مقصد اسلام کی حفاظت اور تجدید ہے۔ اس طور پر کہ بنیادی اصولوں کی روح قائم رہے۔ اس جماعت کو دستوری سند حاصل ہو تا کہ کوئی قانون جو مسلمانوں کے پرسنل لاء پر اثر انداز ہوتا ہو، اس اسمبلی کی منظوری کے بغیر قانون نہ بن سکے۔ اس تجویز کے محض عملی فائدے کے علاوہ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ زمانۂ حاضر کو ابھی اسلام کے قانونی ادب کی بیش بہا قیمت کا اندازہ نہیں ہے۔ خصوصاً سرمایہ دارانہ ذہنیت کی دنیا کے لیے جہاں اخلاقی اقدار اقتصادی مسائل سے الگ کی جا چکی ہیں اس قسم کی اسمبلی کا قیام اسلامی اصول سمجھنے کے لیے بہت مدد دے گا''۔

☆ خطباتِ مدراس میں بھی انہوں نے اس کا تذکرہ کیا:

''انفرادی اجتہاد کے مقابلے میں شورائی اجتہاد زیادہ بہتر ہے۔ دورِ حاضر میں اجتماع کی یہی شکل سب سے زیادہ موزوں ہوگی۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم اپنے نظامِ قانون کو جمود اور تعطل سے نجات دلا کر اس میں زندگی کا نیا خون دوڑا سکتے ہیں''۔

جہاں وہ اجتہاد کے حامی تھے اور اسے اجتماعی بحث وتمحیص سے سرانجام دے کر قانونِ اسلامی کے چشمہ صافی کو جاری رکھنا چاہتے تھے وہاں وہ اس تجدد پسندی کے سخت مخالف بھی تھے جو اسلامی تصورات کو جڑ سے ہٹا کر ان میں مغربی افکار وضروریات کو پیوست کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ چنانچہ اس کام کی اہمیت کے ایک دوسرے پہلو کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

''اگر اہم اسلامی فکر میں کوئی صحت منداضافہ نہیں کرسکتے تو کم سے کم صحت مند تنقید سے عالمِ اسلامی میں امنڈتے ہوئے تجدد پسندی کے سیلاب کو ضرور روک سکتے ہیں''۔

علامہ کی تدوین فقہ جدید کے بارے میں ذاتی کوششوں کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے افراد کو فرداً فرداً بھی توجہ دلائی اور جن سے توقع تھی کہ ہاتھ بٹاسکیں گے انہیں اپنے پاس لاہور آکر ٹھہرنے اور اس عظیم کام میں شرکت اور تعاون کے لیے بھی لکھا۔ چنانچہ ڈاکٹر سیّد عبدالطیف لکھتے ہیں:

''علامہ نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں ایک معتدبہ مدت کے لیے لاہور میں سکونت اختیار کروں تاکہ ایک طرف اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے ان کی کچھ خدمت کرسکوں اور دوسری طرف ان کے ایک منصوبے میں ان کی مدد کرسکوں۔ وہ منصوبہ یہ تھا کہ......

انہوں نے اسلامی اصولِ فقہ کی تجدید کے مسئلہ پر اپنی فکر کے نتائج کو نوٹس کی شکل میں قلمبند کیا تھا۔ یہ نوٹس انگریزی میں تھے لیکن وہ محسوس کررہے تھے کہ اپنی گرتی ہوئی صحت کے زمانے میں ان نوٹس کی ترتیب وتہذیب اور انہیں قطعی شکل دینا اور شائع کرنا ان کے لیے دقت سے خالی نہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاؤں''۔

غرض علامہ اقبالؒ مسلمانوں کے علوم میں ازسرِنو تحقیق وریسرچ خصوصاً فقہ کی ترتیب و تدوین کے بارے میں بے حد فکرمند تھے اور جہاں جہاں انہیں اس کا امکان نظر آتا تھا کہ وہاں یہ کام کسی نہ کسی درجے میں کیا جاسکتا تھا، اس طرف وہ انتہائی توجہ فرماتے تھے۔ انہیں دنوں

پٹھانکوٹ ضلع گورداسپور سے ایک مخیّر مسلمان زمیندار علامہ اقبالؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جن کے ہمراہ مشہور نومسلم فاضل علامہ محمد اسد بھی تھے۔ یہ مخیّر مسلمان چوہدری نیاز علی خان تھے جنہوں نے پٹھانکوٹ کے قریب نہر کے کنارے ایک سرسبز اور پرفضا دیہی علاقے میں ایک وقف قائم کیا تھا جس کا مقصد خدمتِ اسلام تھا اور اب وہ علامہ اقبالؒ سے اس کی سرپرستی، اس کے مقاصد کا تعین اور اس کے بہترین مصرف کا طریقہ معلوم کرنا چاہتے تھے۔ وہاں انہوں نے وقف زمین پر اپنے ادارے کے لیے چند عمارات بھی بنانی شروع کردی تھیں۔ وقف، اس کے مصرف اور چوہدری نیاز علی خاں کے جذبۂ خدمتِ دین کو دیکھ کر علامہ اقبالؒ کے دل میں اپنے تدوین فقہ جدید کے منصوبے کے لیے سروسامان پیدا ہوتا ہوا دکھائی دیا۔ چنانچہ انہوں نے چوہدری صاحب کو متعدد مشورے دیے۔ اصل مسئلہ ادارے کے لیے ایک ایسے شیخ کی فراہمی تھی جو تعلیم و تربیت اور تصنیف و تالیف کی پوری اسکیم کی نگرانی کرے، اور ایک طرف علم و فضل کی قوت سے دورِ حاضر کے مسائل کا جواب دے اور دوسری طرف ایسے افراد تیار کرے جو عالمِ اسلام میں فکری اور عملی انقلاب لانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

پھر اسی سلسلہ میں علامہ اقبالؒ نے ایک خط جامعہ ازہر مصر کے اس وقت کے شیخ علامہ مصطفیٰ المراغی کے نام لکھا جس میں انہوں نے چوہدری صاحب کے ادارے کا تعارف کروا کر اس کے لیے اعلیٰ علم و کردار والے عالم و فاضل اساتذہ فراہم کرنے میں تعاون کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

لیکن شیخ ازہر علامہ المراغی کی طرف سے نفی میں جواب آیا۔ ان کے پاس ایسی صلاحیت کا کوئی آدمی موجود نہ ہو۔ علامہ اقبالؒ نے چوہدری صاحب کو اس جواب سے آگاہ کر دیا۔ پھر انہوں نے چوہدری نیاز علی خان کو جو خط لکھا اس میں ملکی حالات کے پیشِ نظر مسلمانوں کی پس ماندگی کو دیکھتے ہوئے ان کے دلی اضطراب اور قلبی پریشان کا واضح نقشہ موجود تھا۔ علامہ نے لکھا:

> ''آپ تشریف لائیے، میں آپ سے ادارہ کے متعلق گفتگو کروں گا۔ اسلام کے لیے اس میں نازک زمانہ آرہا ہے۔ جن لوگوں کو کچھ احساس ہے ان کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش اس ملک میں کریں۔ ان شاء اللہ آپ کا ادارہ بہ احسنِ وجوہ اس مقصد کو پورا کرے گا۔ علماء میں مداہنت آ گئی ہے، یہ گروہ حق کہنے

سے گریز کرتا ہے اور ڈرتا بھی ہے۔ صوفیاء اسلام سے بے پروا اور حکام کے تصرف میں ہیں۔ اخبار نویسی اور آج کل کے تعلیم یافتہ لیڈر خود غرض ہیں اور ذاتی منفعت و عزت کے سوا کوئی مقصد ان کی زندگی کا نہیں ہے۔ عوام میں جذبہ موجود ہے مگر ان کا کوئی بے غرض رہنما نہیں ہے''۔

چوہدری نیاز علی خان نے اپنے ادارے کا تعارف، اس کے مقاصد اور اس کے لیے مولانا مودودی صاحب جیسے صاحبِ علم شخص کی ضرورت کے بارے میں مولانا مودودی صاحب سے جو مراسلت کی وہ پوری مراسلت آئندہ باب میں درج کی جارہی ہے۔ اسی مراسلت کے نتیجے میں علامہ اقبالؒ اور چوہدری نیاز علی خان کے اصرار پر مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی حیدر آباد دکن سے دارالاسلام پٹھانکوٹ میں منتقل ہوئے تاکہ اس ادارے کو ان خطوط پر چلا سکیں جو ان تینوں حضرات کے درمیان متفقہ طور پر طے پا گئے تھے۔ (اقبال، دارُالاسلام اور مودودی۔ از اسعد گیلانی)

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ O

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِO

نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں۔

تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے

(61-60:55)

2

علامہ اقبال کے ذہن کی اسلامی سلطنت (BRAIN CHILD) کا تقدیرِ مُبرَم ہونا اور اس کے لیے CODIFIED LAW کی ضرورت کا احساس

علامہ اقبال کے ذہن کی اسلامی سلطنت (BRAIN CHILD) کا تقدیرِ مُبرم ہونا اور اس کے لیے CODIFIED LAW کی ضرورت کا احساس

جناب اسعد گیلانی صاحب کی کتاب کا جو حوالہ اوپر دیا گیا ہے اور جس کے آخری مرحلہ پر جناب مولانا مودودی نے حیدرآباد دکن سے پنجاب ہجرت فرمائی اور پٹھانکوٹ (دارالاسلام) پہنچے اس ہجرت اور شدرحال کے پس پردہ ساری کہانی قارئین کے سامنے آ گئی۔ علامہ اقبال کی خواہش کے باوجود یہ کام نہ ہوسکا۔مَا شَآءَ اللّٰہُ کَانَ وَ مَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ (اللہ تعالیٰ نے جو چاہا وہ ہوگیا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا)۔ ہمارے نزدیک اس مرحلہ پر عصرِ حاضر کے مطابق قانون کی تدوین کی ضرورت ختم نہیں ہوگئی تھی شاید پاکستان کے آج کے حالات اسی 'کوتاہی' کی سزا ہے اور نا معلوم یہ سزا کب تک جاری رہے گی۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ لکھنا ضروری ہے اور وہ درج ذیل ہے:

قائداعظم 3/جون 1947ء اعلانِ تقسیم ہند فرما کر دہلی میں ہی مقیم رہے اور تقسیم ہند کے قانونی معاملات کی نگرانی کرتے رہے۔ 11/اگست 47ء وہ کراچی پہنچے تاکہ 14/اگست کی اہم تقریبات کا انتظام کیا جاسکے۔کئی اجلاس ہوئے اس میں 1946ء کی مرکزی اسمبلی کے مسلمان ارکان جو پاکستان میں تھے ان سے بھی مشاورت ہوئی گورنر جنرل کا عہدہ اور وزیراعظم کے عہدے کے لیے فیصلے کیے گئے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خواہش تھی کہ پاکستان اور بھارت اس کو گورنر جنرل بنادیں تاکہ (ان کے بقول) تقسیم کا کام بحُسن وخوبی سرانجام پائے، مگر قائداعظم نے اس اقدام کو اعلانِ

آزادی کے خلاف سمجھا۔ البتہ بھارت نے یہ مشورہ قبول کرلیا۔ ان تین دنوں میں کئی اہم فیصلے بھی کیے گئے۔ مثلاً ایک اجلاس اس بارے میں ہوا اور یہ بات ایک تذکرے میں پڑھی بھی ہے اور سیّد قاسم محمود صاحب نے مجھ سے خود بھی بیان فرمائی تھی کہ ایک اجلاس میں مشورہ ہو رہا تھا کہ پاکستان کا قانون کیا ہوگا جو 14 راگست 47ء سے لاگو ہوجائے گا۔ کچھ دوست یہ بات شاید پہلے محسوس نہیں کر سکے اور نہ اب محسوس کرتے ہیں کہ ایک ضلع اور تحصیل کی سطح پر کسی سول جج اور مجسٹریٹ کو قرآن مجید اور صحاحِ ستہ کی کتب کا سیٹ دے کر یہ کہہ دیا جائے کہ جو مرضی فیصلہ کرلو تم آزاد ہو، نہ 1947ء میں ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے۔ عدلیہ میں نچلی سطح پر تو CODIFIED LAW کی ملکی ضرورت تھی اور آج بھی ہے۔

'قرآن وسنت' کے مطابق قانون کا ہونا اصولی بات ہے اور اس کے تحت نافذ شدہ قانون (جو علامہ اقبال مرتب کرنا چاہتے تھے اور آج بھی ضرورت ہے) کو قرآن وسنت کے مطابق ڈھالنا (TO ISLAMISE) ایک دیگر شئے ہے۔ اس اہم اور بنیادی کام کے لیے سپریم کورٹ کا ایک شریعت بنچ تشکیل پا جائے جہاں علماء حق بلاامتیاز مشرب ومسلک آ کر قرآن و حدیث سے دلائل دیں اور کسی جاری قانون کی کسی شق یا کل کو خلافِ قرآن وسنت ثابت کر کے تبدیل کرنے کا کام اسمبلی کے سپرد کرنا، معقول مہلت دینا تا کہ قانون سازی ہو سکے اور پھر اس کما حقہٗ نفاذ ہو سکے۔

یہی طریقہ ممکنہ طریقہ ہے۔ کاش علامہ اقبال کی خواہش پوری ہوجاتی اور تدوین فقہ ہوجاتی چاہے چند آدمیوں کے ہاتھوں اور وہ نافذ ہوجاتی تو آج کی صورت حال سے لاکھوں گنا بہتر ہوتی کہ اس میں شریعت اپلیٹ بنچ کے ذریعے علماء حق ترمیمات واضافہ تجویز کرتے اور وہ قانون بن جاتا۔ آج بھی اسی چیز کی پاکستان کے ماحول میں ضرورت ہے۔

14 راگست 47ء تک جو علماء اسلام تقسیم کے خلاف تھے، اُن سے نہ توقع تھی نہ گلہ، کہ تدوین فقہ کیوں نہ ہو پائی، لیکن وہ اکابر علماء جو قائداعظم کے دائیں بائیں تھے، نہ اس بات کو پہلے سمجھ سکے اور نہ آج سمجھ رہے ہیں کہ تدوین فقہ کی کتنی ضرورت ہے اور کتنی اہمیت ہے۔ 14 راگست سے قبل اگر قائداعظم سے مل کر پاکستان میں 80% سے زیادہ اکثریت کی فقہ نافذ کر دی جاتی اور

اس کے لیے شریعت اپلیٹ بنچ منظور کرالیا جاتا تو آج پورا قانونی ڈھانچہ قرآن وسنت کے مطابق ہوجاتا۔ جمہوری دور میں جمہوریت کے تحت کام کرنے والے لوگ اور جماعتیں اپنے ہی ملک میں ملک کی 80% سے زیادہ اکثریت کو اپنا قانون نافذ کرنے کی اجازت نہیں دے رہی ہیں اور نہ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔ یہ کون سی جمہوریت ہے۔ جبکہ سب فراخدلانہ طور پر اس بات پر آمادہ ہیں کہ اکابر علماء اسلام ایک فورم پر بحث کر کے جس قانون کو قرآن وسنت کے خلاف سمجھیں اس میں ترامیم واضافے منظور کر کے قانون ساز اسمبلی کو دے دیں تو وہ قانون بن سکتا ہے۔ ملک میں قومی سطح پر چند سیٹیں حاصل کرنے والی جماعتیں اکثریتی مسلک کی فقہ کو قبول کرنے کو تیار نہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار۔ فیاحسرتا!

ہوا یوں کہ کافی بحث کے بعد جب شرکاء مجلس کو اگلے دن 14 راگست 1947ء کو ملک میں نفاذ کے لیے کوئی قابل عمل صورت حال نظر نہیں آئی تو روایت یہ ہے کہ قائداعظم نے برطانوی حکومت کا رائج قانون منگایا اور INDIAN CIVIL CODE AND CRIMINAL CODE کی کتابوں پر قلم سے INDIAN کاٹ کر PAKISTAN لکھ دیا اور وہ قانون ملک میں نافذ ہوگیا اور آج تک نافذ ہے۔

بعد میں قرارداد کی منظوری کے وقت بھی جناب لیاقت علی خان وزیراعظم پاکستان یہی کہتے رہے کہ علماء متفقہ قانون لا دیں ہم نافذ کر دیتے ہیں۔ اگر اس وقت کے علماء جمہوری ذہن کے ساتھ (جیسے ایران میں اکثریت کی فقہ نافذ ہے اور سنی اقلیت کو اپنی فقہ کے مطابق PERSONAL LAW میں عمل کرنے کی اجازت ہے) پاکستان میں حنفی فقہ نافذ کر کے اس میں ترامیم منظوری کا طریقۂ کار کا بل پاس کرا لیتے تو ملک میں کم از کم انگریزی قانون کی لعنت موجود نہ ہوتی۔ فقہ حنفی سے لاکھ اختلاف ہو اسلام سے باہر تو نہیں۔ اس وقت کے اکابر کا رویہ کسی سازش کی وجہ سے نہیں تو کوتاہ نظری ضرور ہے۔ (واللہ اعلم)۔

حصّہ چہارم

علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے حالاتِ زندگی اور کام

1
ہم عصروں
کی
نظروں میں

نوائے شاعرِ فردا

ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ

(سابق وائس چانسلر، پنجاب یونیورسٹی)

(از مجلّہ اسلامی تعلیم نومبر، دسمبر 1973ء)

افکار کی گردش میں یہ اہم اصول ہے کہ اس میں توانا تصوّرات، حکیم کے اپنے عصر کے بعد بھی دیکھے اور پرکھے جاتے ہیں۔ یہ دیکھا جاتا ہے کہ فکر کی اگلی منزل میں نئے حکماء اپنی پیش قدمی میں اپنے پیشرو سے کتنا آگے بڑھے، پرانے فکر کا کتنا حصہ جوں کا توں رہا اور نئے تصورات و افکار میں نسلِ انسانی کے اجتماعی شعور کی دریافت اور ترقی کے لحاظ سے، کیا ان کا پیش رو اب بھی فکراً ان کا پیش رو ہے اور یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ نیا عصر اس پیش رو سے کن معنوں میں مختلف ہے؟

افسوس ہے کہ ابھی فکرِ اقبال کے معاملے میں دریافت کی اس منزل کی طرف زیادہ توجہ نہیں ہوئی یعنی ہم اقبال کو 1938ء تک کے افکار کے حوالے ہی سے پڑھ رہے ہیں اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ہم نے اب اس اقبال کو پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ یارانِ شہر نے انہیں محض غزل خواں قرار دے لیا ہے۔ ع مرا یاراں غزل خوانے شمردند۔ اور بحث صرف یہ رہ گئی ہے کہ اس نے غزل اچھی لکھی ہے یا نظم؟ وہ رجعت پسند تھا یا ترقی پسند، وہ مغرب سے متأثر تھا یا مشرق سے؟ وغیرہ وغیرہ۔ حالانکہ اقبال نے خود فرمایا تھا کہ میرا کلام نوائے شاعرِ فردا ہے اور شاعرِ فردا وہ ہوتا ہے جو آئندہ کے افکار کی بھی سمت نمائی کرتا ہے۔ اقبال کے یہاں یہ سمت نمائی موجود ہے مگر ہم متوجہ نہیں۔

اس فقدانِ مطالعہ یا نقصانِ مطالعہ کا ایک سبب میری نظر میں یہ ہے کہ ہم اقبال کو صرف مفکرِ پاکستان کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اس مفکرِ پاکستان کی کچھ غایت بھی تھی، چونکہ پاکستان اسلام کے مقاصد کے لیے تعمیر ہوا تھا، پس فکرِ اقبال میں اسلام کے مقاصد و غایات کی جستجو لازمی تھی۔ صرف وہ اسلام نہیں جو عبادات یا انفرادی تزکیہ نفس تک محدود رہے بلکہ وہ اسلام جو کل اجتماعِ انسانی کے مستقل مصالح و مقاصد کے حل بھی پیش کرتا ہے اور ہمیشہ پیش کرتا رہے گا۔

فکر اقبال کی توسیعی تنقید بھی ممنوع ہوئی اور جتنی ہوئی وہ غلط ہاتھوں میں چلی گئی، اس لیے اقبال سے متعلق توسیعی فکر کی تحریک تقریباً بند ہوگئی۔ تعجب ہے کہ جس قوم نے امام غزالی کی تھافتہ الفلاسفہ کے بعد ابن رشد کی تھافتہ التھافہ کو برداشت کیا وہ اقبال کے بارے میں توسیعی مطالعہ کی تحریک کو گوارا نہ کرسکی۔

اقبال کی وفات 1938ء میں ہوئی۔ ان کے بعد مغرب کی علمی تحریک بہت آگے بڑھی اور انسانی معاشرے پر نئے نقوش ثبت ہوگئے۔ انقلاب آفرین خیالات نے ہزاروں مسئلے اور ہزاروں سوال پیدا کیے، جن کے ہزاروں جواب اور ہزاروں توضیحیں ہوئیں اور اب وہ خیالات مغرب کے علاوہ مشرق کو بھی متاثر کر رہے ہیں اور عالم اسلام پر تو ان کا اثر اتنا گہرا ہوا ہے کہ ان سے بے اعتنائی خودکشی کے برابر ہوگی۔

یورپ کے چند ہمہ گیر افکار اور توانا اثرات علامہ کی زندگی ہی میں اپنا نقش بٹھا چکے تھے جن پر حضرت علامہ نے تنقید بھی کی لیکن بعض تحریکیں جو اس وقت اپنی ابتدائی منزلوں میں تھیں 1938ء کے بعد ان کا دھارا اور تیز ہوگیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان تحریکات و نظریات کی روشنی میں اقبال کا مطالعہ از سر نو کیا جائے۔ مثلاً نظریہ اضافیت کی آئن سٹائنی تعبیر بھی نئے رُخ اختیار کر چکی ہے۔ اور اب نظریہ اضافیت (خصوصی) سامنے آرہا ہے۔ اس نئے فکر کے اثرات کا معائنہ کرنا چاہیے، خلا کی تسخیر نے عقائد کی نئی صورتیں ہمارے سامنے رکھ دی ہیں، ان کا بھی تجزیہ ہونا چاہیے۔ عمرانِ بشری کے پرائے فلسفے اب فرسودہ ہوتے جا رہے ہیں اور سورکن (SOROKIN) اور دوسرے حکماء نے

اجتماع کے تصورات میں انسانی جبلتِ رفاقت پر زور دینا شروع کر دیا ہے۔ مغربی معاشروں میں اخلاقی نراجیت (انارکی) نے ہپی ازم اور ٹیڈی ازم کو رواج دیا، اس کے اسباب پر اقبال کی حکمت سے رہنمائی حاصل کی جائے۔ اس کے برعکس مغرب میں ایک خوشگوار اخلاقی انقلاب کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ ڈارون کے نظریۂ کار کی حیاتیاتی تغیر پر مبنی قوتوں کے لیے اخلاق کے برعکس یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ انواع کے معاملے میں طاقتور اور کمزور کی بحث نے انسانی معاشرے کو غلط راہوں پر چلایا ہے۔ نئی اخلاقیات یہ کہتی ہے کہ نظریہ ڈارون کی یہ تعبیر غلط مشاہدے کا نتیجہ تھی۔ مثلاً ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ فضائے آسمانی میں جہاں طاقتور پرندے اڑتے پھرتے ہیں وہاں ہزاروں کمزور پرندے بھی آزادی سے اڑ پھر رہے ہیں۔ جنہیں قدرت نے پورا تحفظ دے رکھا ہے۔ اسی طرح زمین پر اور سمندر کی تہہ میں، تو گویا نظام قدرت کے بارے میں خدا کی حکمت و رحمت کی تعبیر کی ازسرِنو ضرورت ہے وہ تعبیر عقیدۂ ربّ العالمین اور تصورِ رحمت للعالمین کی روشنی میں کی جائے۔

سارتر اور رسل کی لادینی اور بے یقینی کے خلاف شدید ردِعمل پایا جاتا ہے اور فرائڈ ینگ اور اڈلر کے خیالات کے بارے میں قبول عام کے باوجود شدید تشکیک پیدا ہو چلی ہے۔ اس ردِعمل کو انسانی وجدان کی فتح سمجھ کر ہدایتِ ربانی کی دعوت کیوں عام نہ کی جائے، جس نے ایمان ویقین کو کل زندگی کی اساس قرار دیا تھا۔ انسانی معاشرے کی تنظیم میں حیاتیاتی نظریوں نے جو خلل پیدا کر دیا تھا اس سے نسل اور زبان اور رنگ کے حوالے سے مکروہ نیشنلزم پیدا ہوا اور اس کے سامنے سوشلزم اور کمیونزم بھی بے بس ہو گیا، یہاں تک کہ روس اور چین دونوں اشترا کی ملک قوم پرست پہلے ہیں اور آفاقی بعد میں۔ تو اس پر دنیا حیرت زدہ ہے کہ عالمگیر انسانیت کے مدعی خود اپنی محدود نیشنلزم میں کس طرح سمٹ آئیں ہیں۔ اور خوئے پلنگی کیونکر انسانیت پر غالب آ رہی ہے۔ پھر کیا اس قلب ماہیت اور ماہیت قلب کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں؟ مغرب کی بے لگام آزادی نے بزرگ اور خورد کا فرق مٹا دیا ہے۔ اب خود بڑی دریدہ وذہنی سے بزرگوں کے سامنے (GENERATION GAP) کی باتیں کرتا ہے۔ اور شماریات کے حوالے سے خاندانی زندگیاں جس طرح خلل پذیر ہو رہی ہیں ان کا حال سب پر روشن ہے مگر اب مغرب کے بہت

سے مفکر اسے شیطانی قوتوں کی ریشہ دوانی خیال کرنے لگے ہیں۔تو کیا ہمیں ان کی اس رجعت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔

اقبال نے ہمارے سامنے 1938ء تک کے زمانے کی ایک شرح پیش کر کے اس ابدی دستور کے معارف روشن کیے تھے،جس کا نام اسلام ہے۔کیا اب یہ صورت واضح نہیں کہ اقبال کے افکار کو 1938ء کے انکشافات کے حوالے سے پھر پڑھا جائے؛اور اس طرح حاشیہ خیالی بر شرح ملا عبدالحکیم کے مانند ایک اور حاشیہ خیالی بر شرح حکیم الامت نوجوان تر نسل کے لیے علمی انداز میں مرتب کیا جائے۔اس طرح اقبال کی روح، زیبا تر اور جدید تر پیکر میں متشکل ہوگی اور یہ ثابت ہو سکے گا کہ قرآنی واسلامی حکمت کے مکتب کا یہ دانش یافتہ ......اقبال......ان راہوں کی نشاندہی بھی کر گیا ہے جن تک مغرب کے حکماء اب پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔بہر حال آگے کی منزل کے کسی مسافر کا انتظار ہے جو شاعرِ فردا کی نوا کو نئے حوالوں کی مدد سے سمجھ کر اوروں کو بھی سمجھا سکے۔میرا ذاتی خیال ہے کہ گزشتہ چالیس پچاس سال اسلامی عقیدوں کی فتح کے سال تھے۔لہٰذا حکمت کے اس دور کو فکر کی مدد سے پڑھنا نہایت مفید ہوگا۔

---

2 جس کی آوازوں سے لذت گیر اب تک گوش ہے

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کی تحریروں سے چند اقتباسات

چودھری مظفر حسین

(مجلّہ اسلامی تعلیم نومبر، دسمبر 1973ء)

محبت ___ روح اسلام

اگر پوچھا جائے کہ ان لاتعداد انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا ماحصل یا نچوڑ کیا ہے؟ تو ہم ایک لفظ میں یوں بیان کرسکتے ہیں کہ ''محبت''۔ اسلام محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسی محبت کی تعلیم جو خالص، بے لاگ اور بے غرض ہو، جو دائمی اور لازوال ہو، جو اپنے کمال کی طرف ہمیشہ بڑھتی رہے اور جس میں کمی یا مایوسی کا قطعاً کوئی امکان موجود نہ ہو۔ (روحِ اسلام)

اسلام تاریخ اور انبیاء

انسان اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ محبت کے لیے بے قرار ہے، تڑپ رہا ہے، ہر آن اور ہر لمحہ محبت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اُس نے اپنی ساری زندگی اسی تلاش کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ وہ اس کی تلاش میں ٹھوکریں کھاتا ہے، بڑی ہلاکت خیز مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے، جان پر کھیل جاتا ہے، لیکن اس کی تلاش نہیں چھوڑتا، کیونکہ چھوڑ ہی نہیں سکتا۔ اس کی محبت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک ایسے محبوب کی تلاش کرے جو اس کی فطرت کے تقاضائے محبت کو تمام وکمال پورا کرسکے، جسے وہ دل وجان سے چاہے، الفت کرے۔ پہلے انسان سے لے کر آج تک نوعِ بشر کی ساری تاریخ اسی محبوب کی تلاش کی ایک طویل داستان ہے۔ جس کے اکثر باب خونچکاں اور دلفگار

ہیں لیکن بعض بعض دل افروز اور دل نواز بھی ہیں۔ خدا کے انبیاء اس لیے آئے تا کہ انسان کو بتائیں کہ وہ جس محبوب کو چاہتا ہے وہ کون ہے اور اسے محبت کرنے اور اس کی محبت اور رضامندی حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ گویا دین اسلام، دین قیم یا انبیاء کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو اس کی دائمی غیر مبدل فطرت کے تقاضوں کا صحیح علم بہم پہنچایا جائے تا کہ اس علم کی مدد سے وہ ان کو باحسن طریق پورا کر سکے۔ (روحِ اسلام)

نیا جنم

رسول ﷺ کی موبہ مواطاعت کے بغیر ہماری محبت ترقی نہیں کر سکتی۔ جس طرح سے ایک دیے سے دیا جلتا ہے، اسی طرح سے رسول ﷺ کا پیرو رسول ﷺ کی محبت سے اپنے دلوں کی محبت کو زندہ کرتا ہے جو شخص اپنے آپ کو رسول ﷺ کی اطاعت میں دے دیتا ہے وہ گویا ایک نیا جنم لیتا ہے۔ یہ جنم اس کی محبت کا جنم ہے جس کے بعد اس کی محبت رسول ﷺ کے علم سے تربیت پا کر اس طرح ترقی کرتی ہے جس طرح ایک نومولود بچہ ماں کے دودھ سے تربیت پا کر جسمانی نشو ونما حاصل کرتا ہے۔ (روحِ اسلام)

حب رسول ﷺ

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے نورِ محبت یا علم سے بہرور ہوں تو ہمیں چاہیے کہ ہم رسول ﷺ کی ذات پر اس طرح سے انحصار کریں جس طرح ایک جنین اپنی نشو ونما کے لیے ماں کے جسم پر پورا پورا انحصار کرتا ہے۔ فقط اسی صورت میں ہم اپنی محبت کا وہ جنم پا سکتے ہیں جس کے بعد محبت کا ارتقاء شروع ہوتا ہے۔ پھر رسول ﷺ کی پیہم اطاعت کی وجہ سے ہماری محبت کے ارتقاء کا ایک ایسا دور بھی آئے گا جب دین کے اسرار ہم پر کھل جائیں گے اور ہم نیک و بد کا ذاتی امتیاز کرنے لگ جائیں گے۔ ارتقائے محبت کے اس نقطہ پر ہمیں اعتقاد اور عمل میں رسول ﷺ کے ساتھ ایسی مشابہت حاصل ہوگی جو بیٹے کو شکل وصورت میں اپنے باپ سے ہوتی ہے، کیونکہ ہمیں رسول ﷺ کی روحانی ابنیت کا فخر حاصل ہوگا۔ قرآن میں بار ہا آل واولاد کا لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے، جو ایک آقا سے جذباتی اثر یا کسی تصور کی محبت قبول کرتے ہیں۔

جس طرح حرارت ایک بلند درجہ حرارت رکھنے والے جسم سے گزر کر کم درجہ حرارت رکھنے والے اجسام میں جو اس سے چھوٹے ہوتے ہیں سرایت کرتی ہے یا جس طرح پانی ایک بلند سطح سے بہہ کر ان مقامات کو سیراب کرتا ہے جو اس کے آس پاس نیچے کی سطح پر واقع ہوں، اسی طرح سے محبت یا روحانیت کی لہر اس مقام سے گزر کر جہاں وہ سب سے زیادہ بلندی پر ہوتی ہے، نوعِ انسانی کو مستفید کرتی ہے۔ علم یا محبت کا نور پہلے ایک مقام پر فراہم ہوتا ہے اور پھر وہیں سے اردگرد پھیلتا ہے۔ خاتم النّبیین ﷺ کی ذات عالم انسانی میں محبت کا بلند ترین مقام ہے جہاں محبت کا پانی فراہم ہوا ہے تاکہ نوعِ انسانی کی پیاس بجھائے۔ اگر اہم زندگی کے پانی سے سیراب ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے سرچشمہ یعنی رسول ﷺ کی ذات کے ساتھ ایک گہرا دلی تعلق قائم کریں۔

اخلاصِ عمل

اگرچہ یہ درست ہے کہ دین عمل ہے لیکن یہ درست کہ عمل دین ہے۔ عمل دین کے بغیر بھی ہوسکتا ہے اور ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ہمارے عمل میں دین کس قدر ہے۔ عمل کا مقصد خودی کی پرورش اور آخر کار خودی کا معراج ہے۔ اگر عمل اخلاص اور محبت پر کیا جائے گا تو خودی کی پرورش کرے گا، ورنہ نہیں۔ اگر ہم ایک روبٹ (ROBOT) یعنی مشینی انسان کو نماز کی حرکات سکھا دیں اور وہ پانچ وقت نماز پڑھ لے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ اس نے دین کا ایک رکن قائم کر دیا ہے؟ وہی عمل دین ہے جس کی بنیاد محبت پر ہو۔

ختم نبوت

ایک کامل نبی پر نبوت کا اختتام وحدتِ خدا اور وحدتِ انسانیت کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اگر انبیاء کا سلسلہ تا قیامت جاری رہتا تو اس بات کی اُمید کبھی نہ ہوسکتی کہ کسی وقت نوعِ انسانی ایک کامل نبی کی روحانی قیادت میں ایک کامل تصورِ حیات پر متحد ہو جائے گی۔ (روحِ اسلام)

کیا خدا کو دیکھنا ممکن ہے؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے پہلے ہمیں رؤیت کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے۔ جب ہم کسی مادّی چیز کو دیکھتے ہیں تو اس چیز پر نظر ڈالنے اور رؤیت کا احساس کرنے تک جو عمل معرضِ

وجود میں آتا ہے وہ حسب ذیل ہے:

کسی مادّی چیز سے جو روشنی کی شعاعیں بکھر رہی ہوتی ہیں وہ ہماری آنکھوں پر پڑتی ہیں۔ ہماری آنکھوں کا محدب شیشہ انہیں سمیٹ کر چیز کا ایک عکس بناتا ہے، جس کی اطلاع عصب رؤیت کے ذریعہ سے دماغ تک پہنچتی ہے اور دماغ کی معرفت ہمارے شعور کو اس چیز کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے۔ گویا جو چیز خارج میں موجود کسی جسم کو دیکھتی ہے وہ دراصل ہمارا شعور ہی ہے اور ہمارا شعور بھی جو چیز دیکھتا ہے وہ خود جسم نہیں ہوتا بلکہ اس جسم کے چند اوصاف ہوتے ہیں جن کے مجموعہ کو ہی ہم وہ جسم قرار دیتے ہیں۔ دماغ، عصب رؤیت، آنکھ اور روشنی فقط ان اوصاف کا علم حاصل کرنے کے آلات ہیں، جن کو ہمارا شعور اپنے کام میں لاتا ہے۔ جب شعور کو ان اوصاف کا واضح علم حاصل ہو جاتا ہے تو خواہ وہ جسم آنکھوں کے سامنے رہے یا نہ رہے، شعور اگر چاہے تو اس کو پھر دیکھ سکتا ہے اور جس قدر شعور کا علم واضح ہوگا اسی قدر اس کی بلاواسطہ رؤیتِ جسم بھی واضح ہوگی۔ جب مومن کے دل میں مطالعہ جمال اور مظاہرۂ جمال سے حق تعالیٰ کے اوصاف کی محبت درجۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے تو شدتِ محبت کی وجہ سے ذکر وفکر کے دوران مومن کی ساری توجہ ان اوصاف پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ وہ اوصاف اس کے شعور پر چھا جاتے ہیں اور ان کا علم اس کے شعور پر پوری طرح سے حاوی ہو جاتا ہے۔ اس وقت مومن کا شعور حق تعالیٰ کو بالکل اس طرح سے دیکھتا ہے جس طرح سے اس دنیا کی کسی اور چیز کو دیکھنا اس کے لئے ممکن ہوتا ہے۔ چونکہ یہ رؤیت ان آنکھوں سے نہیں ہوتی جو مادی اجسام کے دیکھنے کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر بنائی گئی ہیں، اس لیے حدیث کے الفاظ ہیں کہ تو خدا کی عبادت اس طرح سے کر گویا تو خدا کو دیکھ رہا ہے (کَاَنَّکَ تَرَاہُ) یعنی مومن خدا کو دیکھتا تو ہے لیکن اس کا دیکھنا ان آنکھوں کے ذریعہ سے عمل میں نہیں آتا۔ یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا تھا کہ جب تک ہم خدا کو رُو برو نہ دیکھیں ہم تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے، حالانکہ ایمان لانا خدا کو دیکھنے کی پہلی شرط تھی۔ اس کٹ حجتی کے لیے ان کو سزا دی گئی۔

اعمال نامہ

انسان کا لاشعور گویا اس کے سارے افعال واعمال کا ایک ناقابل محو ریکارڈ ہے۔ ہم جب چاہیں معمول پر ہپناٹک نیند طاری کر کے اس کے ریکارڈ کے کسی حصہ کا مطالعہ کر سکتے

ہیں۔ اس ریکارڈ کی موجودگی کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ اس سے ہمارے روزمرہ کے خوابوں کا تاروپود تیار ہوتا ہے۔ انسان کا لاشعور گویا اس کا اعمال نامہ ہے جو اس کی گردن میں ڈال دیا گیا ہے اور ہر روز لکھا جاتا ہے۔ اس سے انسان کا چھٹکارہ نہیں اور یہی اس کی قسمت کی نحوست اور سعادت کو معین کرتا ہے۔

لاشعور اور حیات بعد الموت

فرائڈ ہمیں بتاتا ہے کہ لاشعور کا خاصہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے تمام چھوٹے بڑے واقعات من وعن ضبط رکھتا ہے۔ اس کا مزید ثبوت اسے اس بات سے بھی حاصل ہوا کہ ہمارے خواب جن علامات کو کام میں لاتے ہیں، ان کے تاروپود میں بعض ایسے واقعات بھی آتے ہیں جو دور دراز کے عہد ماضی میں رونما ہوئے ہیں اور جن کو ہم بیداری میں اس طرح سے فراموش کر چکے ہوں کہ کوشش سے بھی یاد نہ کر سکتے ہوں۔ اس لیے یہ بھی معلوم کیا کہ خواہ یہ واقعات ایک دوسرے کے نقیض ہوں وہ ایک دوسرے کو کالعدم نہیں کرتے بلکہ ہر واقعہ لاشعور کے اندر اپنی جداگانہ حیثیت سے موجود رہتا ہے اور وقت کے گزرنے سے کسی واقعہ کے اندر ذرّہ بھر تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ نیز لاشعور کی دنیا وقت اور فاصلہ کے قوانین کے عمل سے باہر ہے اور یہاں فلسفیوں کی یہ بات غلط ثابت ہو جاتی ہے کہ ہمارا ہر ذہنی عمل وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہے۔

فرائڈ لاشعور کی ان خاصیات پر بے حد تعجب کا اظہار کرتا ہے۔ اسے بجا طور پر یقین ہے کہ لاشعور کی یہ خاصیات فطرتِ انسانی کے بہت سے قیمتی رموز و اسرار کی حامی ہیں اور لہٰذا حکما حکماء کو دعوت دیتا ہے کہ ان کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنائیں اور ان کے رموز و اسرار سے پردہ اُٹھائیں۔

فرائڈ کو معلوم نہیں کہ قرآن نے آج سے بہت پہلے نہ صرف یہ کہہ دیا تھا کہ ہر عمل جو انسان سے سرزد ہوتا ہے نفسِ انسانی میں تاقیامت جوں کا توں محفوظ رہتا ہے بلکہ اس نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ انسانی اعمال کی حفاظت کے اس قدرتی اہتمام کے اندر کون سے مقاصد اور کون سی حکمتیں اور نوامیس پوشیدہ ہیں؟ اگر فرائڈ فلسفیوں کو دعوتِ فکر دینے کی بجائے قرآن کی طرف رجوع کر سکتا تو اپنے ذوقِ دریافت کی تسکین کا پورا سامان وہاں پاتا اور فرائڈ کو معلوم نہیں کہ نبوت

کی رہنمائی کے بغیر فقط ذہن کی کاوشوں سے لاشعور کے ان اوصاف کے رموز واسرار پر حاوی ہونا فلسفیوں کے بس کی بات نہیں۔ البتہ نبوت کی روشنی ان کی ذہنی کاوشوں کو بہت دور تک صحیح راستہ پر لے جاسکتی ہے۔قرآن انسان کے نامہ اعمال کے متعلق تین باتیں بیان کرتا ہے۔ اول یہ کہ وہ انسان سے الگ نہیں ہوتا بلکہ اسی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِه (ہر انسان کے اعمال اس کی گردن میں لٹکا دیے ہیں) گویا انسان کا نامہ اعمال اس سے باہر کی کوئی قوت نہیں لکھتی بلکہ اس کی اپنی فطرت کی قوتیں ہی اسے لکھتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تمام انسانی قوتوں کے عمل پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو مامور کررکھا ہے۔ دوم یہ کہ اس نامہ اعمال کے اندر ہر چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے عمل کا اندراج ہوجاتا ہے۔ قیامت کے دن انسان جب اپنا نامہ اعمال پڑھے گا تو پکار اٹھے گا۔ مَا لِهٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا (اس نوشتہ عمل کو کیا ہے کہ میرا کوئی چھوٹا یا بڑا عمل ایسا نہیں جو اس سے رہ گیا ہو) سوم یہ کہ یہ نامہ اعمال موت کے بعد انسان کے ساتھ جاتا ہے اور انسان اس کے مطابق اچھے اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا پاتا ہے۔

جب تک اس تیسری بات کو نہ مانا جائے فرائڈ کے نتائج مہمل رہتے ہیں اور دراصل فرائڈ کے دونوں نتائج خود اس تیسرے نتیجے کی طرف واضح رہنمائی کررہے ہیں۔

ذکروفکر

مطالعۂ جمال، صفاتِ جمال کی علامات کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں مطالعہ جمال کی اولین ابتداء مظاہر قدرت پر غور وفکر کرنے سے ہوتی ہے کیونکہ کائنات خدا کا فعل ہے اور خدا کی صفات کمال اس کے اندر اسی طرح سے ظہور پذیر ہیں جس طرح ایک مصور کے شاہکار ہیں۔ اس کا کمالِ ہنر جلوہ ریز ہو۔ مظاہر قدرت پر غور وفکر سے انسان کا چارہ نہیں، کیونکہ انسان چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے ؎

نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

لہٰذا ہر انسان مجبوراً صفاتِ جمال سے ایک ابتدائی تعارف پیدا کرتا ہے۔ اسی سے اس کے ایمان یا

احساسِ حسن کا آغاز ہوتا ہے جس کے لیے اس کی فطرت کے اندر ایک مناسبت موجود ہے

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی

مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسبابِ مستوری

اس قسم کے مطالعۂ جمال میں انسان اپنے احساسِ حق کو بیدار کرنے اور ترقی دینے کے لیے مظاہر قدرت کے جو قوانین قدرت کے تابع رونما ہوتے ہیں، خدا کی صفات کی علامات کے طور پر کام میں لاتا ہے۔

لیکن جب مومن کا احساسِ حسن ذرا ترقی کر جاتا ہے تو پھر اسے مزید ترقی دینے کے لیے وہ ایک اور قسم کی علامات کو بھی کام میں لاتا ہے اور وہ الفاظ کی علامات ہیں جنہیں قرآن حکیم نے اسمائے حسنٰی کہا ہے۔ ان الفاظ کے معانی پر غور و فکر کرنے اور ان پر اپنی توجہ مرکوز کرنے سے مومن کی محبتِ صفات میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ مطالعۂ جمال کا دوسرا طریق ہے اور اسے ذکر کہتے ہی۔ اس کی اصل بھی صفاتِ جمال پر غور و فکر ہے۔ زبان سے اسمائے حسنٰی کا نام لینا یا یاد کرنا ان پر غور و فکر کرنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ چونکہ اسمائے حسنٰی سب کے سب مدح و ستائش کے نام ہیں، لہٰذا ذکر محبوب کی مدح و ستائش اور اس کی عظمت و جمال اور کبریائی کے اعتراف اور اقرار کی صورت میں اختیار کرتا ہے۔ ستائش حسن اگرچہ احساسِ حسن کے اظہار ہی کا دوسرا نام ہے اور احساسِ حسن کا نتیجہ ہے، لیکن یہ ایک ایسا فعل ہے جو خود احساس حسن کی کیفیت کو بدلتا جاتا ہے اور اسے ترقی دیتا اور عمیق تر اور قوی تر کرتا جاتا ہے، کیونکہ اس سے اوصافِ حسن پر توجہ مرکوز ہوتی ہے اور ان پر غور و فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اوصافِ باری تعالیٰ کی خوبی اور جمال سے پردے اُٹھ جاتے ہیں، ان کا حسن اور نمایاں ہو جاتا ہے اور ان کی محبت اور معرفت بڑھ جاتی ہے۔ ذکر کا مقصد حسن کی ستائش ہے جو دراصل انسان کے ضمیر کا فعل ہے اور محض اس کی زبان کا فعل نہیں۔ ذکر انسان کے دل کی کیفیت کا نام ہے، اس کی زبان کی کیفیت کا نام نہیں۔

خدا کی حمد و ستائش، تحسین و تسبیح، تقدیس و تہلیل ذکر کی صورتیں ہیں صرف وہی ذکر جو سچے احساس کا نتیجہ ہو، جس میں خشوع و خضوع، تضرع اور ابتہال، سوز و گداز اور بیم و رجا کے عناصر موجود ہوں، مومن کے احساسِ حسن کو عمیق تر اور قوی تر کرتا ہے اور اس کی محبت اور معرفت کو ترقی دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن ہم سے عبادت میں اخلاص طلب کرتا ہے اور فقط زبان سے چند

کلمات کا تکرار طلب نہیں کرتا۔ (روح اسلام)

عقیدۂ تقدیر

نصب العین کی محبت قوی ہو تو تقدیر کا عقیدہ ہمیں ایسے عمل سے باز نہیں رکھ سکتا، جو اس محبت کا تقاضا ہو، بلکہ اس کے برعکس اس کا ممد و معاون بن جاتا ہے۔ تقدیر کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کے بھی تو قائل ہیں کہ تقدیر اسباب کے ذریعہ سے اپنے مقاصد کو پاتی ہے اور ہم کو خدا کی تقدیر کا علم نہیں بلکہ فقط ان اسباب کا علم ہے جو بالعموم تقدیر کی صورت پذیر کر لیتے ہیں۔ جب ہمارے دل میں ایک نصب العین یا مدعا کی شدید محبت یا خواہش پیدا ہوتی ہے تو ایک زبردست اندرونی دباؤ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم وہ عمل اختیار کریں جو ہمارے تجربہ کے مطابق بالعموم اس کی تکمیل کا ذریعہ ہوتا ہے اور تقدیر کا عقیدہ اس دباؤ میں کمی نہیں کرتا، بلکہ اور اضافہ کرتا ہے، کیونکہ اس صورت میں ہم یہ نہیں کہتے ”کہ میں یہ کام نہیں کرتا، اگر میری تقدیر میں کامیابی لکھی ہو تو میرا مدعا خود بخود حل ہو جائے گا“۔ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ مجھے اس کام کو بلا خوف و خطر کر گزرنا چاہیے، کیونکہ اس کے بغیر میرا چارہ نہیں اور اس میں جو خوف یا خطرہ مجھے محسوس ہوتا ہے وہ خدا کی تقدیر کے بغیر کوئی حقیقت نہیں رکھے گا۔ (پاکستان کا مستقبل)

اقتصادی انسان ــــ ایک مغالطہ

اقتصادی انسان فقط اقتصادی انسان ہی نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی انسان، روحانی انسان اور سیاسی انسان بھی ہوتا ہے۔ اس کی اقتصادی، اخلاق، روحانی اور سیاسی حیثیتوں میں سے ہر ایک کے اندر اس کی تمام حیثیتیں گم ہوتی ہیں، لہٰذا انسان کو فقط اقتصادی انسان اور حرص کا پتلا اور دولت کا پرستار فرض کر کے اس کا جو مطالعہ کیا جائے گا وہ درست نہیں ہو گیا اور اس کی بنا پر جو نتائج مرتب کیے جائیں گے وہ صحیح ہوں گے۔ بعض وقت انسان کے نصب العین کے بلند ہونے سے اس کے بظاہر اقتصادی افعال کے محرکات اور دواعی کچھ اس طرح سے بدل جاتے ہیں کہ ان کو محض اقتصادی نقطۂ نظر سے سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ جب انسان کی اقتصادی فعلیت خدا کے نصب العین کے ماتحت نہ ہو تو وہ کسی غلط، ناقص اور باطل نصب العین کے ماتحت ہوتی ہے۔ اس حالت میں اس کے اندر وہ تمام خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کو جلبِ منفعت، استحصال اور مزدور کی حق تلفی وغیرہ

اصطلاحات سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ان خرابیوں کو دور کرنے کا فطری اور کامیاب طریق یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعہ سے سوسائٹی کو باخدا بنایا جائے اور اس طرح سے ان کے نصب العین کو جوان کے اعمال کی قوت محرکہ ہے ان کی فطرت کے مطابق کردیا جائے۔ (حکمت اقبال)

دورِ حاضر کا فتنہ ارتداد

باطل مذہب براہِ راست اور بلاواسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتا تھا۔ باطل فلسفہ براہ راست اور بلاواسطہ اسلام کے مقابلہ پر نہیں آتا بلکہ علم اور عقل کے نام سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ جب اسلام کی تردید کرتا ہے تو اسلام کا نام نہیں لیتا بلکہ اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے کہ گویا اسے معلوم ہی نہیں کہ اسلام بھی اس کے حریف کی حیثیت سے دنیا میں کہیں موجود ہے اور وہ اسے مٹانے کے لیے میدان میں نکلا ہے، بلکہ وہ علمی تحقیق اور عقلی استدلال کے بل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایک ایسی تشریح کرتا ہے، جس میں خدا اور رسالت اور دین کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، کیونکہ اسلام بھی انسان اور کائنات ہی کا ایک نظریہ ہے۔ وہ عقیدہ اور سند کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کو علم اور عقل کے معیار پر پرکھتا ہے اور صرف قدرت اور اس کے قابل تعبیر وتردید قوانین کے نام پر لامذہبیت اور دہریت کی طرف دعوت دیتا ہے، لیکن باطل فلسفہ کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو ترک کرتا ہے تو وہ مجبور نہیں ہوتا کہ بپتسمہ یا شدھی کی طرح کی کسی رسمی کارروائی میں سے گزرے، مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجائے یا ان سے اپنے، سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کرے یا اپنی بودوباش کے طریقوں کو بدل دے یا شادی اور بیاہ اور دوستی اور رشتہ داری اور میل ملاقات کے لیے کسی اور قوم سے راہ وربط پیدا کرے، کیونکہ اسلام کے اس نئے ہوشیار دشمن نے اپنے پرستاروں کو اجازت دے رکھی ہے کہ تم مذہب سے بیزار ہوکر اور خدا اور رسولؐ کے دشمن بن کر رہو تو کوئی حرج نہیں کہ تم پھر اسلام ہی کے دائرہ کے اندر رہو۔ چنانچہ اس دشمن دین وایمان سے رشتہ جوڑنے والے آج نصف سے بھی زیادہ مسلمان ایسے ہیں جو یا تو خدا کے منکر ہیں یا وحی کے یا رسالت کے یا حیات بعد الممات کے یا جزا اور سزا کے اور یا ان سب کے۔ (قرآن اور علم جدید)

علامہ اقبال کا مقام

وہ خاتم الانبیاء جنہوں نے نوعِ انسانی کو حقیقت کائنات کا کامل تصور عطا کیا ہے جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ وہ فلسفی جس نے علمی حقائق کی ترقیوں کے اس دور میں سب سے پہلے اپنے فلسفہ کی بنیاد نبوت کاملہ کے عطا کیے ہوئے کامل تصورِ حقیقت پر رکھی ہے اقبال ہے اور وہ فلسفہ جو اس دور کے علمی حقائق کو نبوت کے عطا کیے ہوئے کامل تصورِ حقیقت کی بنیادوں پر منظّم کرتا ہے فلسفہ خودی ہے۔ (حکمت اقبال)

اقبال آئندہ کی مستقل عالمگیر ریاست (World State) کا وہ ذہنی اور نظریاتی بادشاہ ہے جس کی بادشاہت کو زوال نہیں۔ ایک معمولی آدمی کے لیے جو رسول نہیں بلکہ رسول کا ایک ادنیٰ غلام ہے، عظمت کا یہ مقام اس قدر بلند ہے کہ اس سے بلند تر مقام ذہن میں نہیں آسکتا۔ اقبال اپنے اس مقام سے آگاہ ہے یہی سبب ہے کہ وہ بار بار اپنے اشعار میں کہتا ہے کہ اسے زندگی کے راز سے آشنا کیا گیا ہے۔ (حکمت اقبال)

پھر اقبال کی خصوصیت کیا ہے؟ پھر کیوں نہ اس مسلمان فلسفی کو نوعِ بشر کا آخری فلسفی اور آئندہ کے عالمگیر ذہنی انقلاب کا بانی قرار دیا جائے اور پھر اس سلسلہ میں شاید شاہ ولی اللہ اور محی الدین عربی ایسے اکابر اسلام کا نام لیا جائے، لیکن اس زمانے کے خاص ذہنی حالات اور خاص علمی ماحول اور مقام کی بنا پر اقبال کے فلسفہ کو جو خصوصیات حاصل ہوئی ہیں وہ آج سے پہلے کسی مسلمان فلسفی کے فلسفہ کو حاصل نہ ہوسکتی تھیں اور نہ حاصل ہوسکی ہیں۔ (حکمت اقبال)

ہمارے انحطاط کی انتہا کے زمانہ میں ہمارے حق میں قدرت کا پہلا تائیدی قدم یہ تھا کہ اس نے ایک فلسفی شاعر ہم میں پیدا کیا جو اسلام کی گہری بصیرت رکھتا تھا۔ جس نے اسلام کا ایک نیا فلسفہ ہمیں دیا اور اس فلسفہ کو گا کر سنایا۔ ہم نے اس کے پیغام کو سراہا اور اس کے گرد جمع ہوگئے۔ اس کے عوض کا دوسرا احسان ہم پر یہ ہوا کہ ہمیں ایک ریاست عطا کی گئی جس کا مطلب یہی ہے کہ ہم اسلام کے پیام اور فلسفہ کو ریاست کی اساس بنائیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا ہم پر ایک

ایسے انعام کا دروازہ کھل جائے گا جس کا تصور میں لانا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جس کا عطا کرنا خدا کے لیے مشکل نہیں۔ میری مراد دنیا کی حکومت ہے لیکن اگر ہم نے قدرت کے اس تازہ اقدام کی تائید نہ کی تو تعجب نہیں کہ قدرت پاکستان ہم سے چھین لے۔ (پاکستان کا مستقبل 152)

فلسفۂ خودی کی اہمیت

جب پاکستان بن گیا تو میں نے قائداعظم کی خدمت میں اپنی کتاب کا ایک نسخہ بھیجا اور ایک طویل عریضہ لکھا کہ کس طرح سے اگر پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنایا گیا تو اس کا مستقبل ہماری توقعات سے زیادہ شاندار ہوگا اور اور کس طرح سے فلسفہ خودی اس زمانہ کی اسلامی ریاست کی مشکلات کا قدرتی حل ہے۔ (مقدمہ پاکستان کا مستقبل)

اسلام اور کفر کی کشمکش اس وقت ایک بحرانی نقطہ پر پہنچی ہوئی ہے اگر فلسفہ خودی پاکستان کا سرکاری نظریہ بن گیا تو یہ کشمکش فوراً اسلام کے حق میں اور کفر کے خلاف ہو جائے گی، اگرچہ یہ تعین کرنے کی وجوہات موجود ہیں کہ فلسفہ خودی پاکستان کا سرکاری نظریہ قرار پانا قدرت کا اپنا مقصد ہے جو پورا ہوگا، لیکن خدا اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہم سے کام لینا چاہتا ہے۔ آیئے ہم اس کام کے لیے کمر ہمت باندھ لیں تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ اگر ہم نے آج سستی کی تو خدا تعالیٰ کے مقاصد تو نہ رکیں گے البتہ ہمارا کوئی ٹھکانا نہ ہو۔ (پاکستان مستقبل)

اسلام کا مستقبل

باطل قوت اس وقت ایک ایسے مرحلہ پر پہنچ گئی ہے کہ یا تو اسلام مٹ جائے گا یا فوراً دنیا پر پھیل جائے گا۔ لیکن اسلام اس زمانہ میں نئے علمی ہتھیاروں سے اس لیے آراستہ نہیں ہوا کہ وہ باطل سے مٹا دیا جائے گا بلکہ اس لیے ہوا ہے کہ وہ باطل کو مٹا دے۔ اسلام کی فطرت میں مٹنا نہیں بلکہ مٹانا اور غالب رہنا ہے۔ (پاکستان کا مستقبل)

جو قوم آخرکار کامل نظام تصورات کو اپنی زندگی کی حقیقی بنیاد بنائے گی وہ روئے زمین پر

حکومت کرے گی، کیونکہ اس کے ظاہری حالات خواہ کیسے ہی مایوس کن ہوں، فطرت اسے عروج و کمال پر پہنچانے کے لیے بے تاب ہے۔

قدرت ان تمام ترقیوں سے جو وہ نوعِ انسانی کو آج تک نصیب کرتی رہی ہے صرف ایک قوم کی تعمیر کرنا چاہتی ہے اور خاتم النّبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے اگرچہ اس قوم کی تعمیر کے سامان کا بہت سا حصہ اس وقت دوسری قوموں میں بکھرا ہوا ہے لیکن بالآخر وہ یکجا کر کے اسی قوم کے سپرد کیا جائے گا۔ مسلمان مطمئن رہیں کہ جو کچھ دنیا پیدا کر چکی ہے وہ ان ہی کا ہے اور جو کچھ دنیا نے ابھی پیدا نہیں کیا وہ خود پیدا کرنے والے ہیں۔ (پاکستان کا مستقبل)

نصب العینوں کا زمانہ

یہ زمانہ نصب العینوں کا زمانہ ہے، کیونکہ اس زمانہ میں انسان کے نصب العینوں نے یہاں تک ترقی کر لی ہے کہ وہ اس کی جبلی اور حیوانی خواہشات سے صاف طور پر نظر آ رہے ہیں اور علمی اور عقلی نظریات کی شکل میں نظر آ رہے ہیں جس قدر نصب العین واضح ہوتے جا رہے ہیں اور عقل اور علم کا لباس پہنتے جا رہے ہیں اس قدر نصب العینوں کی باہمی جنگ بھی زیادہ شدید اور تباہ کن ہوتی جا رہی ہے۔

3

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
حیات، شخصیت

ڈاکٹر شفیق عجمی صاحب

کی کتاب ''علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین (علمی و فکری تقابل)'' سے ماخوذ تلخیص

کشمیر الاصل، اقبال مفکر خودی ہیں اور ان کے ایک فکری جانشین اور مفسر خودی، ڈاکٹر محمد رفیع الدین بھی کشمیر کی عطا ہیں۔ اقبال کے اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں آ کر آباد ہوئے اور ڈاکٹر رفیع الدین کا خاندان پنجاب سے اُٹھ کر کشمیر جا آباد ہوا۔ اقبال کی عظمت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا گیا ہے اور اقبال شناسی کی روایت میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کاوشوں کو بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان دونوں ہستیوں کی زندگی میں دیگر علمی مماثلتوں کے علاوہ، کشمیر بھی ایک مشترکہ حوالہ ہے جس کی نسبت سے کشمیر کو ہمیشہ اپنے ان فرزندوں پر ناز رہے گا۔

خاندانی پس منظر

ڈاکٹر رفیع الدین کا خاندان گوجرانوالہ میں آباد تھا اور علمی و روحانی خاندان تھا۔ علماء و فضلاء کے اس خاندان میں سے مولوی محمد عبداللہ المعروف حضرت مولانا غلام رسول کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ آپ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے پڑدادا مولوی غلام محمد کے بھائی تھے بلکہ ان کی ایک صاحبزادی بھی مولوی غلام محمد کی بہو تھیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ مولانا غلام رسول، ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے والد مولوی فقیر اللہ کے نانا تھے۔

مولانا غلام رسول نے علوم معرفت اور تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ پنجابی شعر و ادب میں

بھی خصوصی نام پیدا کیا۔ پنجابی زبان وادب کی ہر قابل ذکر تاریخ میں ان کا تذکرہ ان کے نمونۂ کلام کے ساتھ موجود ہے۔ عبدالغفور قریشی نے ''پنجابی ادب دی کہانی'' میں نہ صرف مولانا غلام رسول کے پنجابی کلام کے نمونے درج کیے ہیں بلکہ ان کو ایک ایسا آتش نوا مبلغ بھی قرار دیا ہے جن کی زبان کی تاثیر سے بے شمار غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے۔

مولانا غلام رسول کے دادا نظام الدین خادم فارسی زبان کے اچھے شاعر تھے اور انہوں نے نظامی گنجوی کے تتبع میں ایک فارسی مثنوی بھی لکھی تھی۔ گویا ڈاکٹر رفیع الدین کے خاندان کے بزرگوں میں دین سے سچی لگن اور ادب سے وابستگی ایک روایت کی صورت میں موجود تھی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے تایا حضرت مولوی محمد حسن بھی ایک بلند پایہ صوفی بزرگ تھے اور ریاست جموں وکشمیر کے بیشتر علاقوں میں اپنے زہد وتقویٰ کی بدولت مریدین کا ایک وسیع حلقہ رکھتے تھے۔ وہ سال میں کئی بار اپنے چھوٹے بھائی مولوی فقیر اللہ (ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے والد ماجد) کے ہمراہ جموں وکشمیر کا سفر کرتے۔ ان کا حلقۂ ادارت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا اور بالآخر انہوں نے اپنے آبائی وطن کوٹ بھوانیداس کو خیر باد کہا اور جموں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ بعد میں مولوی فقیر اللہ نے سرکاری ملازمت بھی حاصل کر لی۔

پیدائش:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین 24 جولائی 1901ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام فقیر اللہ تھا۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے ان کو پنجاب کے کسی ضلع کا رہنے والا لکھا ہے۔ پنجاب ان کے آباؤ اجداد کا وطن ضرور تھا اور پنجاب سے کشمیر کو منتقل ہو جانے کی وجوہات پہلے تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں لہٰذا جموں ہی ڈاکٹر رفیع الدین کا مولد تھا۔

بعض صورتوں میں تعلیمی اسناد میں درج تاریخ ولادت بھی اصل تاریخ سے مختلف ہو سکتی ہے اور ممکن ہے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے معاملہ میں بھی یہی صورت پیدا ہوئی ہو اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنی زندگی میں اپنے اہل خانہ اور قریبی رفقا کو اپنا سن ولادت 1904ء ہی بتایا ہو جو اُن کے ہر سوانح نگار نے اسی سن پر اتنا پر زور اصرار کیا ہے لیکن غیر ضروری بحث سے اجتناب کرتے ہوئے، اصولی اور قانونی طور پر ان کی تعلیمی اسناد میں درج تاریخ ولادت کو ہی

درست سمجھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

نام:

میٹرک کے رزلٹ میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا نام صرف ''محمد رفیع'' درج ہے جبکہ بی۔اے اور اس کے بعد کی تمام ڈگریوں پر ''محمد رفیع الدین'' لکھا گیا ہے۔

تعلیم:

ڈاکٹر رفیع الدین کی تعلیمی زندگی پر نظر ڈالیے تو اس میں سائنس، ادب اور فلسفے کا حسین امتزاج نظر آئے گا۔ اُنہوں نے میٹرک اور انٹر کی سطح تک سائنس کا مطالعہ کیا، بی اے میں ان کے مضامین معاشیات اور عربی تھے، ایم اے عربی زبان و ادب میں کیا۔ فارسی میں آنرز کی ڈگری حاصل کی۔ بعد میں پی ایچ ڈی (Ph.D) اور ڈی لٹ (D.Litt) کی ڈگریاں ان کو فلسفے میں عطا ہوئیں۔ اُنہوں نے تاعمر قرآن اور دینی علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ اقبال کی شاعری اور فکر و فلسفہ سے ان کو عشق کی حد تک لگاؤ تھا جو بقول اُن کے ان کی بیشتر علمی تصانیف کا محرک بھی ہے۔ اس متنوع علمی پس منظر کی بدولت ان کا اسلوبِ تحریر گہرا فلسفیانہ اور وسعت کا حامل ہے جو بعض طبائع کو کھٹکتا بھی ہے لیکن اس کی علمی سطح سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے میٹرک 1920ء میں فزکس اور ہائی جین کے ساتھ درجہ دوم میں پاس کیا۔ ایف ایس سی میں وہ نان میڈیکل کے طالب علم تھے جب کہ بی اے میں ان کے اختیاری مضامین معاشیات اور عربی تھے۔ مجموعی طور پر اُنہوں نے درجہ دوم حاصل کیا اور عربی کے مضمون میں اوّل رہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ اُنہوں نے 1929ء میں اورنٹیل کالج لاہور سے ایم اے عربی کا امتحان پاس کیا۔ 1930ء میں وہ آنرز اِن پرشین کے امتحان میں بھی کامیاب ہوئے۔ بعد میں دورانِ ملازمت ان کو 1949ء میں ان کی فلسفیانہ تصنیف "Ideology of the Future" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی، جس کے ممتحن ڈاکٹر رادھا کرشنن، پروفیسر ولیم لِلی اور سید ظفر الحسن مقرر ہوئے۔ کلیم اختر کے مطابق ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اعتراف کیا کہ یہ مقالہ علمی دنیا میں ایک ٹھوس اضافہ ہے۔ پروفیسر لِلی نے اس کو فرائڈ، ایڈلر، کارل مارکس اور میکڈوگل کے نظریات کا حتمی ابطال قرار دیا جبکہ سید ظفر الحسن کی رائے یہ تھی کہ آج تک فلسفہ کی کوئی کتاب ان کی

نظر سے ایسی نہیں گزری جو اسلام کے اس قدر قریب ہو۔

1949ء میں پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ میں جب یہ کتاب ڈاکٹریٹ آف فلاسفی کی ڈگری کے لیے پیش ہوئی تو سنڈیکیٹ میں شامل بعض حضرات نے اعتراض کیا کہ چونکہ ڈاکٹر صاحب فلسفے میں ماسٹرز ڈگری کے حامل نہیں ہیں، اس لیے انھیں فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہیں ملنی چاہیے۔ اس وقت پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر، ڈاکٹر عمر حیات ملک میں موجود تھے۔ انہوں نے اس اعتراض کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اگر کوئی شخص فلسفے میں ماسٹرز ڈگری کا حامل ہوتے ہوئے بھی فلسفے میں ایسی معرکۃ الآرا کتاب نہیں لکھ سکا تو ڈاکٹر صاحب کو، جنہوں نے فلسفے میں ماسٹرز ڈگری کے حامل نہ ہونے کے باوجود ایسی کتاب لکھی ہے، ڈاکٹریٹ ضرور ملنی چاہیے۔ یہ ان کی ذہانت اور علمی بلندی کا ایک بہت بڑا اعتراف تھا۔

1961ء میں فلسفہ تعلیم پر شائع ہونے والی ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اعلیٰ پایہ کی تصنیف "First Principles of Education" پر 1965ء میں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے آپ کو ڈی لٹ (D.Litt) کی ڈگری عطا ہوئی۔ یاد رہے کہ یونیورسٹی کی یہ اعلیٰ ڈگری بھی آپ کو فلسفہ میں دی گئی۔

ملازمت اور علمی مشاغل:

1929ء میں ایم اے (عربی) کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد آپ کا تقرر بحیثیت پروفیسر عربی اور اُردو، سری پرتاب سنگھ کالج، سری نگر میں ہوا۔ یہ حکومت جموں وکشمیر کے محکمہ تعلیم میں آپ کی ملازمت کا آغاز تھا۔ 1930ء میں آپ نے آنرز اِن پرشین کا امتحان پاس کیا۔ 1932ء میں آپ کو پرنس آف ویلز کالج، جموں میں پروفیسر عربی اور فارسی مقرر کیا گیا جہاں آپ 1946ء تک اپنے فرائض منصبی ادا کرتے رہے۔

پرنس آف ویلز کالج جموں، جہاں آپ نے اپنی ملازمت کا تقریباً 14 سال کا عرصہ گزارا، کئی لحاظ سے ایک اہم دور تھا۔ آپ کو اپنی علمی اور انتظامی صلاحیتوں کے اظہار کا بھرپور موقع ملا۔ کالج کے اس وقت کے پرنسپل، پروفیسر ایس آر سوری (سیوارام سوری) بھی آپ کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ خاص طور پر آپ کی کلاسوں میں نظم وضبط مثالی تھا۔

آپ اپنی پروقار شخصیت اور جامہ زیبی کی بدولت طلبہ میں بے حد مقبول تھے۔ کلیم اختر نے بھی لکھا ہے کہ آپ اس زمانے میں عمدہ سلا ہوا انگریزی سوٹ زیب تن فرماتے تھے اور سر پر رومی ٹوپی پہنتے تھے۔ جامہ زیبی، مزاج میں گہری سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ کی بدولت ہی آپ کالج کے طلبہ میں ''نواب صاحب'' کے نام سے مشہور تھے جس کی تصدیق محمود ہاشمی کی تصنیف ''کشمیر اداس ہے'' کے صفحات سے بھی ہوتی ہے۔

کالج کے سینئر سٹاف ممبر ہونے کی وجہ سے آپ علمی و ادبی اور طلبہ کی دیگر سرگرمیوں کے انچارج بھی تھے۔ کالج میگزین ''توی'' کی نگرانی بھی آپ کے ذمہ تھی۔ آپ ہی کے زمانے میں قدرت اللہ شہاب اور محمود ہاشمی اس مجلّہ کے ایڈیٹر رہے۔

قدرت اللہ شہاب اور بعد میں ان کے چھوٹے بھائی حبیب اللہ شہاب بھی آپ کے شاگردوں میں شامل تھے۔ قدرت اللہ شہاب ان دنوں انگریزی ادب سے مسحور تھے، یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان کو شہرت ان کی اُردو تخلیقات کی بدولت حاصل ہوئی۔ جموں کالج کا تذکرہ اُنہوں نے ''شہاب نامہ'' میں بھی کیا ہے:

> ''پرنس آف ویلز کالج کے چاروں سال انگریزی کا بھوت میرے سر پر بری طرح سوار رہا۔ اگرچہ کالج میگزین ''توی'' کے اُردو سیکشن کی ادارت میرے سپرد تھی۔ تاہم اُردو تک بھی میری رسائی بزبان انگریزی ہی ہوتی تھی۔''

محمود ہاشمی نے بھی ''توی'' کی ادارت حاصل ہونے اور پروفیسر رفیع الدین کی نگرانی میں اس کو ترتیب دینے کی دلچسپ رُوداد بیان کی ہے:

> ''مجھے کالج میگزین ''توی'' کی ادارت ملی (توی پرنس آف ویلز کالج کا میگزین تھا لیکن اسے کچھ اس طرح کی حیثیت حاصل تھی کہ جیسے یہ سارے شہر کا ادبی مجلّہ ہو۔ میرے لئے اس کا ایڈیٹر مقرر کیا جانا بڑا اعزاز تھا۔ کچھ سال قبل قدرت اللہ شہاب اور اسحاق قریشی بھی اس کے ایڈیٹر رہ چکے تھے) تو پروفیسر رفیع الدین اس کے نگران تھے۔ جب اس کے چھپنے کا وقت آیا تو میگزین کے لئے آئے ہوئے افسانے، نظمیں اور مضامین کا پلندہ سنبھالے کئی دن ان کے پیچھے پیچھے پھرتا رہا۔''

اقبال بنام رفیع الدین

اقبال کو کشمیر اور آزادیٔ کشمیر سے جو تعلق تھا وہ تاعمر قائم رہا اور اس کا اظہار نہ صرف ان کی شعری وفکری کاوشوں میں جابجا ہوا ہے بلکہ علمی طور پر بھی وہ تحریک آزادی اور اس سے منسلک مشاہیرِ کشمیر سے وابستہ رہے جن کا ثبوت اقبال کے وہ خطوط ہیں جو اُنہوں نے مشاہیر کشمیر کے نام تحریر کیے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں بھی، جبکہ وہ مختلف مسائل کا شکار تھے، مسئلہ کشمیر کو اپنی توجہ کا مرکز بنائے رہے۔ مشاہیر کشمیر میں سے منشی محمد الدین فوق، منشی سراج الدین اور دیگر اصحاب کے نام لکھے گئے خطوط میں مسئلہ کشمیر اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اقبال کے خیالات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

22/ستمبر 1932ء کو ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے نام لکھے گئے اپنے مکتوب میں علامہ اقبال نے قضیہ کشمیر سے متعلق بعض اہم دستاویزات کے حصول میں ان سے تعاون چاہا ہے۔ اس مختصر مگر اہم مکتوب کا متن درج ذیل ہے:

''جنابِ من! السلام علیکم!

مجھے معلوم ہے اس قسم کے دستاویز آپ کے پاس ہیں لیکن اگر وہ پوشیدہ رہیں تو ان کا کیا فائدہ ہے؟ مجھے آپ اس کے اصل بھجوا دیجیے تو میں ان سے فائدہ اُٹھانے کی کوئی صورت نکالوں۔''

علامہ اقبال کا ڈاکٹر رفیع الدین کے نام صرف یہی ایک خط دستیاب ہوا ہے اور اس کے مابعد اثرات اور پیش رفت پر کوئی معلومات نہیں ملتی ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے ایک بھتیجے ملک خورشید احمد نے............واضح الفاظ میں ان کی کیفیات کا ذکر کیا کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب (Ideology of The Future) بڑی Intensive Study کے بعد لکھنا شروع کی اور اس سے پہلے وہ گرما کی چھٹیوں میں ان کے ساتھ لاہور آئے جہاں سے بہت سی اہم کتابیں حاصل کیں اور واپس جموں پہنچ کر بڑی یکسوئی کے ساتھ کتاب لکھنے کا آغاز کیا۔ اُنہوں نے فرش پر دری بچھا رکھی تھی اور مسلسل اپنے کام میں مگن تھے۔ ملک خورشید بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب اس کتاب کو اپنی زندگی کا اہم مشن قرار دیتے تھے

اوراس کی تکمیل کے دوران میں، میں نے انہیں صرف پڑھتے' لکھتے یا اِرد گرد سے بے نیاز گہری سوچوں میں ڈوبے پایا۔

"Ideology of the Future" میں جس طرح سے مغربی مفکرین اور ماہرین نفسیات کے حوالے آئے ہیں اوران کے نظریات کا ابطال کیا گیا ہے اس کے لئے واقعتاً بڑی عملی تیاری کی ضرورت تھی اور بہت سی حوالہ جاتی کتب بھی درکار تھیں اور ساتھ ہی غائر مطالعہ بھی ضروری تھا جس کے نتیجے میں ان کا شدید طور پر اعصابی دباؤ کا شکار ہو جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں جسے بے وجہ ماورائی رنگ دے دیا گیا۔ ملک خورشید نے ایک عینی شاہد کی حیثیت سے اس سارے عملی و تحقیقی عمل کواس کے فطری انداز میں بیان کر دیا ہے جس سے کوئی بھی الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔

1946ء میں ڈاکٹر رفیع الدین کوسری کرن سنگھ کالج میر پور کا پرنسپل مقرر کیا گیا۔ چند سال پہلے قائم ہونے والے اس کالج کے تعلیمی و تنظیمی اُمور کے بارے میں آپ کے ذہن میں کئی منصوبے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ان پر پوری طرح سے عمل درآمد کیا جاتا، ملک تقسیم ہو گیا اوراس کے ساتھ ہی فسادات اور قتل و غارت کا ایک خوفناک سلسلہ شروع ہو گیا۔ بہت سے دوسرے مسلمان سرکاری افسران کی طرح ڈاکٹر صاحب نے بھی پاکستان ہجرت کر جانے کا فیصلہ کیا۔ اہل خانہ کچھ عرصہ پہلے ہی گوجرانوالہ جا چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بھی کسی نہ کسی طرح سے اپنی جان بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن میں علامہ محمد اسد کے ساتھ:

قیام پاکستان کے فوراً بعد حکومت مغربی پاکستان نے نومسلم سکالر علامہ محمد اسد (Leopold Weiss) کی نظامت میں ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن قائم کیا تو محمد رفیع الدین، ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ ڈیپارٹمنٹ آف اسلامک ری کنسٹرکشن کے قیام کے مقاصد کی وضاحت علامہ اسد نے ادارے کے ترجمان علمی جریدے ''عرفات'' میں اس طرح سے کی:

''اُن زبردست روحانی اور مادّی تغیرات کے پیشِ نظر جو پچھلے چند دنوں میں ملت اسلامیہ کے اندراس ملک میں رُونما ہو رہے ہیں حکومت مغربی پنجاب نے مناسب

سمجھا کہ ایک نئے محکمے کی بنا ڈالے تا کہ وہ بعض ایسے مسائل کا حل سوچے جو ان تبدیل شدہ حالات سے مرتب ہوئے۔ اس محکمے کی غایت یہ ہے کہ اسلامی اُصولوں کے ماتحت زندگی کی از سرِ نو تعمیر میں ملت کا ہاتھ بٹائے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ''محکمہ احیائے ملت اسلامیہ'' (Deptt. of Islamic Reconsturction) رکھا گیا۔ عصر حاضر میں یہ پہلا موقع ہے جب اس ملک میں ایک سرکاری محکمے کے ساتھ ''اسلام'' کا لفظ ملحق نظر آتا ہے۔''

علامہ اسد نے احیائے ملت اسلامیہ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے تعلیم، مرکزی دارالعلوم، شریعت اور احیائے ملی، اسلامی فقہ اور اسلامی معاشیات، اوقاف کی تنسیق اور اخلاقِ ملی کے ذیلی عنوانات کے تحت ادارے کے آئندہ لائحہ عمل پر بھی روشنی ڈالی اور واضح کیا کہ اسلامی فکر و عمل کا احیا اور وہ بھی صدیوں کے زوال و انحطاط کے بعد کوئی معمولی بات نہیں۔ یہ اتنا بڑا کام ہے جس کے لئے ملک کے بہترین دماغوں کے اشتراکِ عمل کی ضرورت ہوگی تا کہ وہ اس مقصد کے لئے ایک قطعی راستہ اور اس کی ضروریات کا ایک مکمل نقشہ تجویز کرسکیں۔

سہ ماہی اُردو، انگریزی مجلّہ ''عرفات'' کا اجرا بھی مذکورہ مقاصد کے حصول کے لئے کی جانے والی کوششوں کا ایک حصہ تھا۔

اسی ادارے کی ملازمت کے دوران میں آپ نے ''پاکستان کا مستقبل'' کے عنوان سے ایک مقالہ قلم بند کیا جو ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوا۔

1949ء میں ادارۂ احیائے ملت اسلامیہ اپنے قیام کے مقاصد کی تکمیل سے پہلے ہی بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر بند ہو گیا تو ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر پریشان حالی کا شکار ہوئے۔

فروری 1951ء میں آپ کو وزارت اُمور کشمیر حکومتِ پاکستان نے شعبۂ تعلقات عامہ میں انفارمیشن آفیسر کے عہدے کی پیشکش کی جسے آپ نے اپنے علمی مزاج سے ہم آہنگ نہ ہونے کی بنا پر قبول نہ کیا۔

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں خلیفہ عبدالحکیم کے ساتھ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا اگلا پڑاؤ ادارۂ ثقافت اسلامیہ (Insitute of Islamic

(Culture) تھا جس کی بنیاد 1950ء میں ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے گورنر جنرل غلام محمد کے مشورے سے رکھی تھی اور ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ہی اس ادارے کے پہلے اکیڈمک ڈائریکٹر بھی مقرر ہوئے جس کے بارے میں مولانا محمد حنیف ندوی نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ ''سچ بات یہ ہے کہ وہی (خلیفہ صاحب) اس منصب کے لئے موزوں بھی تھے۔''

خلیفہ عبدالحکیم نے بڑی تگ ودو کے ساتھ ادارے میں نامور علمی شخصیات کو جمع کیا جن میں ڈاکٹر رفیع الدین، مولانا مظہر الدین صدیقی، خواجہ عباداللہ اختر، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری، بشیر احمد ڈار، رئیس احمد جعفری اور شاہد حسین رزاقی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ یہی وہ سکالرز ہیں جنھوں نے وقت کے علمی وفکری رجحان اور کامل سماجی اور سیاسی شعور کے ساتھ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی علمی حیثیت میں استحکام اور اس کے وقار میں اضافہ کیا۔

مولانا محمد حنیف نے ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ شخصیات کی علمی حیثیت اور مہارت کا تجزیہ کرتے ہوئے رفقا کے اس انتخاب کو حددرجہ موزوں قرار دیا، خاص طور پر ڈاکٹر رفیع الدین کے تذکرے میں لکھا:

> ''ڈاکٹر رفیع الدین ''آئیڈیالوجی آف دی فیوچر'' لکھ کر علمی ودینی حلقوں میں اپنا اثر رسوخ قائم کر چکے تھے......اُنھوں نے اسلام کے تعلیمی فلسفہ اور اس کے منشور و دعوت کی وضاحت کو اپنے ذمے لیا۔''

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ادارۂ ثقافت اسلامیہ میں بحیثیت ریسرچ آفیسر منسلک تھے۔ اس ادارے میں اپنے قیام کے دوران میں اُنھوں نے ''قرآن اور علم جدید''، ''روح اسلام''، Fallacy of Marxism (مارکسیّت کا مغالطہ)، اسلام کا نظریہ تعلیم اور کئی دوسرے مقالات تحریر کیے۔

اقبال اکادمی پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر کے طور پر تقرر:

1951ء میں اقبال اکادمی پاکستان کا ادارہ نیم سرکاری حیثیت میں کراچی میں قائم ہوا کیونکہ اس وقت کراچی پاکستان کا دارالحکومت تھا۔ 1962ء میں ایک صدارتی آرڈیننس کے ذریعے اسے ازسرنو منظّم کیا گیا۔ جب سے یہ ادارہ ''اقبال اکادمی پاکستان'' کے نام سے موجود

صورت میں مصروف کار ہے۔

اقبال اکادمی پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر ہونے کا اعزاز ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو حاصل ہے۔اس منصب پر آپ کا تقرر 1953ء میں ہوا۔آپ اپنی ریٹائرمنٹ تک اس ادارے کی ترقی اور فروغ کے لئے کوشاں رہے۔آپ ہی کے دورِ نظامت میں اقبال اکادمی پاکستان کے ترجمان مجلّات کے طور پر اپریل 1960ء میں سہ ماہی اقبال ریویو Iqbal Review (انگریزی) اور ''اقبالیات'' (اُردو) کا اجراء ہوا۔

ڈاکٹر رفیع الدین کو یہ احساس تھا کہ چند استثنائی مثالوں کو چھوڑ کر اقبال پر اب تک جو کام ہوا ہے وہ نہ تو علمی معیار پر پورا اُترتا ہے اور نہ ہی اس میں افکارِ اقبال کی بھرپور تشریح و توضیح کا اہتمام نظر آتا ہے۔لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبال کے ساتھ اپنے تمام تر عقیدت مندانہ جذبات سے بلند ہو کر اس کے افکار کا ایک منظّم اور مربوط عقلی و سائنسی مطالعہ پیش کیا جائے جو عالمی سطح پر اقبال کی حقیقی عظمت کو سامنے لانے کا ذریعہ بن سکے۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے 1960ء میں لکھے جانے والے ایک مقالے بعنوان "Scientific Exposition of Iqbal" میں اپنا مؤقف پیش کیا کہ اقبال کے فلسفہ خودی کی روشنی میں جدید علوم کے جائزے پر مبنی ایک علمی منصوبے پر کام کا آغاز کیا جانا چاہیے جس کے تحت سیاسیات، تعلیمات، اخلاقیات، نفسیات اور تاریخ کے بنیادی اُصولوں کو زیر بحث لایا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے واضح کیا کہ یہ منصوبہ ملک کے نامور اہل علم کے تعاون سے اقبال اکادمی پاکستان جیسے ادارے کی نگرانی میں ہی مؤثر طور پر پایۂ تکمیل تک پہنچ سکتا ہے۔ مذکورہ مقاصد کے حصول کے لئے آپ نے ''اقبال ریویو'' اور ''اقبالیات'' میں نہ صرف خود علمی و فکری مقالات لکھے بلکہ دیگر اہل علم سے بھی قلمی تعاون حاصل کیا جس سے مجلّات کا معیار بھی قائم ہوا۔

اقبال اکادمی پاکستان کی ملازمت کے دوران ہی آپ نے اپنی اہم تصنیف "Manifesto of Islam" (منشور اسلام) مکمل کی۔اس کے علاوہ آپ نے فلسفہ تعلیم پر "First Principles of Education" (تعلیم کے ابتدائی اُصول) بھی لکھی جس پر بعد میں آپ کو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈی لٹ (D.Litt) کی ڈگری دی گئی۔''اسلام اور

سائنس‘‘ کے عنوان سے ایک اہم مقالہ بھی شائع ہوا جس کو علمی و ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔

انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم میں شرکت کا اعزاز:

حکومت پاکستان اور پنجاب یونیورسٹی کے اشتراک سے 29/ دسمبر 1957ء سے 8/جنوری 1958ء تک انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم کا انعقاد بھی ایک تاریخی علمی واقعہ ہے جس میں تقریباً چالیس ممالک کے نامور سکالرز نے شرکت کی اور اسلام اور ثقافت کے حوالے سے اپنے تحقیقی مقالات پیش کیے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو بھی اس بین الاقوامی اسلامی مذاکرے میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔

یہ کلوکیم دنیا میں اپنی قسم کا ایسا دوسرا علمی اجتماع تھا۔ اس سے قبل 1953ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں کانگریس لائبریری اور پرنسٹن یونیورسٹی کے اشتراک سے ایک کلوکیم منعقد ہو چکا تھا۔ لیکن اپنے موضوعات کی وسعت اور نامور علمی شخصیات کی تعداد کی بدولت لاہور میں منعقدہ کلوکیم بلاشبہ بے مثال تھا۔

کلوکیم میں مسلم سکالرز کے ساتھ ساتھ دیگر ادیان اور عقائد سے تعلق رکھنے والے محققین و مستشرقین بھی شریک ہوئے جن میں شاہ محمد ارشاد، محمد موسیٰ شفیق (افغانستان)، سید عبدالحمید خطیب، شیخ احمد جمال (سعودی عرب)، سید محمد یوسف (سیلون)، محمد عبدالمعز نصر، پروفیسر عثمان امین، محمد ابوزہراء، یحییٰ الخشاب، محمد حب اللہ، محمد عبداللہ العربی، مہدی عالم، امین عفیفی، علی حسن عبدالقادر، عبدالوہاب عزام (مصر)، تنکو محمد جبی الشدیقی، انور معدد، عبدالقاہر، عبدالمالک کریم (انڈنیشیا)، محمود شہابی، صادق شفق، محمد معین، سید محمد شیخ الاسلام، ابوالفضل حاذقی، صفا خلوصی (ایران)، عبدالغفور شیخ (کینیا)، نہاد القاسم شیخ محمد بہجت البیطار، عمر بہاء الدین الامیری، احمد سمان، مصطفیٰ الزرقا، محمد المبارک (شام)، شیخ محمد منتصر (مراکش)، علی حسیب، کامل السید (سوڈان)، پروفیسر ڈاکٹر اسحاق موسیٰ الحسینی (فلسطین)، ڈاکٹر فاضل الجمال، ڈاکٹر عبدالستار فوزی، ڈاکٹر مصطفیٰ جواد (عراق)، فواد کیرولا، محمد فواد سیزگن (ترکی)، پروفیسر ولفریڈ کینٹ ویل سمتھ (کینیڈا)، ایساندرو بوسانی (اٹلی)، روڈی پیرٹ، برتھولڈ سپولر (جرمنی)، پروفیسر لوئی میسنون (فرانس)، یٰسین ہداونردی، محمد علی چنگ چی (چین)، ڈاکٹر جی' ڈبلیو' جے

ڈرویر، ڈاکٹر جوزف (ہالینڈ)، الحاج عبدالغفار مزکی (فلپائن)، ایملو گارشیا گومز (سپین)، جی۔ای وان، گروِن باہم، رچرڈ ٹنگسین، گارلینڈ ہاپکنز، رچرڈ نیلسن فرائی (امریکہ)، مس این۔کے۔ایس لیمٹس اور برنارڈ لیوس (برطانیہ) کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ جبکہ ہمسایہ ملک بھارت سے مولانا عبدالماجد دریا بادی، ڈاکٹر میر ولی الدین اور ڈاکٹر زبیر صدیقی شریک ہوئے۔ میزبان ملک پاکستان سے ڈاکٹر محمود حسین، مظہر الدین صدیقی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، مولانا امین احسن اصلاحی، جسٹس ایس۔اے رحمان، ڈاکٹر محمد داؤد رہبر، ڈاکٹر اے ایچ ضیائی، ڈاکٹر فضل الرحمٰن، علامہ رشید ترابی، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتا، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، علامہ غلام احمد پرویز، بیگم ریحانہ آصف اسلام، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، علامہ علاؤ الدین صدیقی، پروفیسر قاضی محمد اسلم اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اسلامی ثقافت کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مقالات پڑھے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے مقالے کا عنوان تھا:

"The Potential Contribution of Islam to the world Peace"

جو بین الاقوامی مذاکرے کی آخری نشست میں پڑھا گیا جس کا ماحصل یہ تھا کہ امن عالم کے قیام میں اسلام کا کردار اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اسلامی تعلیمات کی حقانیت اور صداقت کی بدولت ہی نسل انسانی کو ایک وحدت میں پرویا جا سکتا ہے جو مستقل اور پائیدار امن کی ضمانت ہے۔

اقبال چیئر کے قیام کی تجویز:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان کراچی کی حیثیت سے 1962ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ''اقبال چیئر'' قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور اس سلسلے میں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ ہونے والی اپنی خط و کتابت میں اس مسئلے کے دیگر اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی۔ اقبال اکادمی کو درپیش بعض مالی دشواریوں کے سبب اس چیئر کو وہاں قائم نہ کرنے کی وضاحت بھی کی اور ساتھ ہی اس صائب رائے کا اظہار بھی کیا کہ اقبال کا شہر لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ جو گہرا تعلق رہا تھا اس کے پیش نظر جامعہ پنجاب ہی اقبال چیئر کے لئے موزوں ترین درسگاہ ہو سکتی تھی۔ اُنہوں نے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ ابتدائی طور پر

''اقبال چیئر'' کو تجرباتی بنیاد پر قائم کر کے کسی موزوں ترین اقبال سکالر کو اس منصب پر فائز کر دیا جائے اور اس چیئر کی کامیابی کی صورت میں دیگر اُمور بعد میں طے کر لئے جائیں۔

یہ درست ہے کہ 1962ء میں ڈاکٹر رفیع الدین نے اقبال چیئر کے قیام کی جو تجویز پیش کی تھی اُس پر ان کی زندگی میں تو عملدرآمد نہ ہو سکا البتہ اس سلسلے میں اُنہوں نے اقبال کے ایک سچے اور پرجوش عقیدت مند کی حیثیت سے جو سعی کی اور ان کا جو خواب جشن اقبال صدی کے موقع پر 1977ء میں جامعہ پنجاب میں اقبال چیئر کے قیام کی صورت میں پورا ہوا۔ اُس کے لئے ڈاکٹر محمد رفیع الدین داد کے مستحق ضرور ہیں۔

ریٹائرمنٹ:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین اپنی مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد 10/اپریل 1965ء کو ڈائریکٹر اقبال اکادمی پاکستان کراچی کی حیثیت سے ریٹائر ہو گئے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کو خالصتاً تین سالہ کنٹریکٹ کی بنیاد پر اس عہدے کے لئے منتخب کیا گیا تھا لیکن آپ کی عمدہ کارکردگی کی بدولت مسلسل چار بار آپ کے کنٹریکٹ میں توسیع (Extension) کی جاتی رہی اور آپ بارہ برس تک اس منصب پر فائز رہے۔

اقبال اکادمی پاکستان کے پہلے ڈائریکٹر کے طور پر آپ نے اس کو ایک فعال علمی ادارہ بنانے کے لئے جو کوششیں سرانجام دیں ان کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا رہے گا۔

آپ کے بعد پروفیسر بشیر احمد ڈار، ڈاکٹر عبدالرب، ڈاکٹر معز الدین، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر منور (آخر الذکر دونوں حضرات دو دو بار ناظم کے عہدے پر فائز رہے) اور پروفیسر شہرت بخاری نے ادارے کی نظامت کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ آج کل محمد سہیل عمر اس منصب پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اکتوبر 1965ء کی شام ہمدرد لاہور میں اپنا مقالہ ''اسلام اور سائنس'' پڑھا۔

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کا قیام:

اُصول تعلیم اور بالخصوص اسلامی تعلیم ہمیشہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تحقیق و تجسّس کے

اہم موضوعات رہے۔ اس ضمن میں اُن کی سب سے اہم کاوش "First Priciples of Education" ہے جس کا تفصیلی تجزیہ آئندہ ابواب میں پیش کیا جائے گا۔ اقبال اکادمی پاکستان سے ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے خود کو مکمل طور پر تعلیمی مقاصد کے لئے وقف کر دیا۔ ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کے قیام کو انہی مقاصد کے حصول کا ذریعہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایجوکشن کانگریس کے قیام سے کچھ پہلے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام لکھے گئے خط میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے تفصیل سے ان مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ جن کے حصول کے لیے وہ کوشاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''جب میں نے اسلامی فلسفۂ تعلیم پر اپنا ڈی لٹ کا تھیسس مکمل کیا تھا تو میرا خیال تھا کہ میں نے کچھ تجاویز پیش کی ہیں جن پر ضرور عمل ہوگا لیکن میں نے دیکھا کہ ہماری قوم مغرب کی تقلید میں اتنی آگے نکل گئی ہے کہ اپنے آپ کو اس قدر فراموش کر چکی ہے کہ فقط کتابیں بتانے سے کہ اسلام کے مقاصد کس قسم کے نظام تعلیم کا تقاضا کرتے ہیں یا یہ کہنے سے کہ خالق عالم/خدا کا تصور اور سائنس آپس میں لازم وملزوم ہیں، کسی کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی لہٰذا اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اسلامی نظام تعلیم کا ایک نمونہ عملاً پیش کر کے بتایا جائے کہ اسلامی نظام تعلیم یہ ہوتا ہے اور سائنس کی کتابوں کو نئے سرے سے لکھ کر اور پڑھا کر ثابت کیا جائے اور آنکھوں سے دکھایا جائے کہ اگر خدا کا عقیدہ سائنس کے اندر اپنے مقام پر آجائے تو سائنس بگڑتی نہیں بلکہ سنورتی اور ترقی کرتی ہے۔''

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اپنے چند ہم خیال رفقا کے ساتھ مؤرخہ 7/اگست 1966ء کو سیالکوٹ میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں اسلامک ایجوکیشن کانگریس کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر صاحب اور مولوی حبیب اللہ اس اجلاس میں شریک تھے جس میں متفقہ طور پر پروفیسر نصیر الدین کو صدر اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو ڈائریکٹر (اکیڈمک اینڈ ایڈمنسٹریٹو) کے طور پر منتخب کیا گیا۔ کانگریس کے ایک خصوصی اجلاس منعقدہ 23 دسمبر 1966ء کو ایک قرارداد کے ذریعہ اسلامک

ایجوکیشن کانگریس کو ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کا نام دے دیا گیا جو آج تک برقرار چلا آرہا ہے۔ کانگریس کے مقاصد کے حصول کے لیے ڈاکٹر رفیع الدین کے ذہن میں "The Holy Quran University of Scinses" کا ایک خاکہ بھی تھا جس پر وہ مسلسل غور وفکر کرتے رہے۔

دسمبر 1966ء کے اجلاس ہی میں ملک خدا بخش بچہ کو جو کہ اس وقت حکومت مغربی پاکستان میں وزیرِ تعلیم کے منصب پر فائز تھے آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ کئی سالوں تک کانگریس کے اجلاس ملک خدا بخش بچہ صاحب کی رہائش گاہ پر منعقد ہوتے رہے۔ آخر کار چوہدری مظفر حسین نے 7۔فرینڈز کالونی ملتان روڈ لاہور پر واقع اپنی وسیع و عریض رہائش گاہ کا ایک حصہ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے دفتر اور لائبریری کے لئے وقف کر دیا۔

1968ء کے آغاز میں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس نے ادارے کا ترجمان علمی مجلّہ دوماہی "Islamic Education" (اُردو۔انگریزی) جاری کیا جس کے پہلے مدیر خود ڈاکٹر محمد رفیع الدین تھے۔ اُنہوں نے خود بھی اس مجلّے کے لئے مقالات لکھے اور دیگر اہل قلم دانشوروں کو بھی اس کے دائرے میں شامل کیا۔ بعد میں 1972ء سے 1974ء تک ''اسلامی تعلیم'' اُردو مجلّہ کے طور پر علیحدہ شائع ہوا جس کے ہر شمارے میں یہ وضاحت بھی شائع ہوتی رہی کہ کانگریس کے تمام تحقیقی، تصنیفی اور انتظامی کام کو منظّم کرنے کے لئے دوٗ دوماہی جریدے ''اسلامی تعلیم'' اُردو زبان میں اور ''اسلامک ایجوکیشن'' انگریزی زبان میں شائع کیے جاتے ہیں ان میں ایسے بلند پایہ معیاری اور تحقیقی مضامین پیش کیے جاتے ہیں جن کا تعلق طبیعیات، کیمیا، فلکیات، ارضیات، حجریات، حیاتیات، نباتیات، انفرادی نفسیات، اجتماعی نفسیات، فلسفۂ تعلیم، فلسفۂ معاشیات، فلسفۂ قانون اور فلسفۂ تاریخ وغیرہ سے ہو۔ مضامین ومقالات کا مرکزی نکتہ یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ آفاق والنفس میں جو حیرت انگیز نظم وضبط اور مقصدیت پائی جاتی ہے اس کا سرچشمہ خدا کی قوت وحکمت اور تدبر وربوبیت ہے۔

دوماہی ''اسلامی تعلیم'' اور ''اسلامک ایجوکیشن'' جناب اے۔ کے بروہی، سید ظفر

الحسن، ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، عبدالحمید کمالی، منظور احمد عباسی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، حافظ عباداللہ فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر خالد علوی، ڈاکٹر محمد ریاض، ڈاکٹر رحیم بخش شاہین، افضال حسین قادری، پروفیسر محمد منور، کلیم صدیقی، مظفر حسین، ڈاکٹر ابصار احمد اور دوسرے نامور دانشوروں کی علمی وتحقیقی تحریروں سے مزین ہوتے رہے۔

ازدواجی زندگی

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی شادی 1929ء میں اپنے ایک قریبی عزیز مولوی ضیاء الدین کی صاحبزادی شریفہ بیگم سے ہوئی۔ مولوی صاحب کا تعلق موضع دھانوالی ضلع سیالکوٹ سے تھا۔ شریفہ بیگم نے اپنے گاؤں ہی میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی تھی۔ شادی کی وقت ان کی 14 برس تھی یعنی وہ ڈاکٹر صاحب سے عمر میں 15 برس چھوٹی تھیں۔

ڈاکٹر رفیع الدین کو خدا نے سات بیٹے بیٹیوں سے نوازا۔ ایک بیٹا طویل علالت کے بعد 1962ء میں کراچی میں وفات پا گیا تھا۔ اس وقت تین بیٹے اور تین بیٹیاں بقید حیات ہیں جس کا مختصر احوال درج ذیل ہے:

1۔ جمیلہ ظفر

ڈاکٹر رفیع الدین کی اولاد میں سب سے بڑی ہیں۔ 1930ء میں سرینگر (کشمیر) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے شوہر محمد ظفر حکومت پاکستان کے ایک سرکاری عہدے دار تھے، ان دنوں کراچی میں ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں۔

2۔ صلاح الدین محمود

آپ بھی سرینگر (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ ولادت 13 اگست 1934ء ہے۔ آپ نے 1958ء میں P.I.D.C میں ایک جونیئر افسر کے حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ 1983ء میں ڈپٹی جنرل منیجر سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ڈیوٹی فری شاپ میں ایریا چیف اور جنرل منیجر کی حیثیتوں میں کام کیا۔ ان دنوں کراچی میں مقیم ہیں۔ اور ریٹائرمنٹ کے بعد تالیف وترجمہ میں مصروف ہیں۔ اپنے والد ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تصنیف ''روحِ اسلام'' "The Essence of Islam" کے عنوان سے انگریزی میں ترجمہ کر چکے ہیں۔ اور ان دنوں ڈاکٹر

صاحب کی معروف تصنیف ''قرآن اور علم جدید'' کو انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔مظفر حسین کی وفات کے بعد آپ نے ''رفیع الدین فاؤنڈیشن'' قائم کرنے کا اعلان بھی کیا ہے۔

3۔عفت نذیر

1938ء میں جموں (کشمیر) میں پیدا ہوئیں۔ان دنوں لاہور میں رہائش پذیر ہیں۔

4۔پروین اعجاز

1940ء میں جموں (کشمیر) میں پیدا ہوئی۔ 1972ء سے اپنے شوہر اعجاز رانا کے ہمراہ بحرین میں مقیم ہیں جو حکومت بحرین میں انجینئر ہیں۔

5۔عبدالسلام

1942ء میں جموں (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ بنیادی طور پر بینکار ہیں۔ دوبئ میں UBL اور B.C.C.I سے منسلک رہ چکے ہیں۔

6۔شجاع الدین

1949ء گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کی وفات کے وقت آپ UET لاہور میں زیر تعلیم تھے۔آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ بھی بسلسلہ ملازمت غیر ممالک میں گزرا ہے۔کینیڈا کے بعد اب چند سالوں سے قطر میں ملازمت کر رہے ہیں۔ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد آپ نے ان کے بارے میں چند مضامین قلمبند کیے تھے جو مختلف جرائد میں شائع ہوئے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے ڈاکٹر صاحب کے معمولات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی حادثاتی موت:

ڈاکٹر رفیع الدین کے رفقاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنی عمر اور صحت سے بے نیاز ہو کر اپنے علمی منصوبوں کی تکمیل کے لئے شب و روز منہمک رہے۔اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر وہ اپنی آخری تصنیف ''حکمت اقبال'' مکمل کر چکے تھے لیکن اس کی اشاعت کے بعد بھی اس کے اگلے ایڈیشن میں چند مزید ابواب کا اضافہ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔اس ضمن میں اُنہوں نے چوہدری مظفر حسین کو کچھ ہدایات بھی دی تھیں جن کا تذکرہ آگے آئے گا لیکن وہ ساتھ ہی اپنی عجیب کیفیت اپنے اہل خانہ اور اپنے بعض قریبی دوستوں سے بیان کرتے ہوئے کہتے تھے:

''اب مجھے Inspiration بالکل نہیں ہوتا، شاید دنیا میں میرا کام مکمل ہو چکا ہے''

26 نومبر 1969ء لاہور میں ان کا آخری دن تھا۔ مظفر حسین کی علالت کا سن کر فوراً ان کی عیادت کے لئے پہنچے۔ دیر تک اُن کے پاس بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ مظفر حسین ڈاکٹر صاحب کے ساتھ اپنی اس آخری ملاقات کا احوال بیان کرتے ہیں:

''اس ملاقات میں آپ نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنی کتاب ''حکمت اقبال'' کے دوسرے ایڈیشن میں ایک اور باب بعنوان ''خودی اور موت'' کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں، اس لئے میں ان کی واپسی تک موت کے موضوع پر علامہ اقبال کے تمام اشعار جمع کر رکھوں۔''

مظفر حسین کا کہنا ہے کہ علامہ اقبال کے درج ذیل اشعار بار بار پڑھتے تھے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے تھے کہ اشعار کس قدر پرسوز اور درد انگیز ہیں:

؎ خود تجلّی کو تمنا جن کے نظاروں کی تھی
وہ نگاہیں نااُمید نور ایمن ہوگئیں

؎ یہ راز ہم سے چھپایا ہے میر واعظ نے
کہ خود حرم ہے چراغِ حرم کا پروانہ

ڈاکٹر صاحب کراچی میں مقیم اپنے صاحبزادے عبدالسلام کی خوش دامن کی وفات پر تعزیت کے لئے مؤرخہ 27 نومبر 1969ء کو بذریعہ ٹرین کراچی کے لئے روانہ ہوئے۔ 28 نومبر 1969ء کو ان کے صاحبزادے صلاح الدین محمود ان کو لینے کے لئے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ یہ رات اُنہوں نے اپنے بیٹے محمود ہی کے ہاں گزاری، اگلے روز مورخہ 29 نومبر کو وہ تعزیت سے فارغ ہو کر دوپہر کو اپنی صاحبزادی کے ہاں جانے کے لئے رکشہ میں سوار ہوئے۔ لارنس روڈ پر سامنے سے آنے والی ایک تیز رفتار بس رکشہ کے ساتھ ٹکرائی۔ اس خوفناک تصادم میں ڈاکٹر صاحب موقع ہی پر جاں بحق ہو گئے۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے نہ صرف ''معاصرین'' میں ڈاکٹر رفیع الدین کو جگہ دی بلکہ ان کے ساتھ ہونے والی اپنی ملاقات کو بھی ہمیشہ یاد رکھا:

''1955ء میں کراچی میں ملاقات ہوئی اور مل کر جی بڑا خوش ہوا کہ کم سے کم ایک آدمی تو ذہنی ودماغی قویٰ میں فرنگیوں کا ہم پلہ موجود ہے۔ اقبال کے بعد سہی، جو اقبال کے کام اور پیام کو دنیا تک پہنچا سکتا اور اقبال ہی کی زبان اور لہجے میں گفتگو کرسکتا ہے''۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تصانیف بالخصوص 'منشور اسلام' (انگریزی) اور ''قرآن اور علم جدید'' پر اپنے رسالہ ''صدق جدید'' لکھنو میں جن الفاظ میں رائے زنی کی ہے وہ ڈاکٹر رفیع الدین کے ساتھ ان کی وابستگی اور عقیدت مندی کا واضح اظہار ہے۔

اسلام، اقبال اور سائنس ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی تحریر وتقریر کے خصوصی موضوعات تھے۔ جن اصحاب کو ڈاکٹر مرحوم کی صحبتیں نصیب ہوئی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ وہ گھنٹوں ان موضوعات پر گفتگو کرتے رہتے تھے اور سننے والے ہمہ تن گوش ہوتے تھے۔ مظفر حسین انہی خوش نصیب اصحاب میں سے ہیں جن کو بار بار ڈاکٹر صاحب سے ملنے، سننے اور ان سے سیکھنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ وہ ڈاکٹر مرحوم کے ساتھ اپنی رفاقت اور علمی صحبتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''گھنٹوں کی گفتگو ہمارا روز کا معمول تھا اور گفتگو کا پھیلاؤ اسلام، اقبال، سائنس، مذہب اور حالات حاضرہ کو محیط۔ مرحوم اپنے مخصوص انداز میں خرد کی گھتیاں سلجھاتے اور ان کی خرد افروز باتوں میں ذوق جنون کی نہایت ہی خوشگوار لاگ ہوتی''۔

ڈاکٹر رفیع الدین کی شخصیت اور ان کے خیالات کو سمجھنے کے لیے پروفیسر مرزا محمد منور کا ایک جملہ بہت اہم ہے جو انہوں نے ''حکمت اقبال'' پر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

''ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مزاجاً بھی اور عملاً بھی شدید مذہبی آدمی تھے۔ اسلام کی حقانیت پر بھرپور یقین تھا اور اس امر پر ایک طرح سے ایمان محکم رکھتے تھے کہ ہر سائنسی اور علمی اور نظری ترقی کسی نہ کسی اعتبار سے اسی نقطے کی طرف ایک قدم ہے جسے نقطۂ توحید کہتے ہیں۔''

ڈاکٹر رفیع الدین علوم جدید کی اسلامی تشکیل کو تعلیم کی سب سے اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے سائنسی نصابات کو نئے سرے سے مرتب کروانے کو ضروری خیال کرتے تھے۔ اسلامک ایجوکیشن کانگریس کا قیام بھی اسی سلسلے کا ایک بنیادی اقدام تھا۔ ان کی زندگی کے آخری

چار پانچ سال اسی جدوجہد میں گزرے۔مظفر حسین اس جدوجہد میں ان کے ہمقدم تھے۔وہ لکھتے ہیں کہ ظفر علی ہاشمی (زیڈ۔اے ہاشمی) جب سیکرٹری تعلیم مقرر ہوئے تو ڈاکٹر صاحب بے حد خوش تھے کیونکہ ان کے علم میں تھا کہ ہاشمی صاحب بارہا اسلام اور سائنس کے الحاق پر زور دے چکے تھے۔اوران کی اسی بات نے ڈاکٹر صاحب کوان کا غائبانہ طور پر عقیدت مند بنا رکھا تھا۔مظفر حسین کی ہمراہی میں وہ ایک دوبار ہاشمی صاحب کی خدمت میں حاضر بھی ہوئے لیکن نصابات کو ازسرنو مرتب کرنے اوراس کے عملی نفاذ کے موقف پر ہاشمی صاحب کو قائل نہ کر سکے۔مظفر حسین کا کہنا ہے کہ اس روز ڈاکٹر صاحب کی مایوسی دیدنی تھی۔وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ اگر ہاشمی صاحب واقعی مذہب اور سائنس کا الحاق چاہتے ہیں تو بجائے اس کے اہم ان کے پاس یہ درخواست لے کر جائیں انہیں اس کام کے لیے خود ہمیں تلاش کرنا چاہیے تھا لیکن انہوں نے تو پہلی بات ہی تسلیم نہ کی۔

اداروں کی بے حسی پران کا دل کڑھتا تھا۔ وہ مایوس ہوتے لیکن پھر اٹھ کھڑے ہوتے۔وہ ایک عالی ہمت انسان تھے۔ان کے عزائم بلند تھے۔اسی لئے زندگی کی آخری سانسوں تک نہ ان کا قلم رکا، نہ ان کے قدم تھمے۔ارباب اختیار نے ان کی تجاویز کو قابل توجہ نہ سمجھا لیکن ان کے جو دو چار رفقا تھے،انھوں نے ان کا کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔

ڈاکٹر رفیع الدین میموریل لیکچرز کا اجراء

ڈاکٹر رفیع الدین کی قائم کردہ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کوان کی وفات کے بعدان کے رفقاء،جن میں مظفر حسین کا نام سرفہرست ہے نے قائم رکھا۔ادارے کے ترجمان مجلّات ''اسلامی تعلیم'' اور''اسلامک ایجوکیشن'' کو جاری رکھنے کی ہر ممکن سعی کی۔ڈاکٹر رفیع الدین کی کتب اور مقالات کی اشاعتوں کو ممکن بنایا۔اورڈاکٹر مرحوم کی علمی وفکری خدمات کے اعتراف کے طور پر 1993ء میں پاکستان انسٹیٹیوٹ آف نیشنل افیئرز (P.I.N.A) کے اشتراک سے ''ڈاکٹر رفیع الدین میموریل لیکچرز'' کا اجراء کیا۔میموریل لیکچرز کی تجویز کے محرک بھی مظفر حسین تھے اوراس سلسلے کا پہلا لیکچر دینے کی سعادت بھی انہی کو حاصل ہوئی۔1993ء سے 1999ء تک پانچ لیکچرز دیئے گئے۔راقم کو ذاتی طور پران لیکچرز کو سننے اوران سے استفادہ کے مواقع نصیب ہوئے۔لیکچرز کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا لیکچر: 1993ء

''پاکستان، نفاذ اسلام اور اقبال'' کے عنوان سے جناب مظفر حسین نے دیا جس کا مرکزی خیال یہ تھا کہ نفاذ اسلام سے پہلے ہمیں نفوذ اسلام کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جس کے لیے نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے کہ سائنسی علوم کا عقیدہ توحید سے الحاق کر کے انہیں خدا جوئی، خدا شناسی اور خدا رسی کا ذریعہ بنالیا جائے تا کہ ہمارا نظام تعلیم سچے اور پکے مسلمان پیدا کر سکے۔ نفاذ اسلام کا یہ طریقہ، نفاذ اسلام کا کلچرل طریقہ کار ہے۔ ہمارے دینی رہنماؤں نے یہ طریقہ اختیار کرنے کی بجائے نفاذ اسلام کا آئیڈیالوجیکل طریقہ کار اپنایا جس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہو سکے۔

دوسرا لیکچر: 1995ء

علوم جدید کی اسلامی تشکیل کے موضوع پر جناب ظفر اسحاق انصاری نے دیا۔ آپ نے بتایا کہ پاکستان میں علوم جدید کی اسلامی تشکیل کا مسئلہ سب سے پہلے ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اٹھایا اور اس سلسلے میں قابل عمل نظریات پیش کیے۔ آپ نے فلسفہ تعلیم پر ایک انتہائی وقیع کتاب تعلیم کے ابتدائی اصول لکھی اور اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک ادارہ بھی ''آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس'' کے نام سے قائم کیا۔ تعلیم کے میدان میں ان کی خدمات کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے آپ نے انہیں زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ یہ لیکچر زبانی دیا گیا تھا۔ جو ٹیپ نہ کیے جانے کی وجہ سے شائع نہ کیا جا سکا۔

تیسرا لیکچر: 1996ء

''نظریہ، قومی تعلیم اور نصاب'' کے موضوع پر علامہ شبیر بخاری نے دیا۔ آپ نے پاکستان میں تعلیم کی تاریخ کو کھنگالا اور تعلیمی رپورٹوں کا ذکر کیا جو تعلیم کو قومی مقاصد سے ہم آہنگ کرنے کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً حکومت مرتب کرواتی رہی، مگر ان پر خوش دلی سے عمل نہ کیا گیا۔ چنانچہ عمل میں تسلسل اور استقلال کے فقدان کی وجہ سے ان سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ آپ نے مثالی کارکن معلّمین کی تیاری کو کلیدی فعال قوت اور معیاری نصابی کتب، تدریسی اعانات اور

''نیک سیرت ارباب اختیار کے سو فیصد تعاون'' کو کامیابی کی لازمی شرط قرار دیا۔

چوتھا لیکچر: 1998ء

''علوم اسلامی کے اساسی مسائل'' کے عنوان سے جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے دیا۔ آپ نے دین، قرآن کی حیثیت، سنت اور حدیث میں فرق، شریعت اور فقہ میں امتیاز، اتمام حجت کا قانون، غلبہ دین کی جدوجہد، ارتداد کی سزا، جہاد، ذمی اور جزیہ جیسے اہم موضوعات پر نہایت عالمانہ گفتگو کی۔ لیکچر زبانی تھا جسے ٹیپ پر ریکارڈ کیا گیا اور بعد میں ادارۃ المورد نے ٹیپ سے اتار کر ضروری ترامیم اور اضافہ کے بعد اشاعت کے لیے مہیا کیا۔

پانچواں لیکچر: 1999ء

''اکیسویں صدی میں پاکستان کے تعلیمی تقاضے'' کے عنوان سے جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی نے یہ لیکچر مختصر نوٹس کی مدد سے زبانی دیا تھا جسے بعد میں مفید اضافوں کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔ تاریخ اسلام کے تناظر میں آج کے تعلیمی و نصابی مسائل کو پیش کرنے اور ایک واضح لائحہ عمل اختیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ تعلیم کے پالیسی سازوں کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی وفات کے بعد ان کی قائم کردہ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کو مظفر حسین نے اپنی وفات 2003ء تک مختلف علمی و ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ سے کسی نہ کسی طرح سے زندہ رکھا ہوا تھا۔ ان کے بعد سے ادارے کی حیثیت ''ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے'' سے مختلف نہیں ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین کے صاحبزادے صلاح الدین محمود نے مظفر حسین کی زندگی ہی میں ''رفیع الدین فاؤنڈیشن'' قائم کر دی تھی جس کی اب تک کی کارروائی ڈاکٹر رفیع الدین کے مقالے ''روح اسلام'' کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت تک محدود ہے۔ یہ ترجمہ بھی ان کے صاحبزادے صلاح الدین محمود کا کیا ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے مظفر حسین کی صورت میں اپنا فکری جانشین تیار کیا تھا جو ان کی فکر اور ان کے منصوبوں کو حتی الامکان آگے بڑھانے میں کوشاں رہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کو کوئی دوسرا مظفر حسین میسر آتا ہے یا نہیں؟

4

فکرِ قرآنی کے چار سلسلوں کا قِران

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

کی تصنیف لطیف 'دعوت رجوع اِلی القرآن منظر و پس منظر'

ان سطور کے ناکارہ و ناچیز راقم کو اپنی اس خوش بختی پر ناز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نوجوانی ہی کے دور میں ایسے مواقع پیدا فرما دیے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنی بساط کے مطابق فکر قرآنی کے تینوں درمیانی دھاروں سے متعارف و مستفید ہوا بلکہ حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی کی وساطت سے اس کا ذہنی رشتہ کم از کم تفسیر قرآن کی حد تک ان علماء ربانیین کے حلقے سے بھی قائم ہوگیا، جو بلاشبہ "الراسخون فی العلم" کہلانے کے مستحق ہیں ____ نتیجتاً، بفضل اللہ وعونہ، اس کی ذات میں بقدر وسعت ظرف ان 'انہارِ ثلاثۂ کے ساتھ ساتھ یہ چوتھا چشمہ صافی بھی رواں دواں ہے ____ فله الحمد و المنة۔

جذباتی سطح پر راقم کی شخصیت پر سب سے پہلی اور سب سے گہری چھاپ علامہ اقبال مرحوم کے اردو کلام کی ہے۔ چنانچہ ہائی سکول کا پورا زمانہ طالب علمی (1941ء تا 1947ء) احقر نے بانگ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے اشعار پڑھتے اور گنگناتے ہوئے بسر کیا۔ جس سے ایک جذبہ ملی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا اور چونکہ اس وقت اس جذبے کے مظہر اتم کی حیثیت تحریک پاکستان کو حاصل تھی لہٰذا اس دور میں اپنی بساط کے مطابق عملی وابستگی تحریک مسلم لیگ کی تنظیم طلبہ یعنی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ساتھ رہی۔ تاہم اسی دور کے اواخر میں راقم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے بھی متعارف ہو چکا تھا اور 'الہلال' اور 'البلاغ' والے مولانا

ابوالکلام آزادمرحوم سے بھی ـــــ مولانا مودودی کی تحریروں میں سے یوں تو جو کچھ بھی اس وقت پڑھنے میں آیا بھلا ہی لگا لیکن الحمداللہ کہ ان کے ساتھ راقم کا اصل ذہنی وقلبی رشتہ، تفہیم القرآن کے ذریعے قائم ہوا جس کے ضمن میں تقسیم ہند کے قریب کے زمانے میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں تفسیر سورۂ یوسف شائع ہورہی تھی۔ اس ذہنی وقلبی تعلق کی گمبھیری کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم ملک کے ہنگاموں اور آگ اور خون کی وادیوں سے گزرکر جیسے ہی پاکستان پہنچنا نصیب ہوا، راقم ان کی تحریک سے وابستہ ہوگیا اور ایک جانب تو اس نے چند ماہ کے اندر اندر ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ اس طور سے پڑھ ڈالا کہ مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالوی کے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ ان کی تصانیف کا ''فارغ التحصیل'' ہوگیا بلکہ ان کا مدرس بھی بن گیا اور دوسری طرف زمانہ طالب علمی کے بقیہ سات سال (1947ء تا 1954ء) ان کی تحریک اسلامی کے نذر کردیئے اور اپنی بیشتر قوتیں اور توانائیاں اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ عملی وابستگی میں کھپادیں۔

اس دور کے تقریباً وسط میں (1950ـ1951 کے لگ بھگ) راقم کا ذہنی رابطہ مولانا امین احسن اصلاحی سے قائم ہوا۔ مولانا کی تحریروں کے بارے میں جماعت اسلام کے حلقوں میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ وہ ثقیل بھی ہوتی ہیں اور خشک بھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جو قلبی اُنس راقم کو اس وقت تک قرآن مجید کے ساتھ حاصل ہو چکا تھا اس کی بناء پر اسے ان تحریروں میں نہ ثقل کا احساس ہوا نہ خشکی کا۔ مولانا کی تحریریں بھی یوں تو راقم نے سب ہی پڑھ ڈالیں لیکن ان کی دو تصانیف سے تو اسے عشق کی حد تک لگاؤ ہوگیا۔ ایک 'دعوت دین اور اس کا طریق کار' اور دوسری 'تدبر قرآن' (جو اَب 'مبادی تدبر قرآن' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے) مولانا کی ان تصانیف کے مطالعے سے بلاشائبہ ریب وشک راقم کے قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی تعلق میں ایک نئے بعد وعرض (DIMENSION) کا اضافہ ہوا اور پھر جب 1954ء کے لگ بھگ مولانا کا ترجمہ کردہ ''مجموعہ تفاسیر فراہی'' شائع ہوا تب تو راقم کو تفسیر قرآن کے اس مکتب فکر کے اصل منبع و سرچشمہ تک رسائی حاصل ہوگئی فللّٰہ الحمد ـــــ اسی زمانہ طالب علمی کے دوران احقر حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے حواشی سے متعارف ہوا (یاد ہوگا، اس کا ایک نہایت اعلیٰ اور حسین وجمیل ایڈیشن کراچی کے بعض اہل خیر نے ہانگ کانگ سے طبع کرا کے مفت تقسیم کیا تھا جو

بعد میں فی نسخہ پانچ روپے سے لے کر تیس روپے تک میں فروخت بھی ہوتا رہا!) مولانا عثمانیؒ کے بظاہر حد درجہ سادہ وسلیس حواشی میں راقم کو فکر ونظر کی جو گہرائی اور گیرائی نظر آئی اور خصوصاً احوال باطنی کی جو چاشنی یا بالفاظ دیگر تصوف کی جو حلاوت محسوس ہوئی اس سے اس کی ''نسبت قرآنی'' کو بفضل اللہ تعالیٰ وعونہ عرض ثالث (THIRD DIMENSION) عطا ہوگیا ___ اور ان سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمانہ طالب علمی ہی میں اس عاجز و ناکارہ کو نہ صرف یہ کہ قرآن حکیم کے ساتھ ایک اُنس قلبی عطا ہوگیا اور مناسبت ذہنی حاصل ہوگئی بلکہ ایک نسبت روحانی بھی نصیب ہوگئی اور اس کے پڑھنے اور پڑھانے (تعلیم وتعلّم) کا ایک شدید داعیہ بھی اس کے باطن میں پیدا ہوگیا چنانچہ اوّلاً جمعیت طلبہ کے حلقوں میں اور پھر جماعت اسلامی کے ساہیوال اور اوکاڑہ کے حلقے میں اس کے درس قرآن کا چرچا ہوگیا۔ اور اس کے بارے میں بالعموم ایک خوشگوار حیرت (PLEASANT SURPRISE) کا سا تاثر ظاہر کیا جانے لگا ___ دورِ طالب علمی کے اختتام کے تقریباً معاً بعد راقم کا تعارف ایک تو ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم سے ان کی تالیف ''قرآن اور علم جدید'' کی وساطت سے ہوا اور دوسرے، ایک بالکل دوسرے علامہ اقبال سے ان کے خطبات "RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM" کے حوالے سے اور راقم کو اس اعتراف میں ہرگز کوئی باک نہیں کہ اس سے اس کے مطالعہ قرآن کو وہ بعد رابع (FOURTH DIMENSION) ملا، جس کی اہمیت زمانہ حال کے اعتبار سے پہلے تینوں اعراض وابعاد سے کسی طرح کم نہیں ___ اب خواہ اسے کوئی باندازِ تحقیر راقم کے مطالعہ قرآن کا 'حدود اربعہ' کہہ لے خواہ بطرزِ استہزاء اسے اس کا ''مبلغ علم'' قرار دے لے، بہرحال واقعہ یہی ہے کہ راقم کی قرآنی 'سوچ' کا اصل تانا بانا ان ہی ''ابعاد اربعہ'' سے تیار ہوا ہے جن کی محکم اور پختہ اساسات 1961-62ء کے آس پاس قائم ہوچکی تھیں، جبکہ راقم کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی۔ بعد کے چودہ پندرہ سالوں کے دوران اللہ کا فضل وکرم ہے کہ نہ صرف یہ کہ ان اساسات میں سے کوئی بھی منہدم تو کجا مضمحل یا شکستہ تک نہیں ہوئی بلکہ بحمد للہ چاروں ہی کو مسلسل تقویت ملتی رہی اور استحکام حاصل ہوتا رہا اور بجائے اس کے: ؏ ''جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا!'' کے مصداق کسی نئے زاویہ فکر سے متعارف ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ پچھلی سوچ اور اس سے حاصل

شدہ نتائج بالکل زائل ہوجاتے۔ اللہ کے فضل وکرم سے ہر نیا اندازِ فکر سابق فکر میں ایک ارتقائی شان پیدا کرتا چلا گیا اور یہ عمارت اپنے اطراف و جوانب سمیت بلند ہوتی گئی___ اس ہمہ جہتی استحکام وارتقاء کے ضمن میں واقعہ یہ ہے، راقم سب سے بڑھ کر مرہون منت ہے علامہ اقبال مرحوم کے فارسی کلام کا۔ جس کے اعتبار سے علامہ موصوف یقیناً ''رومی ثانی'' بھی ہیں اور مجسم ترجمان القران بھی۔ اوراس سلسلے میں شدید ناانصافی ہوگی اگر ذکر نہ کردیا جائے کہ ابتدائی پانچ سالوں کے دوران راقم کو فائدہ پہنچا مولانا برکات احمد خاں مرحوم ٹونکی ثم ساہیوالی کی ہم نشینی سے اور بعد کے دس سالوں کے دوران فیض حاصل ہوا پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور کی صحبت سے۔

الغرض___ راقم کے فکرونظر پر''هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ''کے مصداق ابتدائی اور تکمیل چھاپ تو ہے علامہ اقبال مرحوم کی___ ان میں اس ابتدائی تاثر زیادہ تر جذباتی ہے جس کا حاصل ہے جذبہ ملی اور تکمیلی رنگ خالص فکری ہے جس کا موضوع ہے فکر جدید کے پس منظر میں قرآن حکیم کا مطالعہ یا قرآن حکیم کی روشنی میں فکر جدید کا جائزہ وتجزیہ۔ اوران کے مابین رواں ہیں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ومغفور کی، قرآنی دعوت جہاد وانقلاب، اور امام حمید الدین فراہی اور مولانا امین احسن اصلاحی کے 'طریق تدبر قرآن' اور حضرت شیخ الہند اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہم کے علم راسخ کے کوثر وتسنیم ایسے چشمے____

"ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ"

راقم حیران ہے کہ کس منہ سے اور کن الفاظ میں اللہ کا شکرادا کرے۔ ایک ان پڑھ یا نیم خواندہ انسان پر جسے اپنی نسبت امیت، پر فخر ہے انعامات واکرامات کی یہ بارش! بقول مولانا محمد علی جوہر مرحوم

ع ''اک بندہ عاصی کی اور اتنی مداراتیں!

برصغیر پاک وہند کے بیسویں صدی عیسوی کے''فکر قرآنی'' کے متذکرہ بالا سلاسل اربعہ کے اعاظم رجال اور''السابقون الاولون'' کی اکثریت کا انتقال تو راقم الحروف کی پیدائش یا شعور کی عمر کو پہنچنے سے قبل ہو چکا تھا لہٰذا ان کی زیارت سے تو محرومی ہی رہی۔ البتہ ان کے متبعین باحسان کی اکثریت کے ساتھ قریبی تعلق بلکہ ذاتی ونجی روابط کی سعادت اس عاجز کو حاصل رہی ہے۔

حضرت شیخ الہند کا انتقال راقم کی پیدائش سے لگ بھگ بارہ سال قبل ہو چکا تھا اور ان

کے ساتھ راقم کا ذہنی وقلبی رشتہ کل کا کل 'غائبانہ' ہے۔ بایں ہمہ ان کی عظمت کے جونقوش اس عاجز کے قلب پر کندہ ہیں ان کو الفاظ کا جامعہ پہنانا نہایت مشکل نظر آتا ہے۔ مختصر یہ کہ راقم کو امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیت کبریٰ کا عکس کامل ان کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ امام الہندؒ کی جامعیت کا مظہر ان کا تصانیف ہیں اور شیخ الہندؒ کی جامعیت کا ظہور ان کے تلامذہ میں ہوا۔ اگر یہ اصول درست ہے اور لازماً درست ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، تو ذرا پہچاننے کی کوشش کیجئے اس شخص کی عظمت کو جس کا جانشین جہاد حریت اور تحریک استخلاص وطن کے میدان میں ہوا، مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسا مجاہد اعظم اور حدیث، فقہ، اصول اور کلام کے میدان میں ہوا، مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ ایسا نابغہ روزگار انسان اور جس کے فہم قرآن اور جذبہ ملی کا ظہور ہوا مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی عظیم شخصیت میں اور جس کے انقلابی کردار نے روپ دھارا مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم ایسے سیماب وش انسان کا۔ راقم کا ذاتی احساس یہ ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کو ان کے اپنے حلقے کے لوگوں نے بھی کما حقہ نہیں پہچانا ___ ورنہ ذرا غور کیا جائے تو اس میں کیا شک وشبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد وہ ہیں! ___ واللہ اعلم!

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا انتقال تو اگرچہ راقم کے سن شعور کو پہنچنے کے بعد ہوا لیکن افسوس کہ ان کی زیارت سے بھی محرومی ہی رہی۔ تاہم ایک خیال اطمینان قلب کا موجب بنتا ہے اور وہ یہ کہ اگر ذرے کو آفتاب سے کوئی نسبت ہوسکتی ہے تو اس عاجز کو بھی ان کے ساتھ ایک نسبت معنوی حاصل ہے۔ بایں طور کہ جب وہ تحریک پاکستان کے صف اوّل کے قائد کی حیثیت سے ہندوستان کے طول وعرض کا دورہ کر رہے تھے تو یہ خاکسار بھی خواہ ایک طفل مکتب کی حیثیت ہی سے سہی، مشرقی پنجاب کے ایک ضلع (حصار) کے مختلف قصبات (سرسہ، ہانسی وغیرہ) کے ہائی سکول کے طلبہ کے مابین ایک رابطہ استوار کرنے کی سعی میں مشغول تھا ___ بعدازاں ان کے تفسیری حواشی کی بدولت ان کی جو معنوی صحبت حاصل رہی اس کا ذکر اوپر ہو ہی چکا ہے۔

مولانا عثمانیؒ کے رفیق کار اور معتمد خاص مولانا مفتی محمد شفیعؒ سے ملاقات کا شرف البتہ راقم کو حاصل رہا اور ان کی شفقت ومحبت سے بھی اس عاجز نے حصہ پایا۔ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگرد رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی نیازمندی کی سعادت بھی راقم کو حاصل رہی اور ان کی شفقت

اور نظر کرم بھی اس ناچیز کا سرمایہ افتخار رہی۔ حضرت شیخ الہندؒ کے فیض کے دوسرے دو چشموں سے بھی راقم بحمد للہ بیگانہ و نابلد نہیں۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مولانا سید حامد میاں مدظلہ اور مولانا سندھی مرحوم کے شاگرد رشید مولانا احمد علی لاہوریؒ کے خلف الرشید مولانا عبید اللہ انورؒ کی نیاز مندی اور گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضری کا شرف بھی راقم کو حاصل رہا گویا: ''الراسخون فی العلم'' کے اس سلسلے کے ساتھ راقم کا معاملہ اس عربی شعر سے مصداق رہا کہ:

اُحِبُّ الصَّالِحِیْنَ وَ لَسْتُ مِنْھُمْ لَعَلَّ اللّٰہَ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

علامہ اقبال کے انتقال کے وقت راقم کی عمر چھ برس تھی لیکن اب یہ بات خود اس عاجز کو نہایت عجیب اور حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ ان کے انتقال کو راقم نے ایک ذاتی صدمے کی حیثیت سے محسوس کیا تھا۔ اس کی ایک ہی توجیہ ممکن ہے اور وہ اس حدیث نبوی ﷺ کی روشنی میں کہ اس عالم فانی میں آنے سے قبل عالم ارواح میں جن ارواح کے مابین اُنس پیدا ہو جاتا ہے ان کے مابین مودّت کا رشتہ اس عالم اجساد میں بھی برقرار رہتا ہے ____ بہر حال علامہ مرحوم کے ساتھ راقم کا قلبی تعلق کم وبیش ''من المهد الى اللّحد'' والا ہے۔ اور اوپر عرض کیا ہی جا چکا ہے کہ راقم کے شعور کی تحتانی سطحوں میں سے سب سے نچلی تہہ پر نقوش ثبت ہیں علامہ مرحوم کے اردو اشعار کے اور اس کے فکر کی بلند ترین سطح پر کندہ ہیں نقوش ان کے فارسی کلام کے۔

یہی وجہ ہے کہ جب راقم کی ملاقات فلسفہ اقبال کے مدون وشارح اور 'حکمت اقبال' کے مصنف ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم سے ہوئی تو دونوں ہی نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دوسرے سے بہت پہلے سے واقف ہیں اور جب بھی گفتگو ہوئی یہی محسوس ہوا کہ:

ع دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

1967ء سے 1969ء تک تقریباً ڈھائی سال نہایت قریبی تعلق راقم کو ڈاکٹر صاحب مرحوم سے حاصل رہا۔ ('میثاق' کے اس دور کے فائل اس پر شاہد عادل ہیں) اس زمانے میں ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام'' راقم کے قلم سے نکل کر شائع ہو چکا تھا۔ اس کی حرف بحرف تصویب ڈاکٹر صاحب نے فرمائی اور ''میثاق'' کے لیے اپنی تصنیف MANIFESTO OF

ISLAM کا ترجمہ اردو میں خود ہی کرنا شروع کر دیا۔ جس کی چند ہی قسطیں چھپنے پائی تھیں کہ:

ع ''آں قدح بشکست وآں ساقی نماند''

والا معاملہ ہو گیا۔ یغفر اللّٰہ لنا ولہ ویدخلہ فی رحمتہ۔

اسی طرح کلام اقبال کے شارح پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور سے جو ذاتی ربط وتعلق 1966ء میں استوار ہوا تھا۔ وہ بحمد للہ ان کی وفات تک قائم رہا (یہاں تک کہ بعض واقفینِ حال تو واقعتہً حیرت کا اظہار کرتے رہے کہ پروفیسر صاحب ایسے نازک طبع اور تنک مزاج بزرگ سے راقم کا تعلق کیسے نبھ رہا ہے) پروفیسر صاحب نے راقم کی تحریر ''نشاۃ ثانیہ کرنے کا اصل کام'' کی جو مفصل تائید وتحسین تحریر کی تھی وہ تو بہت سے لوگوں کے علم میں ہے، زبانی جو کچھ فرمایا تھا اسے اس خوف سے نقل نہیں کر سکتا کہ اسے خودستائی پر محمول کیا جائے گا۔

حصّہ پنجم
ڈاکٹر محمد رفیع الدین
اقبال شناس
و
شارح اقبال

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
کی کتاب
'حکمت اقبال'
کا
دیباچہ

151

1 دیباچہ

’حکمت اقبال‘

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب

عرصۂ دراز تک اقبال کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اقبال کے تصورات علمی اور عقلی اعتبار سے نہایت برجستہ، زوردار، درست اور ناقابل تردید ہیں اور اگرچہ یہ تصورات اس کی نظم ونثر کی کتابوں میں جابجا بکھرے ہوئے پڑے ہیں تاہم ان میں ایک علمی اور عقلی ربط موجود ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب صرف ایک تصور سے ماخوذ ہیں جسے اقبال خودی کا تصور کہتا ہے۔ لہٰذا اقبال کی تشریح کا مطلب یہ ہونا چاہیے کہ خودی کے مرکزی تصور کے ساتھ اس کے دوسرے تمام تصورات کے علمی اور عقلی ربط کو واضح کیا جائے اور اگر ایسا کرنے کے بغیر اس کی کوئی تشریح کی جائے گی تو وہ مسلمانوں کے لیے بالعموم اور غیر مسلموں کے لیے بالخصوص پوری طرح سے قابل فہم اور تسلی بخش نہیں ہو سکے گی۔ دراصل اس وقت بھی اقبال کے خیالات کے متعلق جس قدر غلط فہمیاں مسلمانوں یا غیر مسلموں میں پائی جاتی ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ اقبال کے خیالات کی علمی اور عقلی ترتیب اور تنظیم مہیا نہیں کی گئی۔ دوسرے الفاظ میں میرا نتیجہ یہ تھا کہ اقبال کا فلسفہ دنیا کے اور بڑے بڑے فلسفوں کی طرح بالقوہ انسان اور کائنات کا ایک مکمل اور مسلسل فلسفہ ہے جس کا امتیازی وصف یہ ہوتا ہے کہ اس کے تصورات میں ایک عقلی یا منطقی ترتیب اور تنظیم موجود ہوتی ہے جو اسے مؤثر اور یقین افروز بناتی ہے اور اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اقبال کے تصورات کی مخفی عقلی ترتیب اور تنظیم کو آشکار کر کے اس کے فکر کو ایک مکمل نظامِ حکمت (Philosophical System) کی شکل دی جائے تاکہ وہ نہ صرف پاکستان کے اندر

پوری طرح قابل فہم بن جائے بلکہ دنیا کے آخری باطل شکن عالمگیر فلسفہ کی حیثیت سے دنیا کے علمی حلقوں میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔لہٰذا میں نے ارادہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہو خدا کی توفیق سے اس کام کو انجام دینے کی کوشش کی جائے۔ظاہر ہے کہ یہ نہایت ضروری تھا کہ اس کام کو انجام دینے کے لیے جو کتاب لکھی جائے اس میں ذیل کے راہ نما اصولوں کو شروع ہی سے مدنظر رکھا جائے:

اوّل: ایک فلسفہ یا نظامِ حکمت اشخاص کی سند یا شہادت پر مبنی نہیں ہوتا بلکہ علمی حقائق اور عقلی استدلال پر اپنا دار و مدار رکھتا ہے۔اس کے کسی تصور کو اس لیے نہیں مانا جاتا کہ کوئی شخص اس کی حمایت یا سفارش کر رہا ہے بلکہ اس لیے مانا جاتا ہے کہ وہ ایسے علمی حقائق پر مبنی ہے جو معلوم اور مسلم ہیں یا جن کے عقب میں ایسا زوردار عقلی استدلال موجود ہے جو ان سے انکار کی گنجائش باقی نہیں رہنے دیتا۔اگر فلسفہ میں سند یا شہادت پیش کی جائے تو وہ صرف مؤثر علمی اور عقلی استدلال کے بعد اس کے نتائج کی تائید مزید کے لیے ہی ہوسکتی ہے اور وہ بھی فلسفی کی اپنی نہیں بلکہ ایسے دوسرے اشخاص کی سند یا شہادت ہی ہوسکتی ہے جن کے فکر کی عظمت پہلے سے مسلم ہو۔جس طرح ہیگل یا کسی اور فلسفی نے اپنے کسی حکیمانہ نکتہ کو ثابت کرنے یا لوگوں سے منوانے کے لیے کبھی اپنا ہی کوئی قول بطور دلیل پیش نہیں کیا۔ہم بھی اقبال کے نظامِ حکمت کی تدوین کرتے ہوئے اقبال کے کسی حکیمانہ نکتہ کو ثابت کرنے یا لوگوں سے منوانے کے لیے خود اقبال کا ہی کوئی قول بطور دلیل پیش نہیں کر سکتے۔اور خود اقبال نے بھی اپنے تصورات کی صداقت کو ثابت کرنے کے لیے کبھی اپنے قول کو بطور دلیل کے پیش نہیں کیا بلکہ قوانین قدرت اور حقائق علمی کی طرف اشارے کیے ہیں۔لہٰذا اقبال کے نظامِ حکمت کی تدوین کے لیے جو کتاب لکھی جائے گی اس میں اقبال کا حوالہ نہیں دیا جائے گا بلکہ فقط علمی حقائق اور عقلی استدلال کی مدد سے اقبال کے تصورات کی صحت اور معقولیت کو ثابت کیا جائے گا۔

دوم: اقبال کے تصورات کو علمی اور عقلی اعتبار سے مرتب اور منظّم کرنے اور ان کی صحت اور معقولیت کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہوگا کہ تمام ایسے علمی حقائق کو اُن کی عقلی اور علمی بنیادوں کے سمیت کام میں لایا جائے جو آج تک دریافت ہو چکے ہیں اور اقبال کے تصورات کی تائید کرتے ہیں خواہ ان کو دریافت کرنے والا فلسفی یا سائنس دان کوئی ہو اور دنیا کے کسی خطہ سے تعلق

رکھتا ہو۔

سوم: ان تمام حکیمانہ تصورات ونظریات کو علمی اور عقلی اعتبار سے غلط ثابت کیا جائے گا جو اقبال کے فکر اور اس کے مضمرات سے ٹکراتے ہیں کیونکہ وہ درحقیقت صحیح نہیں ہیں اور معقول استدلال کی روشنی میں ان کو غلط ثابت کیا جا سکتا ہے۔ایسا کرنے کے بغیر اقبال کے اپنے حکیمانہ تصورات کی صحت اور معقولیت کی پوری پوری وضاحت نہ ہو سکے گی اور لوگوں کو معلوم نہ ہو سکے گا کہ آیا کسی خاص فلسفیانہ مسئلہ کے متعلق صحیح نقطۂ نظر اقبال کا ہے یا اُن نظریات کا جو اس کے فکر کے بالمقابل ہیں اور اگر صحیح نقطۂ نظر اقبال کا ہی ہے تو اس کی علمی اور عقلی وجوہات کیا ہیں۔

چہارم: کتاب انگریزی زبان میں ہوگی۔تا کہ دنیا کے علمی حلقوں میں اقبال کے فلسفہ کو پڑھا اور پرکھا جا سکے۔دوسرے فلسفوں کے بالمقابل اس کے علمی مقام کو معین کیا جا سکے اور اس کی معقولیت اور عظمت کو تسلیم کیا جا سکے۔

ان راہ نما اصولوں کی روشنی میں اقبال کے نظامِ حکمت کی تدوین کے لیے جو کتاب لکھنے کی توفیق مجھے خدا نے عطا کی اس کا نام آئیڈیا لوجی آف دی فیوچر (IDEOLOGY OF THE FUTURE) ہے۔یہ کتاب جون 1942ء میں مکمل ہوئی تھی اور اگست 1946ء میں طبع ہوئی تھی۔اس کتاب کی اشاعت کے قریباً بیس سال بعد میں نے ان ہی راہ نما اصولوں کی روشنی میں فلسفہ تعلیم پر اس کتاب کے ایک باب کی مزید تشریح اور توسیع کر کے ایک اور کتاب لکھی جس کا نام تعلیم کے ابتدائی اصول (FIRST PRINCIPLES OF EDUCATION) ہے۔دراصل میری سادہ تحریریں ''آئیڈیا لوجی آف دی فیوچر'' (یعنی اقبال کے فلسفہ خودی) کے تصورات اور موضوعات کی مزید تشریح اور توسیع کے طور پر لکھی گئی ہے۔

چونکہ اقبال نے اپنے فلسفہ خودی کے ذریعے سے ہی اسلام کی فلسفیانہ تشریح کی ہے اور فلسفہ خودی اسلام ہی کا فلسفہ ہے لہٰذا اگر میری کتاب ''آئیڈیا لوجی آف دی فیوچر'' اقبال کا نظامِ حکمت ہے تو پھر وہ معاً اسلام کا نظام حکمت بھی ہے۔لیکن چونکہ یہ کتاب بظاہر مطلق فلسفہ کی کتاب ہے جس میں نہ تو اقبال کا کوئی حوالہ ہے اور نہ قرآن وحدیث کا۔اس لیے اس کو پڑھنے والے اسے بالعموم فلسفہ اقبال یا فلسفہ اسلام کی حیثیت سے نہیں بلکہ مطلق فلسفہ کی حیثیت سے پڑھتے رہے

ہیں۔لہٰذا اس کتاب کی اشاعت کے بعد بھی ایک طرف اقبال کے چاہنے والوں کی یہ شکایت باقی رہی کہ اقبال پر لکھنے والوں میں سے کسی نے اقبال کے فلسفہ خودی کو ایک مسلسل عقلی نظام کے طور پر پیش نہیں کیا یا اس کی مکمل تشریح نہیں کی اور دوسری طرف اسلام سے دلچسپی رکھنے والے بھی بدستور یہ کہہ رہے ہیں کہ اس دور میں اسلام سے برگشتہ تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اور غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے تعلیماتِ اسلام کی علمی اور عقلی بنیادیں واضح کرنے اور لہٰذا اسلام کو ایک نظام حکمت کے طور پر پیش کرنے کی شدید ضرورت ہے۔اس صورت حال کی بنا پر میں نے سمجھا کہ ہماری قوم کے ذوق کے پیش نظر اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ اقبال کے فلسفہ خودی پر دو اور کتابیں لکھی جائیں جن میں سے ایک تو ایسی ہو کہ اس میں فلسفہ خودی کو قرآن اور حدیث کے حوالوں کے ساتھ اسلام کے ایک فلسفہ کے طور پر پیش کیا جائے اور دوسری ایسی ہو کہ اس میں فلسفہ خودی کو اقبال کے حوالوں کے ساتھ اقبال کے فلسفہ کے طور پر پیش کیا جائے۔خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ان دونوں کتابوں کے لکھنے کی توفیق دی۔پہلی کتاب جس کا عنوان ''قرآن اور علم جدید'' ہے، میں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے لیے 1951ء میں لکھی تھی اور دوسری کتاب ''حکمت اقبال'' کے نام سے اب پیش کر رہا ہوں۔حاصل یہ ہے کہ جس حد تک مجھے خدا کی توفیق حاصل ہوئی ہے میں نے یہ تینوں کتابیں اس طرح سے لکھی ہیں کہ مجھے امید ہے کہ جو احباب اقبال کے فلسفہ خودی کا یا اسلام کا مطالعہ ایک خالص اور منظّم فلسفہ یا سائنس کے طور پر کرنا چاہتے ہیں وہ میری کتاب ''آئیڈیالوجی آف دی فیوچر'' کا مطالعہ مفید مطلب پائیں گے (اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور ہیں) اور جو فلسفہ خودی کا مطالعہ اسلام کے ایک فلسفہ کے طور پر کرنا چاہتے ہیں وہ میری کتاب ''قرآن اور علم جدید'' کا مطالعہ دلچسپی کا باعث پائیں گے اور پھر جو فلسفہ خودی کا مطالعہ اقبال کے حوالوں کی روشنی میں اقبال کے فلسفہ کے طور پر کرنا چاہتے ہیں وہ زیر نظر کتاب ''حکمت اقبال'' کا مطالعہ مدعا کے مطابق پائیں گے۔امید ہے کہ جو احباب ان تینوں کتابوں کا مطالعہ کریں گے وہ دیکھیں گے کہ فلسفہ خودی کی مفصل تشریح کی حیثیت سے یہ تینوں کتابیں ایک دوسرے کی کمی کو بھی پورا کرتی ہیں۔

غیروں کی تعلیم سے قوم کے نظریاتی وجود کا فنا ہونا

جس حد تک نظریاتی مسلک والی کوئی قوم دوسری قوم کی تبلیغ سے متأثر ہوجاتی ہے، اسی حد تک اس کا اپنا وجود معدوم ہوجاتا ہے، بلکہ اس میں ضعف پیدا ہوجاتا ہے اور وہ اس کا مزید اثر قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوجاتی ہے۔ رفتہ رفتہ بیرونی تعلیم کا مواد اندرونی نظامِ تعلیم میں راہ پا جاتا ہے اور وہ روز بروز اپنا نفوذ بڑھاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ سرتاپا چھا جاتا ہے۔ اس سے سمجھنا چاہیے کہ عملاً قوم کا ذہنی ارتداد مکمل ہوگیا اور اس نے غیر مسلک کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ کسی قوم کا نظریاتی وجود ختم ہوجانا، علامت ہے کہ سیاسی وجود پہلے ہی مٹ چکا ہے یا جلد ہی مٹنے والا ہے۔ کوئی نظریاتی قوم اگر چاہے کہ جو ہے وہی رہے اور اپنا وجود فنا نہ ہونے دے تو اس کو اسی پر بس نہ کرنا چاہیے کہ گھر کے اندر جو نظامِ تعلیم جاری ہے، وہ اٹھتی ہوئی نسل میں جماعت کے نظریاتی مسلک کے ساتھ محبت پیدا کرنے کا ضامن ہو بلکہ یہ فکر بھی رکھنی چاہیے کہ کسی غیر جماعت یا جماعتوں کے نظریات اس محبت میں تخفیف یا نقص پیدا نہ کرنے پائیں۔ بدن کی صحت تقاضا کرتی ہے کہ بدن کو تمام بیماریوں کے مہلک جراثیم سے محفوظ و مامون رکھا جائے، اسی طرح نفسیاتی ارتقاء چاہتی ہے کہ تمام اجنبی تصورات کے مضر اثرات سے نفس کو محفوظ و مامون رکھا جائے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے تعلیمی نظریات کا خلاصہ ''قومی تعمیر و زوال میں نظام تعلیم کا کردار'' حافظ محمد موسیٰ بھٹو

2

ڈاکٹر محمد رفیع الدین __ مقام و مرتبہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ـــــ مقام و مرتبہ

ڈاکٹر شفیق عجمی

کی کتاب ''علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین'' سے ماخوذ و تلخیص

اقبال کی فکری و شعری کاوشوں پر مشرق و مغرب کے گہرے اثرات کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے جو نا قابل تردید ثبوت ہے اس حقیقت کا کہ ایک نظریۂ حیات کے ساتھ کامل وابستگی کے باوجود بھی انھوں نے حکمت و دانش کے سرچشموں سے فیض حاصل کرتے ہوئے کسی تہذیبی تفاوت کو اپنے رستے میں حائل ہونے نہیں دیا جو یقینی طور پر ایک اہم سبب ہے کہ مشرق و مغرب میں ان کے افکار کو یکساں پذیرائی حاصل ہوئی ہے اور تہذیبی و جغرافیائی سطح سے بلند ہو کر ان کی فکری عظمت و رفعت کو تسلیم کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں اقبال شناسی کی ایک عالمی روایت مستحکم ہوتی چلی گئی ہے۔

گزشتہ اوراق میں اقبال شناسی کی اسی عالمی روایت کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے جہاں مغرب میں پروفیسر آر۔ اے نکلسن، پروفیسر اے۔ جے آربری، ہربرٹ ریڈ، ڈاکٹر این میری شمل، ایساندرو بوسانی، ڈاکٹر شیلا میکڈونا، لوئی میسنون، ایوا ماریوچ، لوس کلوڈ میتج، یاں ماریک، باربرا مٹکاف: روس میں نتالیا پری گارینا، ستے پین ینتس، ڈاکٹر سخاچوف اور گورڈن پولونسکا یا، ہمسایہ ملک بھارت میں ڈاکٹر یوسف حسین خان، ڈاکٹر سچدانند سنہا، مولانا عبدالسلام ندوی، میکش اکبر آبادی، ڈاکٹر عشرت حسن انور، ڈاکٹر میرولی الدین، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر غلام عمر، عالم خوندمیری، آصف جاہ کارروانی، علی سردار جعفری، آل احمد سرور، اسلوب احمد

انصاری، عتیق صدیقی، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر عبدالمغنی، مظفر حسین برنی، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر عبدالحق، پروفیسر جگن ناتھ آزاد: عالم اسلام میں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام، ڈاکٹر طٰہٰ حسین، عباس محمود العقاد، ڈاکٹر حسین مجیب المصری، ڈاکٹر علی نہاد تارلان، ڈاکٹر عبدالقادر قرہ خاں، محیط طباطبائی، ڈاکٹر غلام حسین یوسفی، آقائے سعید نفیسی، احمد علی رجائی، سلام رضا سعیدی، ڈاکٹر علی شریعتی، آیت اللہ العظمٰی خامنہ ای، اور اقبال کے تصور کے اساس پر قائم ہونے والی مملکت پاکستان کے سیکڑوں اقبال اسکالرز میں سے عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، طاہر فاروقی، نذیر نیازی، خلیفہ عبدالحکیم، عزیز احمد، یوسف سلیم چشتی، رضی الدین صدیقی، عاشق حسین بٹالوی، پروفیسر حمید احمد خان، مولانا صلاح الدین احمد، سید عابد علی عابد، صوفی غلام مصطفٰے تبسم، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر عبادت بریلوی، علی عباس جلالپوری، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، پروفیسر بشیر احمد ڈار، پروفیسر منور مرزا، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، سلیم احمد، ایوب صابر، ڈاکٹر سعید اختر درانی و دیگر اصحاب کی اقبالیاتی تحقیقات وتشریحات پر ایک نظر ڈالی گئی ہے تاکہ پوری بیسویں صدی پر پھیلی ہوئی اس علمی روایت میں، جو اکیسویں صدی میں بھی ایک تسلسل کے ساتھ آگے کی جانب رواں ہے، ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبالیاتی خدمات سے روشناس ہوا جاسکے۔

اقبال شناسی کی روایت میں افکار اقبال کی تفہیم وتشریح اور توضیح وتوسیع کے سلسلے میں مختلف مکاتب فکر اور انفرادی علمی کاوشوں کا نہ صرف تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے بلکہ محض عقیدت وتعصب پر مبنی تحریروں کے انبار میں سے خالصتاً علمی وتحقیقی جواہر پاروں کی پرکھ کی سعی بھی کی گئی ہے تاکہ ان کی حقیقی قدر وقعت کا نہ صرف احساس پیدا ہوسکے بلکہ علمی دنیا میں سے ایسے باکمال صاحب نظر اس روایت کو میسر آسکیں جو اس کو نئی رفعتوں سے ہمکنار کرنے میں اپنا کردار ادا کرسکیں۔

اقبال شناسی کی روایت کے نمائندہ محققین اور شارحین کی تحقیق وتشریح سے یہ آگہی بھی حاصل ہوتی ہے کہ فکر اقبال کی اساس، مرکز یا محور تصور خودی ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان ہوں یا ڈاکٹر عابد حسین، عشرت حسن انور ہوں یا ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، آصف جاہ کاروانی ہوں یا میکش اکبرآبادی، یوسف سلیم چشتی ہوں یا پروفیسر عثمان، ڈاکٹر شمل ہوں یا نتالیا پری گارینا، ثاقب رزمی

ہوں یا ڈاکٹر عبدالمغنی یا پھر ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ان سب نے فکر اقبال کو موضوع بناتے ہوئے اوّلاً خودی کی اساسی حیثیت کو تسلیم کیا ہے اور ثانیاً اسی کی روشنی میں اقبال کے نظامِ فکر اور اسی سے متعلق دیگر تصورات کی تفہیم کی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے نزدیک، اقبال کے مابعد الطبیعی تصورات کا مرکزی نقطہ خودی ہے۔ سیّد عابد حسین بھی خودی کو اقبال کے فلسفہ حیات و کائنات کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ عشرت حسن انور کی تحقیق کا حاصل بھی یہی ہے کہ اقبال کے فلسفے کی اصل خودی ہے جو ان کی فکر کا نقطۂ آغاز بھی ہے اور بنیادی نکتہ بھی۔ خلیفہ عبدالحکیم افکار اقبال کی گونا گونی اور بوقلمونی کو تسلیم کرتے ہیں لیکن جس طرح سے کائنات کی کثرت میں ایک وحدت مضمر ہے اسی طرح افکار اقبال میں بھی ایک وحدت موجود ہے اور خودی جس کا خاص مضمون ہے۔ ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی کے مطابق بھی نظریۂ خودی ان کی جملہ نگارشات کا مرکزی نقطہ اور محوری خیال ہے جسے اگر ان کی تحریروں میں سے خارج کر دیا جائے تو پھر کچھ باقی نہیں رہتا۔ ڈاکٹر این میری شمل کا دعویٰ ہے کہ اقبال کے فلسفے اور علم کلام (دینی افکار) کا مرکزی نقطہ یہی احساسِ خودی اور تعین ذات ہے جو ان کی پہلی مثنوی (اسرار خودی) ہی میں بیان نہیں ہوا بلکہ وہ تمام عمر اس کی تبلیغ میں مصروف رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبد المغنی کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ اقبال کے نظام فکر کی اساس ان کا تصور خودی ہے جسے انھوں نے ایک نظریے کے طور پر تقریباً چالیس سال تک تسلسل اور تواتر کے ساتھ متنوع انداز اور مختلف جہتوں سے پیش کیا جبکہ ڈاکٹر محمد رافیع الدین کے نزدیک اقبال کے تمام حکیمانہ افکار کا سرچشمہ تصور خودی ہے جس کی حقیقت خدا کی محبت کا شدید جذبہ ہے۔

افکارِ اقبال میں خودی کی بنیادی حیثیت اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اثبات خودی کو تسلیم کرنے کا مطلب یقیناً ایسے تمام مکاتب فکر اور ان کے نظریات کی نفی ہے جو خودی اور کائنات کی نفی کرتے ہوئے اسے غیر حقیقی اور اعتباری قرار دیتے ہیں گویا اقبال کا تصور خودی، نفیٔ خودی کی نفی سے عبارت ہے۔ وہ بار بار اس امر کا اعلان کرتے ہیں کہ انسان کا مذہبی اور اخلاقی منتہائے مقصود یہ نہیں کہ وہ اپنی ہستی کو مٹائے، اس کی نفی کرے یا اپنی خودی کو فنا کر دے بلکہ یہ کہ وہ اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

خودی اور اثباتِ خودی کے بعد جس نکتہ پر محققین وشارحین اقبال کا اتفاق ہے وہ قرآنی تعلیمات کا اثر ہے جو اس تصور کے منابع میں ایک اہم اور بنیادی عامل کی حیثیت رکھتا ہے جس کی وضاحت خود اقبال نے یوسف سلیم چشتی کے استفسار پر کی تھی اور جس کا تفصیلی تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ لیکن اقبال کے فکری ارتقاء میں قرآنی اثرات کے علاوہ مشرق ومغرب کے دیگر فلاسفہ کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور اس کی تصدیق عشرت حسن انور، ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی، خلیفہ عبدالحکیم اور جگن ناتھ آزاد کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر عشرت حسن انور اس تیقّن کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال جدید فلسفہ سے فیض حاصل کیا ہے۔ خصوصاً کانٹ کے بعد کا جدید فلسفہ جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے عملی یا تجربی حیثیت کا حامل ہے اور اسلام کی روح سے بھی مطابقت رکھتا ہے۔ اقبال کانٹ اور برگساں کی طرح حقیقت کے ادراک میں عقل وفکر کی نارسائی کے قائل ہیں۔ لیکن یہ نتیجہ ان حکمائے مغرب کی پیروی کا حاصل نہیں، نہ ہی وہ حکمت مغرب کو اپنے طریق پر پرکھے بغیر تسلیم کرتے ہیں خواہ وہ نطشے کا فلسفہ خودی ہو جو اقبال کے نزدیک سراسر سلبی نوعیت رکھتا ہے، اور جس کی بنیاد پر کوئی اعلیٰ معاشرتی نظام قائم نہیں ہوسکتا اور نہ اس کے فوق البشر کی قہاری اور جباری مثبت قدروں کے فروغ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ یہ درست ہے کہ فلسفہ خودی کے بعض اجزا مغربی فلاسفہ LEIBNIZ، NIETZSCHE، FICHTE اور JAMES WARD وغیرہم کے اثرات کا سراغ ملتا ہے۔ لیکن اقبال نے ان کے نقائص کو دور کر کے اسلام اور مسلم صوفیاء کی تعلیمات سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

ڈاکٹر آصف جاہ کاروانی نے اقبال کے فلسفہ خودی کے ماخذ پر مدلل بحث کی ہے اور اس حوالے سے ان مکاتب کو ہدفِ تنقید بنایا ہے جو اقبال کے نظریات کو ان کے ذاتی مشاہدات اور تجربات کا نتیجہ سمجھتے ہیں یا پھر ان نظریات کا واحد منبع قرآنی تعلیمات کو قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر کاروانی کے نزدیک ایسے تمام اصحاب حقیقت سے دور ہیں کیونکہ اقبال نے خود خطبات میں وضاحت کی ہے کہ گذشتہ پانچ سو سالوں سے اسلامی فکر تقریباً ساکت وجامد ہے۔ ایک وقت تھا کہ مغربی فکر نے اسلامی دنیا سے استفادہ کیا تھا لیکن موجودہ دور میں اسلامی دنیا روحانی طور پر بڑی سرعت کے ساتھ مغرب کی طرف بڑھ رہی ہے اور اس تحریک میں کوئی قباحت بھی نظر نہیں آتی۔

خدشہ صرف یہ ہے کہ یہ تحریک مغربی تمدن کی روح تک پہنچنے کی بجائے کہیں صرف اس کی ظاہری چمک تک پہنچ کر نہ رک جائے۔ حکیم آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت نے کائنات کا نیا تصور پیش کر کے (فلسفہ و مذہب) کے مسائل کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے لیے رستہ ہموار کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ جاننا ضروری ہو گیا ہے کہ مغرب کی فکری تحریکات کے نتائج کی روشنی میں، اسلامی فکر کی ازسرِ نو تشکیل میں کیا مدد مل سکتی ہے۔ ڈاکٹر کاروانی خطبات کے پیش لفظ کو بنیاد بناتے ہوئے کہ جس میں اقبال نے اپنا یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ فکر و خیال کی دنیا میں قطعیت کسی چیز کو حاصل نہیں ہوتی اور جیسے جیسے علم و فکر کو ترقی حاصل ہوتی چلی جائے گی زیادہ بہتر اور مؤثر خیالات سامنے آتے چلے جائیں گے، یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اقبال نے اپنے نظریات کی تشکیل کے لیے مشرق و مغرب کے قدیم و جدید افکار سے استفادہ کیا ہے۔

ڈاکٹر کاروانی نے مشرقی مصادر میں سے قرآن کریم، بھگوت گیتا، روحانیت، مولانا روم، ابن سینا اور امام غزالی کی تعلیمات اور مفکرین مغرب میں سے نطشے، ہیگل، مارکس، برگساں اور آئن سٹائن کے تصورات کو خودی کے اہم مآخذ میں شمار کیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم کی حیثیت ایک ایسے اقبال شناس کی ہے جو خود اقبال کی طرح مشرق و مغرب کے فلسفیانہ نظریات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اقبال کے فکری سرچشموں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتے کہ وہ ایک مخصوص نظریۂ حیات پر کامل یقین رکھتے ہوئے نہ صرف معاصر فلسفیانہ نظریات سے پوری آگہی رکھتے ہیں بلکہ نطشے، فختے، برگساں اور ولیم جیمز سے بہت کچھ اخذ و قبول بھی کرتے ہیں لیکن اس عمل میں صرف وہی عناصر ان کے معیارِ قبولیت پر پورا اترے ہیں جو ان کے مخصوص نظریۂ حیات سے بھی مطابقت رکھتے ہیں جبکہ اس سے متصادم عناصر کو مسترد کرتے ہوئے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ اخذ و اکتساب کے اس عمل سے اقبال کی فکری عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

اس ضمن میں جگن ناتھ آزاد کا نقطہ نظر بھی خلفیہ عبدالحکیم سے مختلف نہیں جبکہ بعض اصحاب خلیفہ صاحب کی ایسی متوازن رائے کو بھی اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ اقبال کا نظریۂ خودی بہ تمام و کمال فختے سے ماخوذ نظر آتا ہے۔

اقبال کی عبقریت کا یہ ایک تقاضا تھا کہ انھوں نے حکمت کی گمشدہ میراث کی جستجو میں مشرق و مغرب کے فکری سرچشموں سے بھی فیضان حاصل کیا لیکن اس جستجوئے علم میں نہ تو کسی تعصب کو حائل ہونے دیا نہ ہی اپنے پرکھ کے معیار سے کبھی دست کش ہونے کے لیے تیار ہوئے، لیکن اقبال شناسی کی روایت میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین اس حوالے سے ایک استثناء کی حیثیت رکھتے ہیں کہ انھوں نے اقبال کے تصورِ خودی کی مدلل اور مفصل تشریح و تفسیر کرتے ہوئے دیگر شارحین و محققین اقبال کے برعکس قرآنی تعلیمات کو تصور خودی کے صرف ایک ماخذ کا درجہ دینے کی بجائے تصورِ خودی کو کلی طور پر اسلام کی ایک حکیمانہ توجیہ قرار دیا ہے اور ''حکمت اقبال'' کے تمام مباحث کی بنیاد اسی دعوے پر قائم ہے بلکہ حکمت اقبال کے انتساب کو بھی اس دعوے کے ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتا ہے کہ جس کے مطابق: ''ان عاشقان جمال ذات کے نام جو مستقبل کی اس ناگزیر عالمی ریاست کا آغاز کریں گے جو اسلام کی حکیمانہ توجیہ پر قائم ہوگی جس کا نام فلسفہ خودی ہے''۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک اقبال نے فلسفہ خودی کے ذریعے سے اسلام ہی کی فلسفیانہ تشریح و توضیح پیش کی ہے اور فلسفہ خودی، اسلام ہی کا فلسفہ ہے اور خود ان کی اپنی تین اہم تصانیف: (ا)IDEOLOGY OF THE FUTURE (ب) قرآن اور علم جدید، اور (ج) حکمت اقبال بھی دراصل فلسفہء خودی ہی کی فکری، قرآنی اور اقبالیاتی تشریح کا درجہ رکھتی ہیں۔ بالخصوص ''حکمت اقبال'' کے طویل مباحث کا حاصل درج ذیل نکات کو قرار دیا جا سکتا ہے:

1۔ اقبال کا فلسفہ خودی ایک مربوط نظامِ فکر یا نظامِ حکمت ہے۔
2۔ اقبال کے نظامِ حکمت کی بنیاد اس کے تصور کائنات پر قائم ہے۔
3۔ اقبال کا تصور کائنات دراصل تصور وحدتِ کائنات پر استوار ہے۔
4۔ اقبال وحدتِ کائنات کی حقیقت تک اپنے وجدان کے ذریعے سے پہنچے ہیں۔
5۔ حکمت اقبال یا حکمت کائنات کا مرکز خدا کا تصور ہے جس کے دو پہلو ہیں:

اولاً یہ کہ خدا انسان کو چاہتا ہے اور تخلیق اور تکمیل کائنات کا عمل دراصل تخلیق و تکمیل انسان ہی کا عمل ہے۔ ثانیاً یہ کہ انسان خدا کو چاہتا ہے اور اس کی زندگی کی پوری جد و جہد (جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی) صرف یہی مقصد رکھتی ہے کہ انسان خدا کی حقیقت کو پہچانے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک چونکہ اقبال کا تصورِ حقیقت اسلام کا تصورِ خدا ہے جس کے لیے وہ کائناتی خودیٔ خودی عالم یا خودیٔ مطلق کی فلسفیانہ اصطلاحات بھی استعمال کرتے ہیں اورمغرب میں ایک بھی فلسفی ایسا نہیں جس کا تصورِ حقیقت اسلام کے تصورِ خدا کی اساس پر قائم ہو لہٰذا اقبال کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کسی مغربی فلسفی سے استفادہ کر سکے۔ باوجودیکہ خودی (SELF) کی فلسفیانہ اصطلاح بعض حکمائے مغرب نے بھی استعمال کی ہے۔لیکن وہ اقبال کے مروّجہ مفہوم سے قطعاً مختلف ہے لہٰذا یہ کہنا بے بنیاد ہے کہ اقبال کا تصورِ خودی فختے یا نطشے سے، تصور وجدان جیمز وارڈ سے، تصورِ ارتقاء برگساں سے ماخوذ ہے۔اور ایسا دعویٰ محض ظاہری مشابہتوں یا سطحی مطالعہ کی بنیاد پر ہی کیا جا سکتا ہے۔

حکمائے مغرب کے فلسفیانہ نظریات کو مسترد کرنے کی ایک بنیادی وجہ ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک یہ بھی ہے کہ وہ شعورِ نبوت ﷺ کی روشنی سے محروم ہیں جو حقیقت میں ایک کامل تصورِ کائنات کی بنیاد بنتا ہے۔اقبال وہ پہلا فلسفی ہے جس نے اپنے فلسفہءخودی کی بنیاد نبوت ﷺ کاملہ کے عطا کردہ تصورِ کائنات پر استوار کی ہے اور جس کی اس سے پہلے مثال نہیں ملتی لہٰذا مستقبل میں پوری نوعِ انسانی کو نورِ ہدایت منور کرنے والا فلسفہ اسلام صرف ایک ہے اور وہ اقبال کا فلسفہ خودی ہے جو آئندہ کے عالمگیر ذہنی انقلاب کا باعث بننے کی ان خصوصات سے بھی بہرہ ور ہے جو اسے کائنات کا وہ آخری فلسفہ بنا دیتی ہیں جو ہر دور کے باطل فلسفوں کا مسکت جواب بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر میں ایسا ہر فلسفہ جو نبوت ﷺ کاملہ کے عطا کردہ تصورِ حقیقت پر مبنی نہ ہو اور جو کسی فلسفی نے حقائق عالم کی ناتمام معرفت پر قائم کیا ہو، ناقص ہے اور زود یا بدیر اس کی فرضی معقولیت کا پردہ چاک ہو کر رہتا ہے لہٰذا اقبال کے فلسفہ خودی کے مقابل دیگر تمام فلسفے یا تو کلی طور پر مٹ جائیں گے یا پھر نوعِ انسانی کے دورِ جاہلیت کی یادگار کے طور پر باقی رہیں گے۔

گویا ڈاکٹر رفیع الدین فلسفیانہ فکر کو عقل و استدلال کی اساس سے قطع کر کے وحیِ الٰہی سے مربوط کرنے کی شرط کو لازم قرار دیتے ہیں حالانکہ کسی بھی فلسفیانہ نظریے کو خواہ وہ فلسفہءخودی ہی کیوں نہ ہو آخری، حتمی اور اُلوہی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ کیونکہ گذشتہ اوراق میں اقبال کا یہ قول زیر بحث آ چکا ہے کہ فکر و خیال کی دنیا میں قطعیت کسی بھی چیز کو حاصل نہیں ہوتی اور علم و فکر کی ترقی کے

ساتھ ساتھ زیادہ بہتر اور مؤثر خیالات ابھر کر سامنے آتے چلے جائیں گے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے ان دعووں کی تائید یا ان سے اتفاق رائے کا اظہار شاید ہی کسی حلقے نے کیا ہو۔ البتہ ڈاکٹر عبدالمغنی کے اقبال کے نظریۂ خودی کے مباحث میں ڈاکٹر رفیع الدین کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں باجودیکہ اپنے مباحث میں وہ کہیں بھی ڈاکٹر رفیع الدین کو حوالہ نہیں بناتے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کی طرح، عبدالمغنی بھی ابتداء میں اقبال کا شمار عصر حاضر کے عظیم ترین شاعر اور اعلیٰ پایے کے فلسفی کی حیثیت سے کرتے ہیں جس کا حیات، کائنات اور انسانیت کے متعلق ایک مخصوص نقطۂ نظر ہے جسے ہم اس کا فلسفہ کہہ سکتے ہیں جو اسلام قرآن اور حدیث کے فیضان کا نتیجہ یا جسے وحی الٰہی کا بخشا ہوا NUCLEUS OF THOUGHT ایک ایسے معیار کی صورت میں موجود ہے جس پر تمام فلسفیانہ وصوفیانہ تصورات کی پرکھ کرتے ہوئے موافق مواد کو قبول یا ناموافق کو رد کیا جاسکے۔ عبدالمغنی کے نزدیک اقبال وہ آخری مسلم فلسفی تھا جس نے دور رسالت اور عہد صحابہؓ کے بعد دنیائے اسلام اور دیگر خطوں میں ابھرنے والے افکار ونظریات کا اپنے معیار حق کی روشنی میں جائزہ لیا اور فکر ونظر کے بھٹکے ہوئے قافلے کو صراط مستقیم پر گامزن کرنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے واضح اثرات کے باوجود عبدالمغنی اقبال کے نظریۂ خودی کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے اپنے مباحث کو رفیع الدین کی طرح ایک مربوط نظامِ فکری صورت دینے میں کسی طرح سے بھی کامیاب نظر نہیں آتے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کے فلسفہ خودی کو ایک نظامِ فکر کے طور پر کئی اقبال شناسوں نے اپنے تحقیقی مقالات اور مستقل تصانیف کا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر عشرت حسن انور اپنے تحقیقی مقالے کی ابتداء ہی میں یہ وضاحت ضروری خیال کرتے ہیں کہ انھوں نے اقبال کے مابعد الطبیعیاتی افکار کی پیش کش میں صرف ان کی فلسفیانہ تحریروں اور بالخصوص ان کے خطبات یعنی اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے اور ان کی شاعری پر انحصار نہیں کیا۔

فلسفہ خودی کی تشریح کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی نے نہ صرف اقبال کی تمام نثری و شعری تصانیف کو پیش نظر رکھا ہے بلکہ ان کی روشنی میں خودی اور اس کے مختلف پہلوؤں کے بارے

میں اہم نکات اخذ کیے ہیں لیکن اس ضمن میں اقبال کی شعری تصانیف کو بنیادی ماخذ کے طور پر زیادہ سے زیادہ استعمال میں لانے کی کوشش کی ہے بلکہ اکثر اوقات شعری متن سے مثالوں کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جاتا ہے اور کئی کئی صفحے مکمل طور پر شعری مثالوں سے بھرے نظر آتے ہیں۔

''اقبال کا نظریۂ خودی'' کے مطالعے کے دوران میں قاری شعر کی دلفریبی میں کھو کر رہ جاتا ہے اور مسئلہ خودی کے بارے میں اس کا سلسلۂ تفکر بار بار ٹوٹتا ہے اور کبھی کبھی تو اصل مسئلہ ذہن وفکر سے اوجھل بھی ہو جاتا ہے۔ شاید اقبال کی شاعری پر زیادہ تر انحصار کی وجہ یہ بھی ہے کہ ڈاکٹر عبدالمغنی کی رائے میں اقبال کا پسندیدہ ذریعہ اظہار وابلاغ شاعری ہی ہے۔ وہ اپنے پیغام کو محض فلسفہ وفکر تک محدود رکھنا نہیں چاہتے بلکہ عام آدمی میں قوتِ فکر کے ساتھ ساتھ جذبہ عمل بھی پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اصلاحی وانقلابی تحریک کا ذریعہ بن سکے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین فلسفہ خودی کی تشریح وتفسیر کے لیے یہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ وہ ایک مسلسل اور مربوط نظام حکمت کی شکل میں سامنے آئے جس میں اقبال کے تمام تصورات جو اس کی نظم یا نثر کی کتابوں میں بکھرے پڑے ہیں، ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اور اقبال کے مرکزی تصور خودی کے ساتھ عقلی وعملی طور پر منسلک ہوں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نہ صرف یہ کہ فلسفہ خودی کو ایک مربوط اور مکمل نظام فکر یا نظام حکمت تصور کرتے ہیں بلکہ اس کی تشریح وتفہیم کے لیے اپنے خاص نصب العینی فلسفہ کو جسے نظریہ داعیہ الی العین یا URGE FOR IDEAL کا نام بھی دیا گیا ہے اور جسے بقول ان کے خود انھوں نے افکارِ اقبال سے اخذ کیا ہے، کام میں لاتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے تمام نثری وشعری مآخذ سے استفادہ کرتے ہیں اور جہاں ضروری خیال کرتے ہیں، ان میں سے اعتدال اور توازن کے ساتھ اس طرح سے مثالیں بھی پیش کرتے چلے جاتے ہیں کہ اشعار اور اقوال کی بھرمار اور تکرار سے اصل متن بھی گرانبار نہ ہو اور نہ ہی تصنیف کا اصل موضوع مثالوں میں گم ہو کر رہ جائے۔ اس خوبی کو بھی ''حکمت اقبال'' کے محاسن میں شمار کیا جانا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے ''حکمت اقبال'' لکھنے کا جواز قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی

کی اس یاس انگیزی کو بنایا تھا کہ جس کے مطابق اس وقت یعنی اقبالیات کا تنقیدی جائزہ (اشاعت اول 1955ء) تک فلسفہ اقبال پر کوئی جامع اور مبسوط کتاب نہیں لکھی جاسکی تھی اور اقبالیات کے نام سے جو ذخیرۂ ادب تیار ہو چکا تھا وہ بھی اس پایہ کا نہیں تھا کہ جس سے مطالعہ اقبال میں کوئی مدد مل سکے۔ گویا ایک طرف تو ''حکمت اقبال'' کو جونا گڑھی اور اقبال کے دوسرے مداحوں کی مایوسی کا ایک مثبت جواب قرار دیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف واقعتاً یہ اپنے ذیلی عنوان کے مطابق ''کلامِ اقبال کی روشنی میں اقبال کے فلسفہ خودی کی مفصل اور منظّم تشریح'' کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اپنے ایک تبصرے میں ''حکمت اقبال'' کو یوسف حسین خان اور خلیفہ عبدالحکیم کی تصانیف کے بعد لکھی جانے والی ایک لائق مطالعہ کتاب بھی قرار دیتے ہیں لیکن جب ''اقبال کا نظریۂ خودی'' لکھتے ہیں، جس پر رفیع الدین کے خیالات کی واضح چھاپ محسوس کی جا سکتی ہے، تو یوسف حسین خان اور خلیفہ عبدالحکیم کے ساتھ ان کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھتے۔

لیکن جونا گڑھی کی تصنیف کے کوئی پینتیس، چھتیس سالوں بعد جبکہ افکارِ اقبال پر دنیا کے مختلف خطوں میں قابل قدر تحقیقی و توضیحی کام ہو چکا تھا، وہ اپنی تصنیف کے لیے کچھ انہی سے ملتا جلتا جواز فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

......اقبال شناسی کی روایت کے تفصیلی جائزے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبالیات میں فلسفہ خودی کے حوالے سے اپنی ORIGINALITY کی بدولت جو مقام ''حکمت اقبال'' کو نصیب ہوا ہے وہ بہت کم تصانیف کے حصے میں آیا ہے۔

اس امر پر بھی اقبال شناسوں کا اتفاق ہے کہ فلسفہ خودی کوئی شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ اپنے عہد کے سب سے بڑے چیلنج کا جواب تھا۔ فکر و نظر کی دنیا میں ایسے نظریات بھی اُبھر کر سامنے آتے ہیں جو فکری و سیاسی سطح پر مسلط جمود توڑ کر کسی ایسی تحریک کو ظہور میں لانے کا باعث بن جاتے ہیں جو بالآخر کسی اہم تقاضے اور مطالبے کی تکمیل پر منتج ہوتی ہے۔

اقبال ایسے مفکر، مصلح اور پیامبر سے، جو فلسفے کو بھی خونِ جگر سے لکھنے کا قائل ہو اور بصورت دیگر اس کو مردہ یا حالت نزع میں گرفتار تصور کرتا ہو، یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ اس کا نظامِ فکر عصری صداقتوں اور معروضی حقیقتوں سے بیگانہ رہ کر محض فنی اور جمالیاتی یا زیادہ سے زیادہ

مابعد الطبیعیاتی تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ اور وسیلہ بن کر رہ جائے۔اقبال کے فلسفہ خودی کا محرک اگر ملت اسلامیہ کی محکومی، غلامی اور زبوں حالی تھی تو اس کی غایت فکری بیداری سیاسی آزادی، وقار کی بحالی اور اسلامی نشاۃِ نو کی حصولی ہی کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

برطانوی امپریلزم نے اپنے دورِ عروج میں مختلف ذرائع کو کام میں لا کر ایسی تحقیقات کو عام کیا کہ جن کی رو سے تاریخ کے مختلف ادوار میں جو تہذیبیں ایک بار مٹ گئیں وہ آثار قدیمہ کا حصہ بن گئیں اور ان کا اِحیا پھر کبھی ممکن نہ ہوا۔اسی تاریخیت کا اطلاق انھوں نے اسلامی تہذیب پر بھی کیا جسے غلام ذہنوں نے نہ صرف فوری طور پر قبول کر لیا بلکہ اپنے مستقبل کو بھی سامراجی تہذیب کے ساتھ وابستہ کر دیا۔

ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اسی سامراجی تناظر میں یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ایسے ماؤف الذہن لوگوں نے یہ سوچنا بھی گوارا نہ کیا کہ اگر اسلام اور مسلمان واقعی ایک ختم شدہ قوت ہیں تو ہمارے خلاف بین الاقوامی سطح پر اتنی مخالفت کیوں ہے؟

''اسرارِ خودی'' کو اقبال کے فلسفہء خودی کا پہلا باضابطہ تعارف بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس کی اشاعت (1915ء) کے فوراً بعد برصغیر کے بعض صوفی حلقوں میں اس کے خلاف شدید ردّ عمل ظاہر کیا گیا جبکہ انگلستان میں ''اسرار'' کے انگریزی ترجمہ "SECRETS OF THE SELF" کی اشاعت کے بعد جہاں اس کی مدح میں بہت کچھ لکھا گیا وہیں بعض مغربی نقادوں نے ایک مخصوص ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک طرف فلسفہ خودی پر زبردست تنقید کی اور اسے احیائے اسلام کی ایک کوشش سے تعبیر کیا اور دوسری طرف یورپ کو اس آنے والے خطرے سے ڈرایا جو ان کی رائے میں 'اسرار خودی' کی حکمت کی صورت میں پیدا ہو سکتا تھا ڈاکٹر شمل نے بھی ایک المانوی مستشرق NALLINO کے مضمون مطبوعہ ,ORIENTE MODERNO) (1922/192 کا حوالہ دیا ہے جس میں اسرار خودی کو پین اسلامزم کی ایک خطرناک صدا قرار دیا گیا تھا۔حالانکہ اسی یورپ سے اقبال کو نکلسن، آربری، بوسانی، شمل اور کئی دوسرے مداح بھی نصیب ہوئے جو اقبال شناسی کی روایت کا حصہ بنے۔

بیسویں صدی کے ربع آخر میں سوویت یونین کے انہدام کے بعد مغربی ذرائع ابلاغ

کی زہرناکی، (CLASH OF CIVILIZATION) کے مصنف سیموئل ہنٹنگٹن جیسے ماہرین اور دوسرے پالیسی سازوں نے اسلام کو مغرب کے لیے ایک ممکنہ خطرہ بنا کر پیش کرنے کی جس مہم کا آغاز کیا تھا اور جس میں 9/11 کے بعد بے پناہ شدت پیدا ہوئی وہ محض آج کے حالات کا کوئی پہلا اور فوری ردعمل نہیں تھا بلکہ بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائیوں میں اسی طرح کے متعصّبانہ خیالات کا پرچار پروفیسر ڈکنسن اور فاسٹر کی تنقیدی آراء میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے دراصل برطانوی نوآبادیات میں ایسی کسی بھی کاوش کو جو فکر و شعور کو اجاگر کرتی اور عمل کی اساس پر زور دیتی ہو، اسے برطانوی امپریلزم کے لیے خطرہ قرار دینا نہ بیسویں صدی کے ان حالات میں مشکل تھا نہ آج ہی مشکل ہے۔

لہٰذا فلسفہ خودی کے حقیقی محرکات کا ادراک اس کے تاریخی تناظر ہی میں بہتر طور پر کیا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے بعض اہم محققین اور شارحین نے خودی کی تفہیم کے لیے تاریخی آگہی کی اہمیت پر حد درجہ اصرار کیا ہے۔

یوسف سلیم چشتی نے ''شرح اسرارِ خودی'' میں مطالب سے پہلے ان تاریخی عوامل پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جو اقبال کی فکر پر اثر انداز ہو کر فلسفہ خودی کی تخلیق کا باعث بنے۔

پروفیسر چشتی عالم اسلام پر طاری جمود کی کیفیت کا تجزیہ کرتے ہوئے تقلید، تنگ نظری اور جہالت کو اس کا سبب قرار دینے اور مختلف مما لک مثلاً مجمع الجزائر (انڈونیشیا)، افغانستان، ترکی، مصر، الجیریا اور خاص طور پر برصغیر کی حالت زار کا نقشہ کھینچتے ہیں جو مسلم مما لک میں بدترین صورت حال سے دوچار تھا کیونکہ 1857ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد برطانوی سامراج نے بطور خاص مسلمانوں کو اپنے انتقام کا نشانہ بنایا تھا اور ان کی روح حریت کو کچلنے کے لیے ہر سازش اور ہر ہتھکنڈہ اختیار کیا تھا۔

اقبال سے پہلے عالم اسلام میں جمال الدین افغانی مسلمانوں میں تحریک بیداری پیدا کرنے کی کوشش کر چکے تھے جس کو کسی حد تک مفتی محمد عبدہٗ نے آگے بڑھایا تھا۔ برصغیر میں سرسیّد احمد خاں جدید علوم و فنون کے حصول پر زور دیتے رہے تھے۔ چشتی نے برصغیر میں مختلف مکاتب فکر کے بارے میں رائے زنی کرتے ہوئے علی گڑھ کالج کو بھی اس بنا پر ہدفِ تنقید بنایا ہے کہ وہ محض

انگریز سرکار کو ملازم فراہم کرنے والا ادارہ بن کر رہ گیا تھا جبکہ دیوبند کے فارغ التحصیل اپنی سچی لگن کے باوجود عصری تقاضوں سے بے خبری کی وجہ سے حالات میں تبدیلی پیدا کرنے کے اہل نہ تھے۔اس لیے کہ ان کا اسلام دین اور دنیا کی ثنویت کے تصور پر قائم تھا اور ارکان اسلام کی پابندی ہی کو اصل مقصد سمجھتا تھا۔.........................

ڈاکٹر محمد رفیع الدین، اقبال کی فکر کو محض فلسفیانہ میلان کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ اس کو حکمت کے درجے پر فائز کر دیتے ہیں کہ یہ شعور نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان کا نتیجہ ہے لیکن یہ فکر یا حکمت، ارتقا کے جن مراحل سے گزری ہے اس پر بھی کوئی نظر نہیں ڈالتے گویا وہ فکر تسلسل کے باوصف اپنی حتمی صورت پر برقرار رہی ہے اور اس کی ابتداء یا انتہاء میں کوئی بعد نہیں جبکہ ڈاکٹر عشرت حسن انور نے فکر اقبال کو ماقبل وجدانی اور وجدانی کے تحت دو مراحل میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے مرحلے میں ان کی فکر ہمہ اوستی یا وحدت الوجودی تصور سے متأثر تھی لیکن قیام یورپ کے دوران میں بعض مغربی مفکرین بالخصوص برگساں، نطشے اور میک ٹیگرٹ کے عمیق مطالعے کے زیر اثر نفی خودی کی بجائے اثباتِ خودی کو اپنی فکر کا موضوع بنایا جبکہ مکیش اکبر آبادی نے مطالعہ اقبال سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہیں اور اگر ان کے ساتھ جلالپوری کے موقف کو بھی درست تسلیم کر لیا جائے کہ اقبال کے فکر و نظر کا آغاز اور انجام وحدت الوجود ہی تھا تو پھر فلسفہ خودی اپنی حقیقی اساس ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔............

ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور ڈاکٹر عشرت حسن انور نے خودی کی ماہیت پر تفصیلی بحث کے دوران اس کے مختلف اوصاف اور خواص کا تجزیہ پیش کیا ہے جس کا حاصل ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے مطالعات کی روشنی میں درج ذیل ہے:

1۔ خود آگاہی، خودی کا حیرت انگیز خاصہ ہے جو ہر طرح کے عمل کا محرک ہے۔

2۔ خودی کا وجود حقیقی ہے، وہ موجود ہے اور مقصد رکھتی ہے۔

3۔ خودی زمان و مکان کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔

4۔ خودی ایک نورانی قوت ہے جو دنیا کی کسی روشنی سے مماثل نہیں ہے لیکن جس کا ظہور انسان اور کائنات کی ہر شے میں ہوا ہے۔

5۔ خودی ذوقِ استیلاء سے بہرہ ور ہے۔

6۔ خودی اپنی انفرادیت کی بدولت بے چگون و بےنظیر ہے۔

7۔ خودی کی حقیقت غیر مادی ہے۔

8۔ خودی کا مرکزی وصف خدا کی محبت کا طاقتور جذبہ ہے۔

خودی کا یہی وہ وصف ہے جو ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے نزدیک فلسفہ اقبال کو ایک اساس مہیا کرتا ہے۔

ڈاکٹر عشرت حسن انور نے اقبال کے مابعد الطبیعیاتی افکار سے خودی کے جو اوصاف اخذ کیے ہیں وہ ان کی نظر میں: 1۔ رہنما 2۔ آزاد 3۔ غیر فانی قرار دیتے جاسکتے ہیں۔ چونکہ خودی ایک بامقصد فعلیت کی حامل ہے اس لیے وہ ہمیشہ کسی سمت میں حرکت کرتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی بنیادی ماہیت میں رہنما یا ہادیانہ ہے۔

خودی یا ایغو کو انتخاب اور عمل کی آزادی حاصل ہے۔ تقدیر ایغو کا باطنی دائرہ اثر ہے لیکن یہ اپنے امکانات کی حدود کے اندر مختار ہے۔

خودی چونکہ اپنی ماہیت کے لحاظ سے غیر مادی ہے اس لیے اس کو فنا نہیں۔ اقبال بقائے دوام کے قائل ہیں لیکن اس کو استحقاق کا درجہ دینے کی بجائے سعی و عمل سے مشروط کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین اور ڈاکٹر عشرت، اقبال کے اس تصور بقا سے متفق ہیں۔............

اقبال کی زندگی ہی میں جب کرۂ ارض کے پانچویں حصہ پر اشتراکی انقلاب برپا ہوا تو دنیا بھر کے مفکرین، رہنما اور انقلاب پسند سنجیدگی کے ساتھ اس کا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ اقبال بھی اپنی انقلابیت کے سبب اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے............۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کے اردو فارسی کلام سے ایسی کتنی ہی مثالیں پیش کی ہیں جن میں مارکس کے افکار، سرمایہ و محنت بحث اور انقلابِ روس کے مختلف پہلوؤں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور ''بال جبریل'' کی نظم ''فرمان خدا (فرشتوں سے)'' ان کی نظر میں کیمونسٹ مینی فیسٹو (اشتراکی منشور) کا خلاصہ ہے جسے روسی زبان میں مؤثر طور پر ترجمہ کرکے اگر لینن کے حضور میں پیش کیا جاتا وہ اسے عالمی اشتراکیت کا ترانہ بنا دیتے۔............

لیکن سوویت یونین کے شکست وزوال کے بعد جہاں امریکہ کو ایک واحد سپر پاور کی حیثیت حاصل ہوگئی اور نیا MILLENNIUM عالمی سیاست میں یک قطبی (UNIPOLAR) دور کا آغاز ثابت ہوا ہیں ایشیا میں بالخصوص مسلم دنیا کو ایک نئے چیلنج کا سامنا کرنا پڑا اور وہ یہ کہ اشتراکیت کے خلاف امریکی محاذ آرائی میں استعمال ہوتے وقت مسلم دنیا کے بیشتر حکمران اس حقیقت کے ادراک سے محروم رہے کہ روس کی شکست کے بعد عالمی سیاست میں طاقت کا توازن قائم نہیں رہ سکے گا اور امریکی عزائم کے اگلے شکار وہ خود بن سکتے ہیں۔اس کا انکشاف ان کو اس وقت ہوا جب افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلا کے بعد مغربی ذرائع ابلاغ، تھنک ٹینکس اور پالیسی سازوں نے بڑی مہارت کے ساتھ اسلامی دنیا کو FUNDAMENTALISM اور TERRORISM کے ساتھ نتھی کر کے ان کے خلاف ایک نئی مہم کا آغاز کر دیا۔

مغرب اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ جس مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کو پروپیگنڈے کے ذریعے سے مسلم ممالک کے ساتھ منسوب کیا جاتا رہا ہے، ان ممالک کی کثیر آبادی امن پسندی اور دوسری قوموں کے ساتھ پرامن بقائے باہمی کے اصولوں پر یقین رکھتی ہے اور کسی بھی قسم کی انتہا پسندانہ کارروائیوں کو مذہبی جواز فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔لیکن ڈاکٹر کنیز یوسف کے تجزیے کے مطابق امریکہ واحد سپر پاور کی حیثیت سے اپنے عسکری اور اقتصادی عزائم کی تکمیل کے لیے درج ذیل تین محاذوں پر پوری قوت کے ساتھ متحرک ہے:

1۔ افکار کی جنگ (WAR OF IDEAS)

2۔ معاشی مرکزیت کی جنگ (GLOBALIZATION)

3۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ (WAR AGAINST TERRORISM)

لیکن مندرجہ بالا امریکی حکمت عملی کو 9/11 جیسے کسی واقعے کا فوری ردّعمل قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس سے بہت پہلے امریکی پالیسی سازوں کی تحریروں میں END OF HISTORY اور THE CLASH OF CIVILIZATIONS کے تناظر میں اس کے لیے فکری طور پر راہ ہموار کی گئی ہے۔

سیموئیل پی ہنٹنگٹن (SAMUEL P. HUNTINGTON) اسلام اور مغرب پہ بات کرتے ہوئے پہلے تو تیونس کے کسی قانون دان کے حوالے سے لکھتا ہے:

''COLONIALISM TRIED TO DEFORM ALL THE CULTURAL TRADITIONS OF ISLAM. I AM NOT AN ISLAMIST. I DO NOT THINK THERE IS A CONFLICT BETWEEN RELIGIONS. THERE IS NO CONFLICT BETWEEN CIVILIZATIONS"

لیکن خود اس کا اپنا تجربہ یہ بھی اس سے مختلف نہیں گو کہ وہ اسلامی ثقافتی ورثے کی بربادی کی ذمہ دار COLONIAL طاقتوں کوٹھہرانے کا اعتراف تو نہیں کرتا لیکن اسلام کے بارے میں اپنے جذبات اور خدشات کا اظہار غیر مبہم انداز میں ضرور کر دیتا ہے:

''THE UNDERLYING PROBLEM FOR THE WEST IS TO NOT ISLAMIC FUNDAMENTALISM. IT IS ISLAM. A DIFFERENT CIVILIZATION WHOSE PEOPLE ARE CONVINCED TO THE SUPERIORITY FO THEIR CULTURE AND ARE OBSESSED WITH THE INFERIORITY OF THIER POWER. THE PROBLEM FOR ISLAM IS NOT THE C.I.A OR THE U.S DEPARTMENT OF DEFENCE. IT IS THE WEST, A DIFFERENT CULTURE AND BELIVE THAT THEIR SUPERIORS,IF DECLINING, POWER IMPOSES ON THEM THE OBLIGATION TO EXTEND THEIR CULTURE THROUGHOUT THE WORLD"

وہ دونوں مذاہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی تہذیبوں کے عقائد کے اختلافات ہی کو نہیں بلکہ بعض مشترکہ تصورات جیسے جہاد اور صلیبی جنگوں وغیرہ کو بھی تہذیبی تصادم کے اسباب میں شمار کرتا ہے اور یقیناً یہ وہ تصورات ہیں جو صدیوں پرانی تاریخ رکھتے ہیں۔ مسلم دانشور ہمیشہ اس حوالے سے مغرب میں اسلام کے بارے میں پائے جانے والے مغالطّوں کو دور کرنے کی سعی کرتے رہے ہیں اس ضمن میں اقبال کی مثال بھی پیش کی جاسکتی ہے۔........................

ڈاکٹر محمد رفیع الدین جب تک جیے اقبال کے افکار کے فروغ کے لیے کوشاں رہے۔ مظفر حسین کی صورت میں ان کو ایک ایسا مداح نصیب ہوا، جس نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی قائم کردہ پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کے ذریعے ڈاکٹر صاحب کے علمی منصوبوں کو آگے بڑھانے کا فریضہ سرانجام دیا اور ان کے فکری جانشین ہونے کا حق ادا کیا۔ان کے نزدیک:

''ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم نے علامہ اقبال کے پیغام اور مقاصد کو ٹھیک ٹھیک سمجھا اور ان کی شاعری اور فلسفے کی تشریح کے لیے اپنی تصانیف کے ذریعے ایک غیر معمولی کارنامہ انجام دیا۔ انھوں نے اقبال شناسی میں ایک ایسی تحقیقی اور تشریحی روایت قائم کی جو فکر اقبال کی اصل اسلامی اساس پر توجہ مرتکز کر کے قاری کو ادھر ادھر بھٹکنے سے بچا لیتی ہے''۔

جن لوگوں نے ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے کام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے وہ مظفر حسین کی اس رائے سے اتفاق کیے بغیر نہیں رہ سکتے:

''ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے عصر حاضر کے علمی نظریات کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ فقط عقیدۂ توحید ہی ایک ایسا نصب العین ہے جو یہ صلاحیت رکھتا ہے کہ تمام انسانی تقاضوں کو پورا کر سکے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریری صلاحیتیں تمام تر اسی حقیقت کی وضاحت میں صرف ہوئیں اور اس کاوش میں آپ نے عصر جدید کی علمی صداقتوں کو اپنے استدلالات میں سمو کر اس علم کلام کو چار چار چاند لگائے جس کی طرح علامہ اقبال ڈال گئے تھے''۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی محض فلسفہ خودی کی تشریح و توضیح پر ہی مشتمل نہیں بلکہ انھوں نے اس کے عملی پہلوؤں پر بھی اپنی مختلف تحریروں میں روشنی ڈالی ہے۔ کیونکہ بارہا اس طرح کے سوالات بھی اٹھائے جاتے رہے ہیں کہ علامہ اقبال اپنے تصور کی اساس پر قائم ہونے والی مملکت پاکستان کے لیے باعث افتخار ہیں لیکن جہاں تک پاکستان میں تعمیر خودی کی معاشرتی بنیادوں کا سوال ہے، تو موجودہ زہرناک معاشرتی ماحول میں ان کے فلسفہ خودی کو کسی طرح سے بھی عملی صورت نہیں دی جاسکتی۔ اقبال نے تعمیر خودی کا پیغام دیا لیکن ارباب اختیار نے ملک میں نفی خودی کے معروضی حالات پیدا کر دیے۔

اقبال کی طرح، ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو بھی یقین تھا کہ زود یا بدیر عالم انسانی میں ایک ایسی ریاست وجود میں آئے گی جو نہایت اخلاص کے ساتھ اسلام کے بنیادی اصولوں کو اپنا سیاسی نظریہ بنائے گی۔ وہ واضح کرتے ہیں کہ جب پاکستان کے مطالبے نے زور پکڑا تو بعض حقائق کی

بنا پر مجھے یقین ہو گیا کہ مستقبل کی عظیم اسلامی ریاست پاکستان ہی ہوگی اور پھر کچھ عرصہ بعد قیام پاکستان کی صورت میں یہ معجزہ رونما ہوا۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا کہنا ہے کہ انھوں نے قائداعظم کی خدمت میں اپنی کتاب (IDEOLOGY OF THE FUTURE) کے نسخے کے ساتھ ایک طویل عریضہ میں لکھ کر ارسال کیا کہ پاکستان کو ایک اسلامی ریاست بنانے کی صورت میں فلسفہ خودی کس طرح سے ریاست کی مشکلات دور کرنے کا قدرتی حل ثابت ہو سکتا ہے۔ چونکہ نو آزاد پاکستان اس وقت ایسی مشکلات میں گھرا ہوا تھا کہ فوری طور پر دستور سازی کے مسئلہ کی طرف توجہ ممکن نہ تھی اس لیے ان تجاویز پر غور نہیں کیا جا سکا۔...... 1957-58ء میں لاہور میں منعقدہ ہونے والے انٹرنیشنل اسلامک کلوکیم (INTERNATIONAL ISLAMIC COLLOQUIUM) کے اختتامی اجلاس میں پڑھے جانے والے اپنے مقالے ''THE POTENTIAL CONTRIBUTION OF ISLAM TO THE WORLD PEACE" کا اختتام ڈاکٹر محمد رفیع الدین ان الفاظ پر کرتے ہیں:

> ''ISLAM IS THE ONLY IDEOLOGY THAT HASTHE CAPACITY TO UNITY THE HUMAN RACE AND TO BRING THEM THE BLESSING OF PERMANENT PEACE"

دور حاضر کی ہولناکیوں کے خاتمے کے لیے آج بین الاقوامی سطح پر تہذیبوں کے درمیان مکالمے کی اہمیت پر بے حد زور دیا جا رہا ہے۔ بلاشبہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے ان تصورات کو ان مکالمات کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

اقبال شناسی کی علمی روایت میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے حوالے سے پیش کیے جانے والے طویل مباحث کا حاصل درج ذیل نکات کو قرار دیا جا سکتا ہے۔

(ا) ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اقبال کے فلسفہ خودی کی تفہیم و تشریح میں مشرق و مغرب کے فلاسفہ کے خیالات کا نہ صرف جائزہ لیا ہے بلکہ قرآنی فکر کی روشنی میں تصور خودی کی ایک مربوط اور منضبط تشریح و توسیع کی قابل قدر سعی بھی انجام دی ہے۔

(ب) انھوں نے فلسفہ خودی کو محض فکر و تخیل یا مجرد تصور قرار دینے کی کوششوں کی تردید کرتے ہوئے عملی زندگی میں اس کی اہمیت، ضرورت اور عصری معنویت پر بھرپور انداز میں

روشنی ڈالی ہے۔

(ج) فلسفہ خودی کی تفسیر و توضیح میں اپنے نصب العینی فلسفہ پر حد درجہ اصرار اور اس کے نتیجے میں بعض خیالات کی تکرار کے باوجود انھوں نے مدلل انداز میں خودی کو خدا کی محبت کے شدید جذبے سے تعبیر کرتے ہوئے نہ صرف اس کو عصری افکار کی پرکھ وسیلہ بنایا بلکہ اسے پاکستان کی نظریاتی اساس قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا۔

(د) ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے ایک مفسر اقبال کی حیثیت سے افکار اقبال کی علمی ترجمانی کا جو اہم فریضہ سرانجام دیا ہے اس کی بدولت ان کو اقبال شناسی کی روایت میں ایک ارفع مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اقبال کے بعد، ڈاکٹر محمد رفیع الدین کو بیسویں صدی کے اہم مسلم مفکرین میں شمار کیا جانا بھی ان کی فکری و تعلیمی خدمات کا ایک حقیقت پسندانہ اعتراف ہے۔

قوتِ فکر

............فوجی اسلحہ کے علاوہ دشمن کو مغلوب اور مفتوح کرنے کا ایک اور آلہ بھی قدرت کے کارخانہ میں موجود ہے اور یہ آلہ تمام دنیا کے مجموعی فوجی اسلحہ سے بھی کئی گنا قوی ہے، وہ فوجی اسلحہ سے زیادہ سریع الحرکت ہے اور اس کی حرکت ہر قسم کی ملکی، سیاسی اور جغرافیائی حدود و قیود اور دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں اور صحراؤں کی رکاوٹوں کے باوجود جاری رہتی ہے۔ اس کے استعمال سے دشمنوں کے دلوں کو مسخر کیا جا سکتا ہے جس سے اُن کی قوتِ مدافعت ختم ہو جاتی ہے اور اُن کے ہاتھ اٹھنے سے اور اُن کے پاؤں چلنے سے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنے آلاتِ حرب و ضرب کو بخوشی اپنے مخالفین کو سپرد کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور وہ دشمن نہیں رہتے بلکہ معاوِن اور مددگار بن جاتے ہیں۔ یہ ہتھیار دل کش افکار و تصوّرات کی قوت ہے۔ یہ قوت قوموں کی باہمی جنگ میں فیصلہ کن ہے۔......(ڈاکٹر محمد رفیع الدین)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی کا اظہار ـــــ تصانیف

1

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
فہرست
تصانیف

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
فہرست تصانیف

(ا) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا کام

ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے نوعمری اور عملی زندگی کے آغاز سے ہی علامہ اقبال کے فکر سے ہم آہنگی اختیار کرلی تھی اور کمالِ استقامت کے ساتھ زندگی بھر اس فکر (برحق) کے داعی، مبلغ اور PROMOTER بنے رہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل کشمیر میں شعبۂ تعلیم سے وابستہ رہ کر بھی یہی فکر ان کا اوڑنا بچھونا تھا۔ 1946ء میں ہی انہوں نے IDEOLOGY OF THE FUTURE جیسی کتاب تصنیف کردی جو ایک لاجواب کتاب ہے اور حقیقتاً فکر مغرب آج تک فلسفیانہ سطح پر اس کا جواب نہیں دے پایا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ حق، حق ہوتا ہے اور باطل بے بنیاد۔ قرآن مجید کی ٹھوس بنیادوں پر پیش کیا گیا جامع فکر اپنے اندر آج بھی اتنی طاقت رکھتا ہے اور دلوں کو مسخر کرسکتا ہے کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں۔

یہ قرآن مجید کی شان ہے جو قرآن مجید میں ہی بیان ہوئی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور بے مثل و بے مثال ہے اس جیسی (اچھوتے خیالات اور کائنات کی گتھیاں سلجھاتی ہوئی) کتاب یقیناً 'انسانیت' پر بڑا احسان ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ انسانی شعور ابھی اتنا اوپر آیا نہیں ہے۔ حالیہ تہذیب مغرب کے پیچھے جو مافیا 'صہیونیت' کا 'مہادیو' چھپا بیٹھا ہے اس کا کامل منصوبہ ہے کہ قرآن کا جواب نہیں دیا جاسکتا تو اس کو متنازع بنادو یا مسلمانوں کو بدنام کردو کہ وہ مایوس ہوجائیں اور اسلام سے اپنی وابستگی بھلادیں۔ ایسا کبھی ممکن نہیں۔

ابلیس کی مجلس شوریٰ میں علامہ اقبال نے ابلیس سے یہی کہلوایا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ حالیہ مغربی تہذیب کو صہیونیت کی طرف سے یہ ASSIGNMENT ہے کہ مسلمانوں کو کبھی توہین و تذلیل سے، کبھی FUNDAMENTALS کہہ کر، کبھی خودکش حملوں کے نام سے، کبھی TERRORIST اور دہشت گرد کے نام سے بدنام کردو مگر اندر کی بات وہی ہے جس کا حالیہ تہذیب کو خدشہ اور چوبیس گھنٹے کا روگ ہے کہ

ے جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

ے عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں

ے چشم عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محروم یقیں!

درحقیقت قرآن مجید جیسی عبارت مکے والے نہیں بنا سکے اسی طرح 'فلسفہ خودی' کا جواب حالیہ فکر و فلسفہ اور جماعت فلاسفہ کے پاس بھی نہیں ہے۔

(ب) فہرست تصانیف ڈاکٹر محمد رفیع الدین

ذیل میں دی گئی، فہرست قارئین کے سامنے ہے۔ ذرا سے غور و فکر سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر موصوف کی کتابیں فکر اقبال کی تشریحات ہیں۔ ان کی پہلی کتاب IDEOLOGY OF THE FUTURE کا پہلا باب ہی یہ ہے: "CONSCIENCE IS REAL"

ان کی تصانیف اس نظریہ کی وضاحت ہے اور یہ نظریہ ایک ریاست کا متقاضی۔

تصانیف و تالیفات

(ڈاکٹر شفیق عجمی صاحب کی کتاب ''علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین (علمی و فکری تقابل)'' سے ماخوذ تلخیص)

ڈاکٹر رفیع الدین کی پوری زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں بسر ہوئی۔ ان کی مستقل علمی و فکری تصانیف کے علاوہ وقیع تحقیقی مقالات اور خطبات مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے، جن کی فہرست ذیل میں درج کی گئی ہے:

'IDEOLOGY OF THE FUTURE' (i)

(مستقبل کا نظریۂ حیات)

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی پہلی اور بنیادی فلسفیانہ تصنیف جو انہوں نے پرنس آف ویلز کالج، جموں کے قیام کے دوران 1942ء میں مکمل کی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف آپ نے ایک شدید باطنی تقاضے سے مجبور ہو کر لکھی۔ لیکن کتاب کی اشاعت کے لیے کوئی ناشر دستیاب نہ ہوا تو انہوں نے خود اپنے خرچ سے کتاب چھپوالی۔ پہلا ایڈیشن 1946ء میں شائع ہوا۔

کتاب کا پہلا ایڈیشن پانچ صفحات کے INTRODUCTION کے علاوہ 561 صفحات پر مشتمل تھا جس میں درج ذیل بارہ ابواب شامل تھے:

I. CONSCIOUSNESS IS THE ULTIMATE REALITY.
II. CREATION & EVOLUTION.
III. THE URGE OF INSTINCT & THE URGE OF SELF.
IV. THE GROWTH OF THE SELF-CONSCIOUSNESS.
V. ETHICS.
VI. THE CURRENT THEORIES OF HUMAN NATURE-I
VII. THE CURRENT THEORIES OF HUMAN NATURE-II (FREUD & ADLER).
VIII. RESISTANCE & ACTION.
IX. POLITICS & WAR.
X. MARXISM.
XI. EDUCATION & ART.
XII. PROPHETHOOD & EVOLUTION

تعارف میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اس تصنیف میں حیات و کائنات کی ایک مربوط توضیح پیش کی گئی ہے جس کی بنیاد اس حقیقت پر قائم کی گئی ہے، اور جس کی تصدیق سائنسی انکشافات سے بھی مسلسل ہو رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ کائنات کی آخری حقیقت مادہ نہیں بلکہ شعور ہے۔ یہ نقطۂ نظر بنیادی طور پر اس دوسرے نظریے سے قطعی طور پر مختلف جسے مارکس جدلیاتی مادیت کا نام دیتا ہے اور جسے دنیا کے مختلف ممالک کے لاکھوں لوگ ایک حقیقت کے طور پر تسلیم بھی کرتے ہیں۔......

بلاشبہ یہ ایک عظیم علمی منصوبہ ہے جسے انفرادی سطح کی بجائے ایک ادارے کے قیام کے ذریعے مختلف مدارج میں تکمیل تک پہنچانا ممکن ہوگا۔ مصنف کے مطابق موجودہ کتاب میں بھی ان خطوط کی نشاندہی کی گئی ہے جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے منصوبے پر کام کا آغاز کیا جاسکتا ہے۔

کتاب کا دوسرا ایڈیشن ستمبر 1956ء میں دین محمدی پریس، میکلوڈ روڈ، کراچی کی طرف سے شائع ہوا۔ کتاب کے ٹائٹل کے ساتھ مندرجہ ذیل عبارت کا اضافہ کیا گیا:

"A STUDY OF THE LAWS OF HUMAN NATURE AND HUMAN ACITIVITY, AND THE MANNER IN WICH THEY DETERMINE THE COURSE OF HISTORY OF THE PROCESS OF IDEOLOGICAL EVOLUTION, INCLUDING A REFUTATION OF THE THEORIES OF KARL MARX, FREUD, ADLER AND McDOUGALL"

کتاب کا تیسرا ایڈیشن مصنف کی وفات کے تقریباً ایک سال بعد 1970ء میں شیخ محمد اشرف، لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔ متن میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا گیا البتہ کتاب کے آغاز میں پروفیسر ڈبلیو للّی (Prof.W.LILLIE)، پروفیسر سید ظفر الحسن Prof. SYED ZAFAR-UL-HASAN) اور ڈاکٹر رادھا کرشنن (Dr.RADHAKRISHNAN) کی آراء کو بھی شامل کیا گیا ہے جو دراصل ان EVALUTIOAN REPORTS کا حصہ ہیں جو مذکورہ اصحاب نے پروفیسر رفیع الدین کے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کے ممتحنین کی حیثیت سے لکھیں۔ کتاب کے پس ورق پر روزنامہ DAWN کراچی میں 'IDEOLOGY OF THE FUTURE' کے دوسرے ایڈیشن پر کیے جانے والے ایک تبصرے کی عبارت شائع کی گئی ہے۔ کتاب کا ایک ایڈیشن BOOK LOVERS BUREAU اردو نگر لاہور کی طرف سے بھی شائع ہوا۔ اس پر ایڈیشن نمبر اور سالِ اشاعت درج نہیں کیا گیا البتہ کتاب کی طباعت اور جلد بندی وغیرہ بہتر ہے۔

(ii) پاکستان کا مستقبل

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد محکمہ تعمیر ملت (DEPARTMENT OF ISLAMIC RECONSTRUCTION) قائم ہوا تو ڈاکٹر محمد رفیع الدین اس کے ساتھ وابستہ ہوگئے۔

''پاکستان کا مستقبل'' آپ نے انہی دنوں میں تحریر کی۔............

کتاب مندرجہ ذیل چھ ابواب مشتمل ہے:

1۔ مرض 2۔ پائیدار زندگی کی صلاحیتیں

3۔ مرض کے اسباب 4۔ مریض کا علاج

5۔ مریض کا تعاون 6۔ صحت

''پاکستان کا مستقبل'' لکھتے وقت ڈاکٹر رفیع الدین یقین کی اس کیفیت سے سرشار ہیں کہ ان کے تصورات کے مطابق اقبال کے فلسفہ خودی کا ظہور پانا، پھر اس کا زیادہ مفصل اور منظّم صورت اختیار کرنا، پاکستان کا ایک معجزہ کے طور پر ایک اسلامی ریاست بننا، یہ سب مستقبل کی اسلامی ریاست کی زندگی اور ترقی کے اسباب ہیں اور اس سلسلہ کی اگلی کڑی فلسفہء خودی کو پاکستان میں اسلام کی سرکاری ترجمانی کے لیے کام میں لانا ہے۔

(iii) قرآن اور علم جدید

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی ایک اور اہم تصنیف جسے علمی وادبی اور دینی حلقوں میں بے حد سراہا گیا، ''قرآن اور علم جدید'' ہے جو انہوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کے اپنے قیام کے دوران قلمبند کی اور جس کے پہلے تین ایڈیشن اسی ادارے کی طرف سے ہی شائع ہوئے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1951ء میں شائع ہوا۔ تیسرا ایڈیشن 1959ء میں منظر پر آیا۔ چوتھا اور پانچواں ایڈیشن بالترتیب 1951ء اور 1986ء میں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس، لاہور کی طرف سے شائع کیا گیا۔ ہمارے پیش نظر یہی آخری ایڈیشن ہے جس کے سرورق پر عنوان ''قرآن اور علم جدید'' کے ساتھ ایک ذیلی عنوان ''یعنی احیائے حکمت دین'' بھی درج ہے۔ کتاب دو حصوں۔

حصہ اول، چیلنج حصہ دوم، جواب

پر مشتمل ہے جن میں درج ذیل عنوانات کے تحت بحث کی گئی ہے۔

حصہ اول

1۔ خطرناک فتنۂ ارتداد 2۔ نارفرنگ

3۔ تصورات کفر کے فروغ کا واحد سبب 4۔ بے بسی کا علم

5۔ انسدادارتدادکاطریق

حصہ دوم

6۔ ڈارون۔نظریۂ ارتقاء
7۔ حقیقت ارتقاء
8۔ سبب ارتقاء
9۔ قرآنی نظریہ ارتقاء
10۔ میکڈوگل۔نظریۂ جبلت
11۔ انسان کی فطرت کا قرآنی نظریہ
12۔ میکڈوگل کے لیے قرآن کی رہنمائی
13۔ فرائڈ......نظریۂ لاشعور(جنسیت)
14۔ حیات بعد الممات اور لاشور
15۔ ایڈلر۔نظریۂ لاشعور(حب تفوق)
16۔ کارل مارکس۔نظریۂ سوشلزم
17۔ اقتصادی مساوات اور اسلام
18۔ مارکس کا غلط فلسفہ
19۔ اقتصادی حالات اور جذبہء حسن
20۔ بارآور قوتیں اور بارآور تعلقات
21۔ میکیاولی۔نظریہ وطنیت
22۔ عقیدۂ وطنیت کی بیہودگی

''قرآن اور علم جدید'' کا انتساب ''مستقبل کے انسان کے نام'' ہے، جو قرآنی نظریۂ کائنات کے علاوہ ہر نظریۂ کائنات کو عہد قدیم کی جہالت قرار دے گا''۔

یہ محض کتاب کا انتساب ہی نہیں بلکہ مصنف کا وہ دعویٰ ہے جس کو بنیاد بنا کر انہوں نے فکرمغرب بالخصوص ڈارون، میکڈوگل، فرائڈ، ایڈلر، کارل مارکس اور میکیاولی کے نظریات کا اِبطال کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم کے صاحبزادے صلاح الدین محمود، مقیم کراچی ان دنوں ''قرآن اور علم جدید'' کے انگریزی ترجمہ میں مصروف ہیں۔ اس سے پہلے وہ ڈاکٹر مرحوم کی تصنیف ''روحِ اسلام'' کی"THE ESSENCE OF ISLAM" "کے عنوان سے ترجمہ کر چکے ہیں۔

(iv) روحِ اسلام

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی یہ وقیع تحریر ان کے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی ملازمت کے دنوں (1950ء۔1953ء) سے یادگار رہے اور ادارے کی طرف سے شائع ہونے والے ایک مجموعہ مضامین ''اسلام کی بنیادی حقیقتیں'' میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، محمد مظہر الدین صدیقی اور خواجہ عباداللہ

اختر کے مقالات کے ساتھ شامل تھی۔ یہ مجموعہ پہلے 1955ء اور پھر 1975ء میں شائع ہوا۔

آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور نے اسے سعودی عرب میں مقیم جناب عباس حسین ملک کے تعاون سے بسلسلہ تبلیغ اسلام واشاعت دین کی غرض سے سکولوں اور کالجوں کی لائبریریوں کو مفت تقسیم کرنے کی غرض سے 1993ء میں شائع کیا۔ مظفر حسین کے الفاظ میں:

''روحِ اسلام'' اگرچہ ڈاکٹر رفیع الدین کی ابتدائی تحریروں میں سے ہے لیکن اس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم ومغفور کے فلسفے کا خلاصہ مختصر الفاظ میں سمٹ آیا ہے............لطف کی بات یہ ہے کہ یہ فلسفہ اتنی عام فہم زبان میں بیان ہوا ہے جسے ایک عام آدمی بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے اور یہ ایک ایسی تحریر ہے جو قلوب کو طمانیت، سکینت سے ہمکنار کر کے انہیں رسوخ فی الایمان کی نعمت سے مالا مال کرتی ہے''۔

''روح اسلام'' کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر رفیع الدین کے صاحبزادے ایس۔ ڈی محمود (صلاح الدین محمود) نے کیا اور رفیع الدین فاؤنڈیشن لاہور نے اسے 2004ء میں شائع کیا۔

(v) MANIFESTO OF ISLAM (منشور اسلام)

کتاب کا پہلا ایڈیشن دین محمدی پریس کراچی کی طرف سے شائع ہوا۔ سن اشاعت درج نہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین کی ذاتی دستاویزات میں "MANIFESTO OF ISLAM" کا اندراج ''قرآن اور علم جدید'' کے بعد ہوا ہے۔ MANIFESTO کے تعارف کے آخر میں انہوں نے دین محمدی پریس کراچی سے شائع ہونے والی اپنی کتاب "IDEOLOGY OF THE FUTURE" کے دوسرے ایڈیشن کا حوالہ بھی دیا ہے جو 1956ء میں شائع ہوا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "MANIFESTO OF ISLAM" کا پہلا ایڈیشن 1956ء کے بعد شائع ہوا تھا۔ مذکورہ تصنیف کی علمی حلقوں میں مقبولیت کا اندازہ اس حقیقت سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کو اردو کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی ترجمہ کر کے دمشق اور مشہد سے شائع کیا گیا۔

(vi) "FIRST PRINCIPLES OF EDUCATION"

(تعلیم کے ابتدائی اصول)

اصولِ تعلیم پر ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی معروف تصنیف "FIRST PRINCIPLES

"OF EDUCATION" پہلی بار اقبال اکادمی پاکستان کراچی سے 1961ء میں شائع ہوئی۔ اس وقت ڈاکٹر رفیع الدین اکادمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔کتاب تعارف(INTRODUCTION) کےعلاوہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے:

I. The Confusion of Modern Education.

II. The Urge for Education Growth.

III. The Misrepresentations of the Urge for Education Growth.

VI. The Nature of the Educational Process.

V. The Conditions of perfect Educational Growth.

اسی تصنیف پر آپ کو پنجاب یونیورسٹی، لاہور کی طرف سے 1965ء میں ڈی لیٹ (D.LITT) کی ڈگری دی گئی۔

(vii) حکمت اقبال

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی زندگی میں شائع ہونے والی ان کی آخری تصنیف ''حکمت اقبال'' ہے جس کے ذیلی عنوان کے طور پر یہ وضاحت بھی درج ہے:

''کلام اقبال کی روشنی میں اقبال کے فلسفہء خودی کی مفصل اور منظّم تشریح''

''حکمت اقبال'' پہلی بار علمی کتاب خانہ، اردو بازار لاہور کی جانب سے شائع ہوئی۔ تاریخ اشاعت درج نہیں۔ چونکہ ان کے سوانحی حالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کی وفات سے چند ماہ پیشتر شائع ہوئی لہٰذا اس کے سن اشاعت کے طور پر سال 1969ء کا تعین کیا جاسکتا ہے۔حکمت اقبال 496 صفحات اور درج ذیل 16 ابواب (مضامین) پر مشتمل ہے:

1۔ حکمت اقبال پر ایک عمومی نظر
2۔ خودی کی حقیقت
3۔ خودی اور تخلیق
4۔ خودی اور فلسفہء تاریخ
5۔ خودی اور رحمتہ للعالمین ﷺ
6۔ خودی اور عقل
7۔ خودی اور مشاہدہ قدرت
8۔ خودی اور سائنس
9۔ خودی اور ذکر
10۔ خودی اور فلسفہء اخلاق
11۔ خودی اور آرٹ
12۔ خودی کا انقلاب

13۔ خودی اور نشر توحید 14۔ خودی اور فلسفہء سیاست

15۔ خودی اور سوشلزم 16۔ خودی اور علوم مروّجہ

(viii) A SPECIMEN-TEXT BOOK OF PHYSICS FOR INTERMEDIATE CALSSES.

یہ نصابی کتاب ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی وفات کے بعد 1972ء میں ملک خدا بخش بُچہ کے پیش لفظ کے ساتھ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔

دراصل اس کتاب کی تالیف ڈاکٹر مرحوم کے اس تعلیمی منصوبہ کا حصہ تھی جس کے مطابق کالجوں اور یونیورسٹیوں کے سائنسی نصابات کو قرآنی فکر کی روشنی میں از سر نو مرتب کیا جانا ضروری قرار دیا گیا تھا اور جس کی وضاحت ملک صاحب نے اپنے پیش لفظ میں بھی کی ہے:

''HE (Dr. RAFI-UD-DIN) WOULD NEVER CEASE IN PREACHING HIS BASIC IDEA THAT ALL TEXT BOOKS IN PHYSICAL, BIOLOGICAL AND SOCIAL SCIENCE BE RE-WRITTEN IN SUCH A MANNER THAT ISLAMIC CONCEPT OF ''TAUHEED'' BECOMES AN INTEGRAL PART OF ALL SCIENCES"

ملک صاحب نے مزید لکھتے ہیں:

"THIS SPECIMEN TEXT BOOK ON INTERMEDIATE PHYSICS FROM ISLAMIC POINT OF VIEW WHICH DR. MUHAMMAD RAFID-UD-DIN HAS AUTHORED WAS IN FACT THE FIRST PRACTICAL EXPERIMENTAL WITH HIS MUCH PREACHED THEORY". (FORWARD BY MALIK KHUDA BUKHSH BUCHA).

اس کتاب کی اشاعت کا مقصد یہ بھی تھا کہ ڈاکٹر مرحوم کے اس تجربے کو ملک کے نامور سائنس دانوں، ماہرین تعلیم اور محکمہ تعلیم کے پالیسی سازوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ وہ ایک نصابی کتاب کی حیثیت سے اس کی موزونیت کے بارے میں اپنا فیصلہ دے سکیں۔ اسی صورت میں اس تجربے کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کی وفات کی وجہ سے اس سمت میں کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

2

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے تحریر کردہ مضامین جو مختلف مواقع پر لکھے گئے

2 ڈاکٹر محمد رفیع الدین
مقالات و مضامین کی فہرست

یہ فہرست بھی ظاہر کرتی ہے کہ یہ فلسفۂ خودی پورا نظامِ زندگی ہے اور اس سے ریاست کا مطالبہ پھوٹتا ہے جو مسلمان عوام نے آگے بڑھ کر مشیت ایزدی سے ہم آہنگ ہو کر 1947ء میں پورا کر دیا۔

مقالات/خطبات (اردو۔انگریزی)

1 IQBAL'S IDEA OF THE SELF (مجلّہ اقبال، بزم اقبال، لاہور۔ جنوری 1953ء)

2 WORLD CHAOS (پندرہ روزہ ''الاسلام'' (انگریزی) کراچی)

3 اسلامی نظام تعلیم کا مفہوم (ماہنامہ ''ثقافت'' ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور فروری 1956ء)

4 IQBAL'S CONCEPT OF EVOLUTION
اقبال ریویو، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی۔ اپریل 1960ء

5 NEED FOR SCIENTIFIC EXPOSITION OF IQBAL
رونامہ ''پاکستان ٹائمز'' لاہور۔ 21 اپریل 1960ء

6 حقیقت کائنات اور انسان (اقبال ریویو، اقبال اکادمی پاکستان، کراچی۔ جنوری 1961ء)

7 اقبال کا تصور حقیقت اولیٰ (اقبال ریویو، کراچی۔ جنوری 1961ء)

8 اقبال کا فلسفہ (اردو، انگریزی) (اقبال ریویو، جولائی 1960ء، اکتوبر 1961ء)

9 IQAL'S CONTRIBUTION TO KNOWLEDGE

روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' لاہور۔ 21 اپریل 1962ء

10 THE SLOGAN OF THE COMING WORLD REVOLUTION

''اقبال ریویو'' کراچی جولائی 1964ء

11 صحیح فلسفہ تاریخ کیا ہے؟ قرآن کی رہنمائی (''اقبال ریویو'' کراچی جولائی 1964ء)

12 اسلام اور سائنس (''اقبال ریویو'' کراچی جنوری 1965ء)

13 WHAT IS MAN

دوماہی 'اسلامک ایجوکیشن' آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور مارچ، اپریل 1968ء

14 EDUCATION SHOULD PREPARE US FOR WORLD ROLE

دوماہی ''اسلامک ایجوکیشن'' آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس لاہور، مارچ، اپریل 1968ء

15 مارکسیت کا مغالطہ (اردو، انگریزی)

سہ ماہی ''اسلامک ایجوکیشن'' لاہور، اکتوبر نومبر، دسمبر 1970ء

16 IQBAL WAS AGAINST GODLESS SCIENCE

روزنامہ ''پاکستان ٹائمز'' لاہور۔ 21 اپریل 1971ء

17 قوتِ افکار (دوماہی ''اسلامی تعلیم'' لاہور۔ جنوری فروری 1972ء)

18 ISLAM AND THE HUMAN (اسلامک ایجوکیشن، لاہور۔ جنوری، فروری 1972ء)

19 ہماری درسی کتابوں کے نقائص (اسلامک ایجوکیشن، لاہور۔ مارچ، اپریل 1972ء)

20 اسلامی تعلیم (اسلامک ایجوکیشن، لاہور۔ مارچ، جون 1972ء)

21 مجوزہ تعلیمی پالیسی (اسلامک ایجوکیشن، لاہور۔ مارچ، جون 1972ء)

قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں پڑھنے جانے والے تحقیقی مقالات

1. "THE CONFUION OF THE MODERN PHILOSOPHICAL OF HUMAN NATURE"
2. "THE MOTIVATING FORCE OF HUMAN ACTIVITY.
3. ''POTENTIAL CONTRIBUTION OF ISLAM TO WORLD

PEACE"

4. ''THE MEANING AND PUUPOSE OF ISLAMIC RESEARCH"
5. "THE MEANING OF TERMS-FREEDOM AND PROGRESS"
6. ''THE EDUCATIONAL PHILOSOPHY OF SIR PERCY NUNN"
7. "THE NATIONAL CHARACTER.
8. ERADICATE INTELLECTUAL SECULARISM TO SAVE HUMANIT.
9. THE ISLAMIC PHILLOSOPHY OF HISTORY.
10. "THE SOLUTION OF THE HUMAN RIDDLE"
11. "PROPOGATION OF ISLAM IN THE WEST. (URDU)
12. ISLAM AND SCEINCE (URDU)

**What you think, you create,
what you feel, you attract.
What you imagine, you
imagine, you become.**

3

فکر اقبال ایک مثالی ریاست کی متقاضی ہے

3

فکرِ اقبال میں اسلامی ریاست کا تصور

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

❁ ''(ملّتِ اسلامیہ کی) وحدت پھر سے پیدا ہوگی تو اسی اصول کی بدولت جس پر اوّل اوّل اس کی اساس رکھی گئی، اور جس کا اظہار حیاتِ ملّی کی شکل میں ہوا۔ یہ بڑی غلطی ہوگی کہ ہم اس کے لیے کوئی دوسری اساس تلاش کریں، جیسا کہ ہمارے اربابِ سیاست کر رہے ہیں۔ ناممکن ہے کہ مسلمان اس طرح متحد ہوسکیں!۔ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ لوتھر کی تحریک نے اہلِ مغرب کی وحدت پارہ پارہ کردی۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ عیسائیت یا عیسائیت کے علاوہ بعض اور عوامل بھی تھے جنہوں نے اتحادِ مغرب میں حصّہ لیا۔ بحث یہ ہے کہ یہ اتحاد جیسا بھی تھا ختم ہوگیا۔ اور اس کی بجائے نسلیّت اور وطنیّت نے سر نکالا۔ اقوام یورپ الگ الگ گروہوں میں بٹ گئیں۔'' (کتاب ''اقبال کے حضور'' ۔حصہ اوّل۔ سیّد نذیر نیازی۔ صفحہ۔۱۵-۳۱۴)

❁ ''جب تک کوئی قوم اپنے نصب العین پر قائم رہتی ہے، اپنی روایات کو زندہ رکھتی ہے، اور اپنے اصل اصول سے پیچھے نہیں ہٹتی، (تو) عوام بے رہرو نہیں ہونے پاتے، خواص ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ قوم کے وجودِ ملّی کو تقویت پہنچتی، اور ترقی اور کامرانی کی منزلوں میں با امید و اعتماد آگے بڑھتی (ہے) بلکہ دوسروں کو بھی اپنی جانب کھینچتی ہے۔'' (ایضاً صفحہ: ۳۹)

❁ ''ماضی سے تعلق قائم رہنا (بھی) ضروری ہے۔ قدامت پسندی، قوموں کی زندگی میں ایک تقویت بخش عنصر ہے۔ گو تنہا یہ عنصر کافی نہیں۔ قدامت پرستی سے کچھ مقصود ہے تو یہ کہ ہمارا ماضی محفوظ رہے (لیکن) آگے بڑھنا ہی (اصل) زندگی ہے۔'' (ایضاً، صفحہ۔ ۲۸۶)

❁ ''اسلام کی روح اجتماعی ہے۔ لہٰذا عالمِ اسلام کا زوال و انحطاط رُک سکتا ہے تو کسی ایسی تحریک سے رُک سکتا ہے جو اس پورے کل پر محیط ہو جسے ہم دین اسلام سے تعبیر کرتے ہیں''۔ (ایضاً۔ صفحہ۔ ۲۸۸)

مرسلہ: رضی الدین سیّد کراچی

ڈاکٹر محمد رفیع الدین

شارحِ اقبال

سے اقبال شناس

1

شارحِ اقبال
شارحِ خودی

1 اسلام میں آزادی اور ترقی کا مفہوم

ڈاکٹر محمّد رفیع الدین

(مجلّہ اسلامی تعلیم نومبر، دسمبر 1973ء)

آزادی اور ترقی کے بارے میں اسلامی نکتہ نظر کیا ہے؟ اس موضوع پر بحث کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ آزادی اور ترقی سے متعلق عام تصورات پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

جب ہم آزادی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی ہمیں اس مقصد کی نشاندہی کرنی پڑتی ہے جس کے لیے آزادی مطلوب ہو کیونکہ آزادی ہمیشہ کسی نہ کسی آدرش یا نظریے کے حصول کا ذریعہ ہوتی ہے۔ چنانچہ آزادی کی کچھ حدود متعین کی جاتی ہیں اس پر ایسی پابندیاں لگائی جاتی ہیں جو اس مقصد یا نظریے کے حصول میں معاون ہوں۔

آزادی مطلق ــــ یعنی ہر قسم کی حدود و قیود سے مستثنیٰ آزادی ــــ کا نہ ماضی میں کہیں وجود تھا نہ ہی مستقبل میں اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ انسان کی فطرت کی تخلیق اسی انداز پر ہوئی ہے کہ آزادی مطلق اس کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ گویا آزادی کی ایک سے زیادہ صورتیں ہیں اور وہ جن نظریات یا مقاصد کے لیے ہوں، اسی تناسب سے ان پر پابندیاں ہوتی ہیں۔

ہر مذہب، سماجی یا سیاسی برادری ایک علیحدہ نظریاتی گروپ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے پیش نظر کوئی نہ کوئی ایسا نظریہ ہوتا ہے جس کی بنیاد کسی آدرش یا مقصد حیات پر ہو۔ مقصد حیات ایک قوت (CRACY) ایک ازم اور ایک مذہب ہوتا ہے۔ اس گروپ کی پوری زندگی پر اس کی

چھاپ ہوتی ہے۔ یہ بنیادی حقیقت کہ ایک سماجی برادری جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، یہ ثابت کرنے کیلیئے کافی ہے کہ اس کا اپنا مقصد حیات اور جداگانہ آدرش ہے۔ آزادی کے متعلق اس سماجی گروہ کا اپنا تصور ہوتا ہے جس کے مطابق آزادی کو بروئے کار لانے کیلیئے پر کچھ پابندیاں لگادی جاتی ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک مغربی کمیونسٹ آزادی کی بات کرتا ہے تو اس سے وہی آزادی مراد ہوتی ہے جو اس کے نظریۂ حیات _ کمیونزم _ کے مطابق ہو۔ اس کے برعکس جمہوریت پسندوں اور سرمایہ داروں کے نزدیک آزادی کا کچھ اور مفہوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک فرانسیسی کی آزادی، ایک امریکی، ایک اطالوی اور ایک انگریز سے مختلف ہوتی ہے اور روسی کمیونسٹ جس آزادی سے ہمکنار ہوتا ہے، وہ باقی دوسروں کی آزادی سے بالکل الگ چیز ہوتی ہے۔ سرمایہ دار ممالک روس پر الزام لگاتے ہیں کہ اس نے اپنے شہریوں کی آزادیاں سلب کر رکھی ہیں، جب کہ روس ان سرمایہ دار قوموں پر جو ''دنیا کی آزادی پسند اقوام'' کہلاتی ہیں، الزام لگاتا ہے کہ انھوں نے مزدوروں کی آزادی چھین لی ہے اور ان کا استحصال کر رہی ہیں۔ کمیونسٹ اور سرمایہ دار اپنی اپنی جگہ دونوں درست ہیں کیونکہ ہر ایک کے سامنے غلامی اور آزادی کا جداگانہ تصور ہے۔ اگر دنیا کی نام نہاد آزادی پسند قومیں اپنے شہریوں کو کمیونسٹ بننے کی اجازت نہیں دیتیں تو اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں، یہ تو فطرت کے عین مطابق ہے کیونکہ ہر ایک نظریہ اور نصب العین اپنے پیروکاروں پر ایسی پابندیاں لگاتا ہے جو اس نظریے کے مزاج سے ہم آہنگ ہوں۔ اس کیفیت کو آزادی کا نام دے لیں یا غلامی کا، یہ ہر گروہ کے نظریہ پر منحصر ہوتا ہے۔ جب ایک قوم اپنی آزادی کی تعریف میں رطب اللسان ہوتی ہے تو اسے آزادی پر لگائی گئی قیود کی بھی تعریف کرنی پڑتی ہے۔

اگر لفظ آزادی کے یہی معنے ہیں جن کا عنوانِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے اور اس سے مراد وہی آزادی ہے جس کی مغربی اقوام قائل ہیں تو اسلام کا ایسی آزادی سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اسلامی نظریۂ حیات مغرب کی ہر قوم کے فلسفہ زندگی سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام بذاتِ خود ایک نظریہ ہے، اس کا اپنا ایک مقصد حیات ہے جس کی بنیاد داعی اسلام حضرت محمد ﷺ کی ہدایات کے مطابق خدا کی محبت اور اس کی اطاعت پر ہے۔ اسلامی نکتہ نظر سے ہر وہ سرگرمی جو ایک مسلمان کو خدا کی محبت اور عبادت میں مدد دے، آزادی ہے اور ہر وہ فعل جس کا نتیجہ اس میں رکاوٹ ڈالنا ہو وہ

پابندی اور غلامی ہے جو مسلمان کو قبول نہیں کرنی چاہیے اور اس کے خاتمہ کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔

اس کے علاوہ ہم یہ حقیقت فراموش کر جاتے ہیں کہ کسی آدرش یا نظریے کے مطابق آزادی پر لگائی گئی پابندیاں داخلی بھی ہوتی ہیں اور خارجی بھی۔ ہم بڑی شد و مد سے عالم گیر اخلاقیات کی طرف بھاگتے ہیں اور ایک اچھی اور خوش نصیب زندگی گزارنے کی خواہش رکھتے ہیں چنانچہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی کو برائی پر مجبور کیا جا رہا ہے تو ہم اس کی ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں اور پرزور الفاظ میں مجبور کرنے والے کی مذمت کرتے ہیں، لیکن اگر وہی آدمی اپنی مرضی اور منشا سے کسی برائی کا مرتکب ہوا ہو تو ہم اسے حق بجانب سمجھتے ہیں اور برائی کے خلاف کوئی آواز نہیں اُٹھاتے، حالانکہ اپنی مرضی سے کیا گیا برا کام مجبوری کی حالت میں کیے گئے فعل بد سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے لیکن ایسے معاملات میں ہماری رائے میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کی بنیاد اس حقیقت پر ہوتی ہے کہ ہم یقینی طور پر اچھائی اور برائی کے مفہوم سے آشنا نہیں ہوتے۔

ہم ایک فرد کے ہاتھوں دوسرے کے قتل کو گوارا کر لیتے لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ قتل ایک غیر اخلاقی اور برا فعل ہے، ہم قاتل کو خود اپنا خاتمہ کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اگر ہمیں یقینی طور پر یہ معلوم ہو کہ برائی کیا ہے تو ہم ان دو افراد میں قطعی امتیاز نہ کریں، جن میں سے ایک دوسرے کے ساتھ برائی کرتا ہے اور دوسرا خود اپنے ساتھ۔ اگر ہم سائنٹفک، واضح اور یقینی طور پر یہ جان لیں کہ ہمارے لیے برائی کیا ہے اور اچھائی کیا تو ہماری بہت سی آزادیاں غائب ہو جائیں۔

آج ہم حفظانِ صحت کے اصولوں کا قطعی اور یقینی علم رکھتے ہیں۔ اس لیے بزورِ شمشیر دوسروں سے ان کی پیروی کا مطالبہ کرتے ہیں اگر کوئی آدمی عام شاہراہ پر کیچڑ اچھالتا یا گندگی بکھیرتا ہوا پکڑا جائے تو اسے جرمانہ اور قید کی سزا دیتے ہیں۔ اگر ہمیں جسمانی صحت کے اصولوں کی طرح اخلاقی صحت کی اہمیت کا احساس ہو جائے تو ہم انھیں بھی بالجبر لوگوں پر نافذ کریں گے۔

اب بتایئے آزادی سے ہماری کیا مراد ہے؟ آزادی کے متعلق ہمارے بہت سے تصورات محض جہالت کی علامت ہیں ہم ایسی آزادی کے خواہاں ہیں کہ جو جی میں آئے کرتے پھریں کیونکہ ہم اچھائی اور برائی کا صحیح شعور نہیں رکھتے۔ میں یہ بات پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ

موجودہ دور میں انسان کو جو چیز تیزی سے تباہی کی طرف لے جارہی ہے، وہ اس کی آزادی ہے، غلامی نہیں۔ انسان خود اپنی اغراضِ نفس اور خواہشات کا بندہ بن گیا ہے۔ اگر وہ واقعی آزادی کا طالب ہے تو اسے خود کو اپنی غلامی سے آزاد کرانا ہوگا۔ اسے اپنے نفس سے چھٹکارا پانا ہوگا۔ اسلام فرد کی داخلی آزادی کے لیے راہیں بتاتا ہے اور اسے خود اپنی غلامی سے نجات دلاتا ہے۔

ترقی کا بھی یہی کچھ حال ہے، جب ہم ترقی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ہمیں ترقی کی وہ سمت متعین کرنی ہوتی ہے جو ہمارے پیش نظر ہو۔ مثلاً ایک ماہر نقب زن جو اپنے پیشے میں کام آنے والے پیچیدہ سائنسی آلات استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اپنے بیٹے کو اس پیشے کی تربیت دینا شروع کردے تو وہ اپنے دل میں مطمئن ہوسکتا ہے کہ اس کا نورِنظر ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس کا مطلب ہوا کہ ترقی کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ ان میں سے بعض یک طرفہ، جانبدارانہ اور فرقہ وارانہ ہیں اور بعض ایسی جو دوسری ترقیوں کو قربان کرنے سے حاصل ہوتی ہیں، یہ صورتیں زیادہ جامع اور عام فہم ہوتی ہیں۔

جانبدارانہ فرقہ وارانہ ترقی خطرناک ہوتی ہے کیونکہ اس میں انسانی صلاحیتوں کا بیشتر حصہ نظر انداز کردیا جاتا ہے۔ یہ ترقی اپنے لیے آپ گڑھا کھودتی ہے۔ انسان کی تخلیق اس انداز پر ہوئی ہے کہ یا تو وہ مجموعی حیثیت سے ترقی کرے ورنہ کوئی بھی ترقی نہ کرسکے۔ مغربی دنیا نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں جو کچھ ارتقا پایا ہے، وہ سراسر جانبدارانہ فرقہ وارانہ اور خطرناک قسم کا ہے مغرب کے اہل دانش کو خود اس ترقی (معکوس) کے خطرات کا احساس ہوگیا ہے اور اب وہ ببانگ دہل ایسی ترقی سے باز رہنے کا مطالبہ کررہے ہیں۔ اس سلسلے میں بطور شہادت چند مشہور اہل قلم کی تصانیف سے اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ معروف ماہر نفسیات میک ڈوگال ایک جگہ رقم طراز ہے:

> ''انسانی فطرت سے ہماری لاپرواہی اور بےخبری کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرتی علوم کی ترقی بند ہوگئی اور اب بھی بند ہے حالانکہ معاشرتی علوم کا فروغ وارتقا جدید دور کی اشد ضرورت ہے ان کی ترقی رُک جانے سے ہماری تہذیب کے انحطاط بلکہ مکمل زوال کا خدشہ پیدا ہوگیا ہے''۔

ایک اور مشہور ماہر نفسیات سکنّر اپنی کتاب "SCIENCE AND HUMAN

"BEHAVIOUR" میں لکھتا ہے:

''بلاشبہ سائنس نے بے پناہ ترقی کی ہے آسان مسائل کو پہلے حل کر کے اس نے ہماری توجہ بے جان نیچر پر اس قدر مرکوز کرادی ہے کہ ہم اس کے بعد آنے والے معاشرتی مسائل کے لیے کوئی تیاری نہیں کر سکے۔ مادّی سائنس کے ارتقاء کا کوئی فائدہ نہیں جب تک اس میں معاشرتی سائنس کا معتد بہ حصہ شامل نہ ہو۔ کیونکہ صرف اسی صورت میں اس ترقی سے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔''

اسلام ایک جامع، ہر پہلو سے مکمل اور ہمہ جہت ترقی کے اصول پیش کرتا ہے اور انسان کو فرقہ وارانہ ترقی سے خبردار کرتے ہوئے عاد اور ثمود کی اس بے پناہ ترقی کی مثالیں دیتا ہے جو آخر کار ان کی ذلت اور تباہی کا سبب بنی۔ اسلام ہمیں انتہائی ضروری معاشرتی علوم کی بنیادی حقیقتیں فراہم کرتا ہے جن کی عدم موجودگی میں مغربی تہذیب تباہی کے کنارے پر پہنچ گئی ہے۔

یہ درست ہے کہ عالم اسلام کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کے لیے مغربی دنیا سے استفادہ کرنا ہوگا، لیکن اس کے مقابلے میں مغرب اسلام سے جو کچھ حاصل کر سکتا ہے وہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے کہیں زیادہ بیش قیمت ہے۔ اسلام کے پاس وہ بیش بہا گوہر ہے جس کے بغیر سائنس اور ٹیکنالوجی نہ صرف بیکار محض ہیں بلکہ یقینی طور پر تباہ کن اور ہلاکت خیز بھی۔

ترقی کا لفظ جب عالم انسانیت کے بارے میں بولا جاتا ہے تو اس کا سائنس سے گہرا رابطہ ہوتا ہے۔ یہاں ترقی سے مراد انسانی زندگی کے نفسیاتی اور معاشرتی مرحلے میں انقلاب کا واقع ہونا ہے۔ ہم اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ حیاتیاتی ارتقا کی بھی ایک آخری منزل تھی جہاں انسانی زندگی نہ صرف اپنی مکمل ترین شکل میں ظاہر ہوئی بلکہ پوری دنیا پر غالب آ گئی۔ کیا اس صورت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاشرتی اور نفسیاتی ارتقا یا آسان لفظوں میں نظریاتی ارتقا کا کوئی انتہائے مقصود نہیں؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ماہرین حیاتیات جن میں جولین ہکسلے کا نام سرفہرست ہے اور فلسفہ تاریخ کے علماء جن میں سپنگلر، ٹبنی، سوروکن اور دوسرے بہت سے لوگ شامل ہیں، نے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ نظریاتی ارتقا کی منزلِ مقصود کیا ہے۔ وہ ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ تاہم ایک بات واضح ہے وہ یہ کہ جس طرح حیاتیاتی ارتقا کا نکتہ معراج نہ صرف حیاتیاتی جسم کا ظہور تھا بلکہ پوری دنیا پر اس کا غلبہ بھی، اسی طرح نظریاتی ارتقا کا مقصد صرف ایک مکمل ترین

نظریاتی برادری کی تشکیل ہی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ پوری دنیا پر حاوی ہو۔

بعض لوگوں نے حیاتیاتی قیاسات کو پسند نہیں کیا۔ تاہم ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے، اس کی فطرت، بنیادی خوبیاں اور خصوصیات حیاتیاتی اور نظریاتی ارتقا کے مراحل میں یکساں رہتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ حیاتیاتی قیاسات زندگی کے عمل کو عقلی بنیادوں پر سمجھنے کے لیے قابل قدر رہنمائی کرتے ہیں۔

گویا کوئی مذہبی، معاشرتی یا سیاسی برادری صرف اسی سمت میں ترقی کرسکتی ہے جو اس کے نظریات سے ہم آہنگ ہو، ورنہ وہ ارتقائی دوڑ میں لازماً پیچھے رہ جائے گی۔ یہ ارتقائی عمل صرف اس قوم کو آگے بڑھنے دے گا جو صلاحیتوں کے اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی پذیر ہوگی۔ ملت اسلامیہ قرآن مجید کی نصف درجن سے زائد ایسی محکم آیات پر یقین رکھتی ہے جن میں کہا گیا ہے کہ وہی دنیا کی سب سے آخری قوم ہے جو انسانیت کے نکتہ انتہا تک پہنچے گی۔

بظاہر آج دنیا بھر میں مسلمانوں کی زبوں حالی کے پیش نظر یہ دعویٰ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے تاہم مسلمانوں کے لیے یہ صورتحال مایوس کن نہیں، کیونکہ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کا نظریہ حیات یعنی توحید جو اُن تمام نظریات میں مکمل ترین ہے جو انسانی تخیل میں آسکتے ہیں، ان کی ہمہ جہت اور مسلسل ترقی کی ضمانت ہے موجودہ دور میں مسلمانوں کی حالت ایسی ہے جیسی کہ کروڑوں سال پہلے انسان کی تھی جب کہ وہ محض جنگلی جانور تھا اور جنگل کے دوسرے طاقتور جانوروں مثلاً ہاتھی، شیر، شیر ببر، ریچھ وغیرہ کے مقابلے میں کمزور تر۔ یہ جانور پنجے، دانت اور سونڈ سے مسلح تھے اور بچارے انسان کو جان بچانے کے لیے غاروں میں یا درختوں پر پناہ لینی پڑتی تھی۔

اس وقت کون سوچ سکتا تھا کہ انسان نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ ترقی کرے گا اور پوری زمین پر چھا جائے گا۔ جب انسان نے ہتھیار ایجاد کر لیے تو اسے جانوروں پر بالادستی حاصل ہوگئی۔ امید ہے کہ اسی طرح مسلمان قوم بھی نظریہ توحید سے ماخوذ انسانی فطرت کے متعلق سائنسی نظریات کی شکل میں ایسے ہتھیار ایجاد کرے گی جو تمام نسل انسانی کے لیے مفید ثابت ہوں گے اور مسلمانوں کو دورجدید کی جزوی طور پر ترقی پذیر قوموں پر بالادستی حاصل ہو جائے گی۔

2

قومی کردار

ڈاکٹر محمّد رفیع الدین

(مجلّہ اسلامی تعلیم نومبر، دسمبر 1973ء)

قومی کردار کے متعلق بامعنی اور تعمیری بحث کرتے وقت ہمیں مندرجہ ذیل سوالوں پر غور کرنا ہوگا۔ قوم کی تعریف کیا ہے؟ کردار کے معنی کیا ہیں؟ قومی کردار کیسے تشکیل پاتا ہے؟ وہ کون سے بنیادی عوامل ہیں جو ہمیں ایک قوم بناتے ہیں؟ اور پاکستانی قوم میں اعلیٰ اور بہترین پایہ کے قومی کردار کو کیسے فروغ دیا جاسکتا ہے؟

قوم کیا ہے؟

قوم افراد کے ایسے مجموعہ کا نام ہے جو ایک مشترک نظریہ حیات پر یقین رکھتے ہوں کسی قوم کا نظریہ حیات اس قوم کے مخصوص نفسیاتی اور تعلیمی ماحول کے مطابق مطلوبہ اوصاف یا اجزائے ترکیبی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک قوم اس لیے قوم ہے کہ وہ قومی انداز میں سوچتی ہے اور اس کی سوچ اس لئے قومی ہوتی ہے کہ اس کے تمام افراد اس نظریہ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔ قومی نصب العین یا آئیڈیل کے اجزائے ترکیبی میں نسل، زبان، رنگ ثقافت، تاریخ، عقیدہ و مسلک اور فلسفہ یا مذہب خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی آئیڈیل میں یہ تمام اجزاء شامل ہوتے ہیں اور کسی میں بعض۔

کردار کے معنی؟

کردار کو ذہن نشین کرنے سے پہلے ہمیں نظریہ حیات کی مزید وضاحت کرنا ہوگی۔ کردار ــــ سب سے پہلے فرد کی زندگی میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنی جبلت اور فطرت کے مطابق کسی نہ کسی نظریہ حیات کو اپنانے پر مجبور ہے جو مندرجہ ذیل پانچ شرائط پوری کرتا ہو۔

1۔ وہ نصب العین دوسرے تمام نظریات سے زیادہ پرکشش اور محبت کے لائق ہو۔

2۔ اس میں اتنی جاذبیت ہو کہ فرد کے جملہ خیالات پر چھا جائے۔ اُسے ایک مثالی آدرش بنایا جاسکے۔

3۔ یہ آئیڈیل بلند ہو یا پست، دلکش ہو یا قابل نفرت، صحیح ہو یا غلط، مکمل ہو یا نامکمل، عالم گیر ہو یا علاقائی تاہم فرد کے لئے اس میں دلکشی، پسندیدگی اور سچائی کی وہ جملہ خوبیاں موجود ہوں، جو اس کی یا دوسروں کی نظر میں کچھ اہمیت رکھتی ہیں۔

4۔ جو فرد کے لئے ایک ایسے پیمانہ، معیار اور کسوٹی کا کام دے سکے، جس پر صحیح اور غلط، اچھے اور برے، خوبصورت اور بدشکل کو پرکھا جاسکے۔ جو یہ بتا سکے کہ کس چیز کو قبول کیا جائے اور کون سی کو مسترد۔ جس سے یہ پتہ چل سکے کہ کون سی چیز محبت کرنے کے لائق ہے اور کون سی قابل نفرت۔ جو یہ بتا سکے کہ کون کون سے کام کرنے کے ہیں اور کن کن کاموں سے پرہیز بہتر ہے۔

5۔ وہ نظریہ شخصی زندگی پر اس طرح حاوی ہو جائے کہ اس کی تمام سرگرمیاں اسی کے تابع ہو جائیں عادات وخصائل، عقائد واعمال، خیالات وجذبات، مرغوبات ومیلانات، آرزو اور خواہشات غرضیکہ ہر چیز پر اس نصب العین کی گہری چھاپ ہو۔ انہی چیزوں سے شخصی کردار نشوونما پاتا ہے۔ انسانی کردار فطرتاً ترقی پذیر ہوتا ہے جوں جوں اس کے شعور وآگہی کی سطح بلند ہوتی ہے اور اپنے نظریہ کے مطابق عمل کرتا ہے، اسی حساب سے اس کا کردار ترقی کرتا ہے۔ کردار کی بنیاد چونکہ نظریے پر ہوتی ہے، اس لئے ایک شخص کا نظریہ حیات جس قدر بلند یا پست، اچھا یا برا، دلکش یا بھونڈا ہوگا۔ اسی قدر اس کا کردار بلند یا پست، اور اچھا یا برا ہوگا۔

قومی کردار کیسے اُبھرتا ہے؟

چونکہ ایک قوم کے تمام افراد کسی ایک مشترک نظریے کے قائل اور پیروکار ہوتے ہیں۔ اس کی بقا اور ارتقا کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے اندر مشترک عادات وخصائل، میلانات ومرغوبات، عقائد وخیالات، جذبات ومحسوسات، اُمنگ وخواہشات ترقی کر کے کردار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر قوم اپنا جداگانہ کردار رکھتی ہے۔ جس کی ایک خاص نوعیت ہوتی ہے۔ جب اس نصب العین پر عملی زندگی کی عمارت تعمیر کی جاتی ہے، تو وہ قومی آئیڈیل بن جاتا ہے، اسی

لئے ہر قوم کو ایک نظریاتی گروہ کہتے ہیں۔قومیں یا نظریاتی فرقے نفسیاتی طور پر اسی طرح ترقی کرتے ہیں جس طرح مختلف عناصر حیاتیات کے مراحل سے گزرتے ہیں۔ جیسے ہر عنصر اپنا منفرد وجود اور خاص خصوصیات رکھتا ہے۔ بعینہٖ ہر قوم اپنی جداگانہ نظریاتی حیثیت یا کردار رکھتی ہے۔

وہ کون سے فطری عوامل ہیں جو ہمیں ایک قوم بناتے ہیں؟

ہم محض اس لئے ایک الگ قوم نہیں ہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مصنوعی حالات نے ہمیں ایسا بنا دیا ہے، بلکہ اس لئے ایک قوم ہیں کہ بعض قدرتی اسباب اور فطری عوامل ہماری قومیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ مسلمان قوم کی تعمیر کرنے والے یہ عوامل (دوسری قوموں کی طرح) علاقائی زبان، نسل، رنگ، ثقافت یا تاریخ نہیں بلکہ اسلام کے اس زندہ عقیدے پر پختہ یقین ہے۔ جس کا بنیادی پتھر خدائے واحد پر ایمان لانا ہے۔

ہمارا وطن پاکستان جغرافیائی لحاظ سے کئی خطوں میں تقسیم ہے۔ ان میں سے ہر خطہ اپنی جداگانہ ثقافت تاریخ اور زبان رکھتا ہے۔ ایک خطہ (مشرقی پاکستان) دوسرے چار خطوں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اندریں حالات اگر ہر خطہ اپنی علاقائی زبان، تہذیب و ثقافت، تاریخ یا نسل کو اپنی توجہ کا مرکز اور قومی آئیڈیل بنا لے تو قومی کردار کی تعمیر کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر تمام خطے اسلامی نظام حیات کو مشترکہ آئیڈیل کے طور پر اپنا لیں تو نہ صرف علاقائی زبان، نسل، تہذیب و ثقافت اور تاریخ و تمدن کے بت پاش پاش ہو جائیں گے بلکہ ملی شعور اور قومی کردار بھی فروغ پا سکے گا۔

پاکستانیوں میں اعلیٰ اور بلند پایہ قومی کردار کیسے فروغ پا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب ہم ''کردار کی تعریف'' کے ضمن میں دے چکے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قومی کردار ان عادات و خصائل، میلانات و مرغوبات، عقائد و خیالات، جذبات و محسوسات اور اُمنگ و خواہشات کے مجموعہ کا نام ہے جو کسی قوم کے افراد میں مشترک طور پر پائے جاتے ہوں اور ان کی بنیاد ایک مشترک نصب العین پر ہو۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اگر ہم اپنے قومی کردار کی تشکیل اعلیٰ اور بلند ترین پیمانے پر کرنا

چاہتے ہیں تو ہمیں ایک اعلیٰ ترین مقصد حیات اور بلند ترین آدرش کو قومی نصب العین بنانا ہوگا۔ ہمیں ایک ایسا مثالی نظریہ اختیار کرنا ہوگا جو ہر لحاظ سے دلکش، جاذبِ نظر اور درست ہو۔ وہ نظریہ ایک اور صرف ایک ہوسکتا ہے۔ یعنی اسلام کا نظریہ توحید ہم اس سے زیادہ بلند، بہتر، مکمل، سچے اور عالمگیر نظریے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

پس اگر ایک طرف ملک کے جغرافیائی حالات کے تحت اسلامی ضابطہ حیات کو قومی آئیڈیل کے طور پر اپنانا ہماری سیاسی ضرورت ہے تو دوسری طرف اعلٰے درجے کا قومی کردار پیدا کرنے کے لئے ہماری نفسیاتی ضرورت بھی ہے۔ اس کے علاوہ ہماری فطرت کے غیر متحکم اصول بھی یہی ظاہر کرتے ہیں کہ بلند مرتبہ قومی کردار صرف اسی صورت میں اُبھر سکتا ہے جب ہم اعلیٰ ترین اصولوں کو قومی نصب العین بنائیں اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یہ نصب العین صرف اسلام ہوسکتا ہے۔

اسلامی نظریہ حیات کو قومی آئیڈیل بنانے کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ خدا پر ہمارا غیر متزلزل اور مستحکم یقین ہو۔ یہ اس یقین محکم ہی کا کرشمہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے سے کہیں طاقتور اور با اثر انگریز اور ہندو قوم سے ٹکر لی اور اپنی جدو جہد میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کر کے پاکستان بنالیا۔ اس کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے نظریہ سے جنوں کی حد تک پیار کریں۔ ہماری زندگی کے سیاسی، اخلاقی، عسکری، قانونی، معاشی، تعلیمی اور معاشرتی غرضیکہ تمام شعبوں میں اسے فیصلہ کن طاقت کا مقام حاصل ہو۔ ہم جس قدر جلد یہ قدم اُٹھا سکیں۔ ہمارے حق میں اسی قدر بہتر ہے۔

جب ایک آدرش یا آئیڈیل کے ساتھ کسی فرد یا قوم میں سچی محبت پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے تمام عقائد ونظریات، خیالات ومحسوسات، میلانات ومرغوبات، عادات و اطوار، علم و عرفان، ارادے اور طریق کار، اُمنگ اور خواہشات پر اس آئیڈیل کی گہری چھاپ لگ جاتی ہے۔ گویا ایک نصب العین شخصی یا قومی کردار کی اسی طرح تعمیر کرتا ہے، جس طرح مناسب کاشت اور آبپاشی سے ایک بیج کا دانہ تناور درخت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ مناسب تعلیم وتربیت سے ہم قومی آئیڈیل کو قومی کردار میں ڈھال سکتے ہیں ایک بیج سے وہی پودا اُگتا ہے جس کی قوتِ نمو اس بیج

میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ہم ایک قومی نصب العین منتخب کرکے اسی نوعیت کا قومی کردار پیدا کر سکتے ہیں،جس کی صلاحیت اس نصب العین میں ہوگی۔خدا کا تصوراپنی فطرت کے اعتبار سے وہ واحد نظریہ حیات ہے،جس سے بہترین اوراعلیٰ پایہ کا قومی کردارفروغ پاسکتا ہے۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ہمیں اسلام کے محض مسلمہ اخلاقی اصولوں مثلاً مساوات انسانی،آزادیٔ انصاف،صداقت،اخوت،جرأت،بردباری اوردیانتداری وغیرہ کواپنا لینا چاہیے اورنظریہ توحید پرزیادہ زورنہیں دینا چاہیے۔اس سے قومی کردار کی تشکیل میں بڑی آسانی ہوجائے گی۔لیکن ایسا کرنا ہمارے لئے عملاً ناممکن ہے کیونکہ مسلمہ عالمگیراخلاقی اصول نظریہ توحید کی اسی طرح وکالت کرتے ہیں جس طرح کسی درخت کا بیج خاص قسم کے پتوں اور پھولوں کی نشان دہی کرتا ہے۔اگرکوئی شخص تازہ اورمہکتے ہوئے پھولوں کا شوقین ہے تو اسے خوداپنے باغ میں ان پھولوں کا پودالگانا اوراس کی نگہداشت کرنی ہوگی ورنہ اسے باسی،پژمردہ اورکاغذی پھولوں پراکتفا کرنا پڑے گا،جس طرح پھول درخت سے ٹوٹنے کے بعدمرجھا جاتے ہیں۔اسی طرح سچے اور عالمگیراخلاقی اصول اپنے اصل سرچشمہ توحید سے کٹنے کے بعدمردہ اوربے معنی ہوجاتے ہیں۔اگر ہم کسی شخص سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ ان اخلاقی اصولوں کی پیروی کرے تو پہلے ہمیں یہ تسلی کرنی ہوگی کہ وہ خدا کوآئیڈیل بنائے اوراس آئیڈیل سے سچا اوربھرپور پیار کرے۔چونکہ سچے اور عالمگیراخلاقی ضابطوں کا منبع وسرچشمہ نظریہ توحید ہے،اس لئے ان پروہی شخص عمل پیرا ہوسکتا ہے جواس نظریئے کا قائل اورچاہنے والا ہو۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہرشخص اپنی پسند کے مطابق کسی نہ کسی نظریئے سے محبت کرتا ہے۔اگراسے نظریہ توحید پسند نہیں تو لازماً اس سے فروترکسی دوسرے نظریے کواعمال کا مرکز بنائے گا اوراسی کوایسا معیار مان لے گا جس پر برے اور بھلے،سچے اور جھوٹ،دلکش اور بدنما کو پرکھا جاسکے۔اسی نظریے کی روشنی میں وہ یہ طے کرے گا کہ کس چیز کوقبول کیاجائے اورکس کومسترد،کس سے محبت کی جائے اورکس سے نفرت،کونسا کام کیا جائے اورکونسا نہیں۔اگرایسا شخص زبان سے اخلاقی اصولوں کی پیروی کا دم بھرتا ہےتوسمجھ لویا تو وہ دانستہ اپنے باطل نظریات کوچھپا رہا ہے یاان کی حقیقت سے پوری طرح آگاہ نہیں ہے۔یعنی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں ماررہا ہے۔جس طرح ہم ببول کے درخت سے آم حاصل نہیں کرسکتے،بالکل اسی

طرح غلط نظریہ حیات کو اپنا کر اچھے قومی کردار کی توقع نہیں کر سکتے۔

بظاہر برطانیہ، فرانس، اٹلی، امریکہ اور دنیا کے دوسرے غیر کمیونسٹ ممالک میں خدا پر ایمان ایک مسلمہ اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم وہاں خدا کو آئیڈیل کا درجہ حاصل نہیں، ان کا آئیڈیل سیکولر نیشنلزم ہے۔ ان کے نزدیک سیکولر نیشنلزم آئیڈیل کی ان پانچوں شرطوں پر پورا اترتا ہے جو ہم ابتدا میں بیان کر آئے ہیں۔ نظریہ توحید ان کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ انگریز قوم کی اکثریت اگرچہ خدا کو مانتی ہے لیکن عملاً نیشنلزم ان کے نزدیک تمام نظریات سے بالاتر اور پسندیدہ ہے اور نظریہ توحید کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ ان کے تمام اعمال و افعال، عقائد و نظریات، اقدار و روایات اور جذبات و میلانات کا معیار نیشنلزم (جذبہ قومیت) ہے نہ کہ خدا کا تصور۔ اگر کسی معاملے میں دینی تقاضے قومی تقاضوں سے متصادم ہوں تو انگریز قوم بے دھڑک دینی تقاضوں پر قومی تقاضوں کو ترجیح دیتی ہے۔ ایک لادین اور نیشنلزم کی پجاری قوم سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

پاکستان میں متعدد مذاہب کے پیرو موجود ہیں مثلاً مسلمان، عیسائی، ہندو اور پارسی۔ اس لئے ہمیں ریاست کے سرکاری فلسفہ میں توحید اور اس سے وضع کئے گئے ان معروف و مسلمہ اخلاقی اصولوں کو شامل کرنا چاہیے۔ جن کے بارے میں مختلف مذہبوں کے درمیان کوئی اختلاف رائے نہیں۔ ایسا کرنا نہ صرف ملکی حالات کا تقاضا ہے بلکہ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق۔ چنانچہ اس سلسلے میں قرآن پاک کہتا ہے:

> ''اے اہل کتاب! اس اصول کی طرف لوٹ آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان قدر مشترک ہے۔ یعنی ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور اپنے ہم جنسوں کو اپنا آقا و مالک نہیں مانتے''۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ ہم سرکاری طور پر ایک ایسے بنیادی اور مشترک اصول کو اپنے نظریہ حیات کی اساس بنالیں گے جو پاکستان کے تمام مذہبی فرقوں کے فلسفہ حیات کا سنگ بنیاد ہے۔ اس طرح تمام مذہبی فرقوں کے اہم ترین جذبات، مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھا کر سارے فرقوں کو ایک متجانس- (Homo Genous) قوم میں ڈھال سکیں گے۔ پوری قوم کا

ایک مشترک آئیڈیل ہوگا، جسے اپنانے میں ہم مسرت اور فخر محسوس کریں گے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ فرقہ وارانہ اور مذہبی اختلافات پر اس حد تک قابو پالیا جائے گا کہ ہر فرقہ اپنی حد تک انہیں عزیز رکھے۔ اس طرح فرقہ وارانہ کشیدگی اور تلخی ختم ہو جائے گی۔ اس مشترک فلسفہ حیات کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے فرقوں کو ان کے مذہب کے مطابق عقیدہ اور عمل کی مکمل آزادی دی جاسکے گی۔ اس سے ایک طرف ہم غیر مسلم اقلیتوں کے عقائد وعبادات میں مداخلت سے باز رہ سکیں گے، دوسری طرف اس فلسفہ حیات سے انہیں اضافی مدد مہیا کرسکیں گے۔ اس سے ملک کے تمام فرقوں (مسلمان، عیسائی، ہندو، پارسی) کے درمیان یگانگت اور ہم آہنگی بڑھے گی۔ تمام فرقے خدا کے ایک کنبے کی مانند رہ سکیں گے۔ جس میں مذہب کی بنیاد پر ایک دوسرے کے خلاف نفرت یا بدخواہی کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ سب فرقے ایک مشترک قومی احساس کے تحت اتحاد اور تعاون کی فضا میں کام کرسکیں گے۔

سچے محبّ وطن پاکستانی کی حیثیت سے ہمیں اس بات پر خاص توجہ دینی ہوگی کہ یہاں کا ہر شہری خدا تعالیٰ پر ایمان کو ایک ایسی زندہ اور فعال قوت بنالے جو اس کی سرکاری و غیر سرکاری سرگرمیوں پر غالب ہو۔ اس کے لئے ہمیں ایک مخصوص نظام اختیار کرنا ہوگا، جو ہمیں منزل مقصود تک پہنچادے۔

کسی قوم کے اتحاد، سالمیت اور کارکردگی کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ اس کے سامنے کوئی واضح مقصد اور نظریہ حیات ہے یا نہیں؟ اگر کوئی نظریہ ہے تو قوم میں اس کے لئے کتنی تڑپ اور لگن موجود ہے؟ یہ نظریہ ان کے قومی مزاج اور روایات کے مطابق ہے یا نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو آیا اس آئیڈیل میں ایسی خوبیاں موجود ہیں جو خود بخود لوگوں کے دلوں میں گھر کر جائیں۔ اگر اس میں ایسی خوبیاں موجود نہیں تو بڑے سے بڑا معلم بھی اپنے تعلیمی منصوبوں اور انتظامات کے باوجود لوگوں کے جذبات کو اس حد تک بیدار نہیں کرسکتا کہ لوگ اس نظریے پر فریفتہ ہو جائیں۔ اگر کسی نظریے میں داخلی اور باطنی خامیاں موجود ہیں تو اس سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے ہم پاکستانی اس لحاظ سے بڑے خوش نصیب ہیں کہ ہمارے پاس ایسا نصب العین موجود ہے جو تمام شرطیں پوری کرتا اور اپنے اندر جملہ خوبیاں رکھتا ہے۔

جونظریات مصنوعی اور نمائشی طور پر کسی قوم کو عزیز ہوں انہیں خود ہی قوم چیلنج کر دیتی ہے مثلاً بھارت میں وہاں کی اقلیتوں نے انڈین نیشنلزم کے نظریہ کو چیلنج کر دیا ہے خدا کا شکر ہے کہ ہمارا نصب العین ایک حقیقی اور قابل عمل ہے۔ وہ ہمارے مزاج، روایات اور نفسیات سے پوری مطابقت رکھتا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے کہ اسے دل کی گہرائیوں میں جگہ دیں۔ کمیونسٹوں سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں انسان کی تمام تر ترقی کے باوجود خدا کا تصور آج بھی اتنا ہی ہر دلعزیز، نیا، تازہ اور جبلت انسانی کے قریب ہے، جتنا پہلے کبھی تھا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بنی نوع انسان کو اس نظریے کی آج جتنی ضرورت ہے شاید ماضی میں کبھی نہ تھی۔

موجودہ دور میں انسانی حالات کا جو مفکرانہ مطالعہ کیا گیا ہے، اس کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ قومی نصب العین کے طور پر سیکولر نیشنلزم کی بنیادیں متزلزل ہو رہی ہیں اور اس کی جگہ انسان اور کائنات کے مختلف نظریات لے رہے ہیں۔ دنیا کی جدید ترین ترقی یافتہ ریاستیں بھی دراصل نظریاتی ریاستیں ہیں۔ جنہوں نے فرد کی رہنمائی کے لئے بزعم خویش صحیح یا غلط چند اصول بنا لئے ہیں۔ ان میں روس اور چین ہی نہیں امریکہ بھی شامل ہے۔ کیونکہ امریکی قوم کے نزدیک جمہوریت نہ صرف ایک بہترین نظام حکومت ہے بلکہ ایک نظام حیات بھی۔ چنانچہ انہوں نے جمہوریت کو قومی آئیڈیل بنا لیا ہے۔ بہت سی قومی ریاستیں جو کسی زمانے میں آسمان سیاست پر درخشندہ ستاروں کی طرح چمکتی تھیں، آج روبہ زوال ہیں۔ بعض نئی قومی ریاستیں بھی جوان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کر رہی ہیں اسی صورت حال سے دوچار ہیں اور تیزی سے کمیونزم کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ آج نیشنلزم کی مٹی اس طرح پلید ہو رہی ہے جیسے ماضی میں قبائلی نظام کی ہوئی تھی۔

ارتقا کی تند و تیز لہریں نسل انسانی کو ایک ایسی عالمی ریاست کی طرف کشاں کشاں لیے جا رہی ہیں جس کی اساس انسان اور کائنات کے فلسفہ پر ہوگی۔ ظاہر ہے یہ فلسفہ کمیونزم نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم اس بات کو درست تسلیم کر لیں کہ ارتقائی عمل تیزی سے اس نقطۂ عروج تک پہنچنا چاہتا ہے، جہاں پوری دنیا ایک مکمل معاشرے کی شکل اختیار کرے گی۔ تو ہمیں یہ بات بھی لازماً ماننا پڑے گی کہ اس معاشرے کی بنیاد ایک مکمل اور جامع نظریے خدا کے تصور پر ہوگی۔ انسانی ارتقا

جو دراصل نظریاتی ارتقا ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر اہل پاکستان خدا کے تصور کو اپنا قومی آئیڈیل بنالیں تو پاکستان آئندہ وجود میں آنے والی عالمگیر ریاست کا نقطۂ اجتماع اور مستقبل کے مکمل ترین معاشرے کا مرکز ہوگا۔ اس کے علاوہ اپنے قومی نظریہ کی بنیاد پر پاکستان دوسری اقوام کے ساتھ خیر سگالی اور دوستی کے رشتے بھی قائم کر سکے گا۔ دوسری ریاستوں کے ساتھ ایسے دوستانہ تعلقات اسی صورت میں قائم ہو سکتے ہیں جب عالمگیر ریاست کے شہریوں کو پاکستان پر اعتماد ہو۔ دوسری اقوام کے ساتھ اس کا سلوک منصفانہ اور دیانتدارانہ ہو اور عالمی اتحاد قائم کرنے کے لئے خود پاکستان دوسروں کے ساتھ تعاون کرے۔ اگر خدا ترس اور خدا سے محبت کرنے والی قومیں بھی اپنے معاملات میں انصاف پسند، دیانتدار پرامن اور قابل اعتماد ثابت نہ ہوں، تو دوسری قوموں سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔

میں اس مقالے کو علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے ارشادات سے دو اقتباسات پر ختم کرتا ہوں۔ جنوری 1938ء میں ''سالِ نو کے پیغام'' میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

> ''دنیا بھر کے مفکر اور دانشور حیران و پریشان ہیں، کیا جدید تہذیب اور ارتقا کا انجام یہی ہوگا کہ انسان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن جائیں اور رُوئے زمین پر حیات انسانی کا وجود ناممکن ہو جائے؟ یاد رکھو! انسان دنیا میں فقط اسی صورت میں زندہ رہ سکتا ہے اور ترقی پا سکتا ہے جب وہ انسانیت کا احترام کرنا سیکھ لے۔ جب تک انسان، انسانیت کا احترام کرنا نہیں سیکھتا، یہ دنیا خونخوار درندوں کی شکار گاہ بنی رہے گی، قوموں کے درمیان صرف وہی اتحاد پائیدار اور قابل اعتماد ہوسکتا ہے۔ جس کی بنیاد برابری پر ہو، جو نسل، قومیت، رنگ اور زبان کے امتیازات سے پاک اور بالاتر ہو جب تک یہ نام نہاد جمہوریت، یہ منحوس نیشنلزم اور یہ ذلیل ملوکیت فنا نہیں ہو جاتی اور لوگ اپنے اعمال سے اس یقین کا اظہار نہیں کرتے کہ پوری دنیا خدا کا کنبہ ہے۔ جب تک دنیا میں نسل، رنگ اور جغرافیائی قومیتوں کے بت موجود ہیں، انسان ایک خوشحال اور سکون بخش زندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اخوت، مساوات اور آزادی کے دلکش نعرے محض ایک ڈھونگ ہیں۔''

اس طرح جون ۱۹۴۵ء میں ایک تقریر کے دوران قائداعظم نے فرمایا:

''حصولِ پاکستان سے ہمارا مقصد محض آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ اس اسلامی نظریہ حیات کو فروغ دینا ہے جو قدرت کی طرف سے ہمیں قیمتی عطیے اور بیش بہا خزانے کی شکل میں ملا ہے۔ اُمید ہے کہ دوسری قومیں بھی اس سلسلے میں ہم سے تعاون کریں گی۔''

اسلامی نظریہ حیات کے فروغ میں دوسری قومیں اس طرح تعاون کرسکتی ہیں کہ وہ بھی اس نظریے کے اہم ترین جز ویعنی خدا کے تصور اور اس سے ماخوذ عالمگیر اخلاقی اصولوں کو اپنالیں۔ اس لئے صرف یہی نظریہ ہمارے اعلی اور بلند پایہ قومی کردار کی بنیاد بن سکتا ہے۔

3

مستقبل کا نعرۂ انقلاب

ڈاکٹر محمّد رفیع الدین

(مجلّہ اسلامی تعلیم، نومبر، دسمبر 1973ء)

دنیا کے مفکرین کے سامنے اس وقت سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ''انسان کی حقیقت کیا ہے؟'' ابھی تک مغرب کے دانشور جو دنیا کے فکری امام تصور کیے جاتے ہیں اس سوال کا ایسا معقول جواب نہیں دے سکے جو انسانی فطرت اور انسانی تاریخ کے معروف و مسلمہ حقائق سے ہم آہنگ ہو اور ذہن و فکر کو مطمئن کر سکے۔ وہ اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ موجودہ بحران جس نے عالمگیر جنگوں کو جنم دیا اور جس کی بدولت نہ صرف تہذیب جدید کی مکمل تباہی کا خطرہ پیدا ہوا بلکہ نسل انسانی کے مٹ جانے کا امکان محسوس ہونے لگا ہے، کا واحد سبب انسان کی خود اپنی فطرت کے علم سے بے خبری ہے۔ علم فطرت کے بغیر مادّی سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی انسان کے لیے خطرناک ثابت ہو رہی ہے۔ چنانچہ ایک مشہور ماہر نفسیات سکنر اپنی کتاب SCIENCE AND HUMAN BEHAVIOUR میں لکھتا ہے:

> ''سائنس نے بے ضابطہ انداز میں فروغ پایا ہے۔ سائنسدانوں نے آسان مسائل کو پہلے حل کر کے بے جان مادہ پر ہماری گرفت وسیع تر کر دی ہے، لیکن مادہ کے بعد پیش آنے والے معاشرتی مسائل کے لیے انہوں نے کوئی تیاری نہیں کی، حالانکہ معاشرتی علوم سائنس کی ترقی کے بغیر مادّی علوم کا فروغ بے کار ہے اور یہ کہ معاشرتی علوم کی ترقی سے ہی صحیح نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔''

ایک اورمعروف ماہرنفسیات میک ڈوگال اپنی تصنیف THE WORLD CHAOS میں رقم طرز ہے:

''فطرت انسان کے علم سے ہماری بے خبری کے سبب معاشرتی علوم کی ترقی ماضی میں بند رہی اوراب بھی بند ہے۔ معاشرتی علوم، سائنس کا فروغ جدید دور کی اہم ترین ضرورت ہے ان علوم کے فروغ نہ پانے سے ہماری تہذیب کے زوال بلکہ مکمل تباہی کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔''

انسان کی حقیقت کو صحیح انداز میں سمجھنے کے لیے ہمیں اس فرق کو مدنظر رکھنا ہوگا جو انسان اورحیوان میں پایا جاتا ہے۔ بے شک حیوان بھی انسان کی طرح خواہشات و جذبات سے مرکب ہے لیکن ان دونوں میں مراتب کا نہیں، طبقے کا فرق ہے۔ نہ انسان، حیوان کی اعلیٰ ترین ترقی یافتہ صورت کا نام ہے، نہ ہی حیوان انسانیت کی کمتر شکل ہے۔ دونوں دو الگ الگ طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔

فرض کیجئے! آپ ایک ایسی بگھی دیکھتے ہیں جس میں ایک درجن گھوڑے جتے ہیں۔ ہر گھوڑا اپنی مرضی کے مطابق بگھی کو کھینچتا ہے، بگھی کبھی دائیں کو مڑتی ہے کبھی بائیں کو اور کبھی جھٹکے کے ساتھ کھڑی ہوجاتی ہے۔ بگھی کی نقل وحرکت دھچکیوں سے بھرپور ہے۔ آپ فوراً سمجھ جائیں گے کہ بگھی میں گھوڑوں کو ہانکنے والا کوچوان موجود نہیں۔ اس لیے یہ سرکش گھوڑے من مانی کررہے ہیں۔ اس کے بالمقابل ایک دوسری بگھی جارہی ہے۔ اس میں بھی اتنے ہی گھوڑے جتے ہیں، لیکن وہ ایک خاص سمت میں بڑے ٹھہراؤ اور وقار کے ساتھ جارہی ہے۔ راستے کے نشیب وفراز اورموڑ خوش اسلوبی اوراعتماد کے ساتھ طے کرتی ہے۔ اس صورت میں آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ بگھی میں کوچوان موجود ہے جوگھوڑوں کو قابو میں رکھتا ہے۔ تاکہ بگھی کی حرکت تیز رفتاری کے ساتھ ساتھ مطلوبہ سمت میں جاری رہے۔ حیوان اوّل الذکر بگھی کی مانند ہے۔ جس کی خواہشات و جذبات کو کنٹرول کرنے والا کوئی نہیں، اس کی ہر خواہش جسے نفسیات کی اصطلاح میں جبلت (INSTINCT) کہتے ہیں، آزاد ہوتی ہے اوردوسری تمام جبلتوں کو نظر انداز کرکے اپنی تسکین کرنا چاہتی ہے، حیوان کی جبلت جامد اورناقابل اصلاح ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات اورنسل کی بقا کے لیے

مخصوص انداز میں کام کرتی ہے، جب کوئی جبلت بیدار ہوتی ہے تو حیوان اپنے داخلی حیاتیاتی دباؤ کے ہاتھوں مجبور ہوکر کسی نہ کسی سرگرمی کا آغاز کرتا اور اسے پایہ تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ حیوان اپنی کسی جبلت کی روک تھام پر قادر نہیں ہوتا۔ نہ کسی اعلیٰ نصب العین کے لیے کسی جبلت کو محدود کرسکتا ہے۔ حقیقت میں اس کے سامنے کوئی اعلیٰ آورش ہوتا ہی نہیں۔ اگر وہ کسی جبلت کو دبانے پر مجبور ہوجائے تو یہ مجبوری رضا کارانہ نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جبلت دوسری کو روکتی ہے یعنی طاقتور جبلت کمزور کو دبا کر اس کی جگہ لے لیتی ہے اور کمزور اس کے لیے جگہ چھوڑنے پر مجبور ہوتی ہے۔

انسان کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی شخصیت ایسی بگھی کی مانند ہے جسے کوئی کوچوان چلا رہا ہو۔ انسان میں اعلیٰ درجہ کے حیوان کی جملہ خصوصیات مثلاً بچوں کی پرورش، جنسی خواہش، فرار، جھگڑالو پن، خودنمائی اور خود پسندی وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ تاہم حیوان کے برعکس وہ اس بات پر قادر ہے کہ اپنی کسی جبلت کی تسکین کو اپنی مرضی کے مطابق محدود کرسکے تاکہ تمام جبلتوں کی ایک منتخب سمت میں منظّم اور متحد طریق سے رہنمائی کرسکے۔ حیوان کی طرح جبلتوں کی یہ روک تھام خود بخود اور غیر رضا کارانہ نہیں ہوتی بلکہ رضا کارانہ انتخاب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان اپنی خواہشات کی ایسے انداز میں روک تھام کرتا ہے کہ کسی خاص جبلت کی خواہش اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے۔ چنانچہ اکثر اوقات وہ اپنی جبلتوں سے فاقہ کشی کراتا ہے۔ بعض اوقات اپنی وہ زندگی بھی جبلتوں کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے جس کے لیے یہ تمام جبلتیں سرگرم عمل ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اپنے عمل کے لیے منتخب راستہ بھی چھوڑ دیتا ہے۔ حیوان کی زندگی جداگانہ سرگرمیوں سے عبارت ہوتی ہے۔ ہر سرگرمی کسی نہ کسی خواہش کی مغلوب ہوتی ہے اور اس کے مختلف مرحلوں میں کوئی رابطہ نہیں پایا جاتا۔ دوسری طرف انسان کی تمام سرگرمیاں اکائی کی صورت منظّم ہوتی ہیں۔ ہر سرگرمی کی خواہ وہ کسی حد تک بڑھنے کی مجاز ہو ایک خاص انداز میں رہنمائی کی جاتی ہے اور اسے قابو میں رکھا جاتا ہے تاکہ وہ نامیاتی طور پر کل کا حصہ بن جائے۔ انسان میں پایا جانے والا جبلتوں کا یہ نظم وضبط، اتحاد، تسلط اور رہنمائی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس میں ایسی زبردست خواہش موجود نہ ہو جو دوسری تمام خواہشوں پر غلبہ پاسکے اور ان پر حکم چلاسکے۔ یہی خواہش یا جبلت وہ پراسرار قوت ہوتی ہے جو انسانی شخصیت کی بگھی کو چلاتی ہے۔ اس جبلت کو سمجھنا

انسان کی حقیقت سے باخبر ہونے کے مترادف ہے کیونکہ یہی خواہش انسان کی جملہ سرگرمیوں خواہ وہ سیاسی، قانونی، عسکری، معاشی، اخلاقی، تعلیمی، فکری اور مذہبی ہوں یا فنکارانہ کا سبب ہوتی ہے۔ اسی جبلت نے تاریخ کو موجودہ شکل بخشی کیونکہ تاریخ انسانی شخصیت کی بگھی کے کوچوان کی اس طویل کوشش کے سوا کچھ نہیں، جس کا مقصد انسان اور معاشرہ کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے۔

گویا انسانی سرگرمیوں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی کی نوعیت اور ان کی غرض وغایت کو اس وقت تک سمجھنا ناممکن ہے جب تک ہم انسانی شخصیت کی بگھی کو ہانکنے والے ڈرائیور کی حقیقت اور اس کے نصب العین یا منزل مقصود سے آگاہ نہ ہوں دوسرے الفاظ میں تاریخ، سیاسیات، اخلاقیات، تعلیمات قانون، معاشیات، مذہب، فن، سائنس اور جنگ کے فلسفہ پر کسی مصنف کو اس وقت تک طبع آزمائی کرنے اور دوسروں کے سامنے اپنا فلسفہ پیش کرنے کا کوئی حق نہیں، جب تک اس کے فلسفہ کی بنیاد اس جبلت پر نہ ہو جو انسانی سرگرمیوں کی قوت محرکہ ہے۔ اس خواہش کی نوعیت کے بارے میں اس کا علم ناقص اور منطق وعقلیت معیار سے فروتر ہوسکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی صاحب قلم اس جبلت سے کلیۃً صرفِ نظر کر کے اپنا فلسفہ پیش کرے گا تو وہ فلسفہ کی ابتدائی شرطوں پر بھی پورا نہیں اترے گا اور نہ اہل دانش کے نزدیک کسی غور وفکر کو مستحق ہوگا۔ ایسے مصنف کا ذہن آغاز سے ہی پراگندہ ہوگا۔ اس لیے وہ جن نتائج تک پہنچے گا، وہ عقل وخرد سے عاری اور شیخ چلی کی قیاس آرائیوں کے مترادف ہوں گے۔

بلاشبہ دنیا کی تمام زبانوں میں تاریخ، سیاسیات، اقتصادیات، تعلیمات، اخلاقیات، قانون اور فن کے فلسفہ پر ہزارہا کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن افسوس ان کے مصنّفین میں سے ایک بھی ایسا نہیں نکلا جس کے فلسفہ کی بنیاد اس انسانی جبلت کے متعلق کسی واضح اور قطعی نظریہ پر ہو، جو انسان کے جملہ اعمال وافعال کا سرچشمہ اور ان کی محرک قوت ہے۔ البتہ کارل مارکس کو اس سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہے، اس نے اپنے معاشی نظریہ میں جسے انسان اور کائنات کے بارے میں ایک مکمل نظریہ کہا جاسکتا ہے۔ انسانی جبلت کو خاص مقام دیا ہے اس لیے وہ قابل مطالعہ ہے لیکن جب گہری نظر سے اس کا مطالعہ کیا جائے تو وہ بھی منطق اور عقلیت کے معیار پر پورا نہیں اترتا اور ذہن اسے مسترد کر دیتا ہے۔

آیئے اب ذرا یہ جاننے کی کوشش کریں کہ انسانی شخصیت اور اس کی سرگرمیوں کو مہمیز کرنے والی قوت کی حقیقت کیا ہے؟ مغرب کے جن مفکرین نے انسانی فطرت کے بارے میں خامہ فرسائی کی ہے، وہ اس بات پر متفق ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایک نہ ایک نظریے سے محبت کا جذبہ ودیعت ہوتا ہے، دوسری مخلوقات چونکہ حیاتیاتی ارتقا میں انسان سے نچلی سیڑھی پر ہیں، اس لیے اس جذبے سے محروم ہوتی ہیں۔ لیکن ان دانشوروں نے اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ انسانی افعال کو حرکت میں لانے والی اور اس کی شخصیت کو کنٹرول کرنے والی یہی خواہش ہوتی ہے۔ ڈارون کے جدید نظریہ کی تقلید میں انہوں نے اس بات کو قبول کرلیا کہ کائنات کی ارتقاتی ترتیب میں سب سے پہلے مادّہ، پھر حیوان اور آخر میں انسان آتا ہے۔ وہ نظریات سے محبت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر انسان میں کوئی صلاحیت پائی جاتی ہے جس سے حیوان محروم ہیں تو یہ صلاحیت لازماً حیوان کی ایک یا ایک سے سے زیادہ جبلتوں سے پیدا ہوئی ہے جس کی غایت تخلیق دوسری جبلتوں کی مدد کرنا ہے۔ گویا وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ خواہش یا صلاحیت ایک یا زیادہ جبلتوں سے ماخوذ ہے اور یہ کسی نہ کسی نظریہ سے محبت کرنے کا نام ہے، ایسا نظریہ جس میں ایک شخص کی رائے کے مطابق دلکشی اور جامعیت کی خوابیاں موجود ہوں۔

کارل مارکس اس جبلت کو پرورش کرنے (FEEDING) کی خواہش کہتا ہے۔ اس کے ساتھ دوسری معاون جبلتیں ہیں جو انسان کی معاشی ضرورتوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ فرائڈ نے اسے جنسی خواہش کا نام دیا ہے۔ جب یہ خواہش پوری نہیں ہوتی تو نظریات سے لگاؤ کی جبلت جنم لیتی ہے۔ ایڈلر کی رائے میں یہ اقتدار کی خواہش ہے اور نظریات اسی خواہش کی جھوٹی نمائندگی کرتے ہیں۔ میک ڈوگال کے نزدیک حیوانی جبلتیں ہی انسان کی قوت عمل کو مہمیز کرتی ہیں اور کسی نظریہ سے اس کا لگاؤ تمام جبلتوں سے مرکب ہوتا ہے۔ یہ خواہش ایک خاص جبلت ___ خودی ___ (SELF-ASSARTION) کی معاون ہوتی ہے۔

لیکن مذکورہ بالا دانشوروں میں سے کسی کا بھی پیش کردہ نظریہ انسانی فطرت اور تاریخ کے حقائق سے مطابقت نہیں رکھتا۔ ان کے نظریات کو تنقید کی ترازو میں تولا جائے تو ایک بھی پورا نہیں اترتا۔ ان نظریات میں یہ خامی قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ کسی میں بھی اس بات کی

وضاحت پیش نہیں کی گئی کہ ایک یا زیادہ جبلتیں جن کا مقصد زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ انسان میں کسی نظریہ کے متعلق ایسا جذبہ کیسے پیدا کر دیتی ہیں کہ یہ جبلتیں اس نظریے کے لیے فاقہ کشی کرتی ہیں، بلکہ جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتیں۔ ان کی توضیحات میں یہ بات نہیں ملتی کہ یہ جبلتیں جو انسان اور اعلیٰ پایہ کے حیوان میں یکساں پائی جاتی ہیں، حیوان میں کسی نظریے کی چاہت کا جذبہ بیدار نہیں کر سکتیں تو وہ انسان میں اس جذبے کو کیسے پیدا کر سکتی ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی اعمال و کردار کو حرکت میں لانے اور قابو میں رکھنے والی قوت اس خواہش کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی جو صرف انسان کے ساتھ مخصوص ہے، حیوانات میں نہیں پائی جاتی اور جسے نظریات سے لگاؤ کی جبلت کا نام دیا جاتا ہے۔

بڑے بڑے ماہرین نفسیات اس حقیقت کے قائل ہیں کہ حیوان صرف سوچنے، محسوس کرنے اور جاننے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن انسان ان صلاحیتوں کے علاوہ اپنے اندر ان صلاحیتوں کی موجودگی کا شعور بھی رکھتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حیوان کا شعور صرف مادّی اور خارجی اشیاء تک محدود ہوتا ہے۔ اپنی ذات کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا جبکہ انسان مادّی اور خارجی اشیاء کے علاوہ اپنی ذات سے بھی آگاہ ہوتا ہے۔ اس خود آگاہی کو نفسیاتی اصطلاح میں ''خودی'' کہتے ہیں۔ انسان میں پائی جانے والی یہی وہ صلاحیت ہے جو اسے حیوان سے ممیّز کرتی ہے۔ انسان کو کسی نہ کسی نصب العین سے محبت کرنا سکھاتی ہے۔ قومی نصب العین قوم کے نظریہ حیات کی روح ہوتا ہے۔ جب اس نصب العین کو فطری سرگرمیوں کے مختلف پہلوؤں میں رچایا بسایا جاتا ہے تو وہ ترقی پا کر نظریہ بن جاتا ہے۔

یہ رائے کہ انسانی سرگرمیوں کو انگیخت کرنے والی قوت اس کے نظریات ہوتے ہیں، نہایت سادہ، قابل فہم نیز انسانی فطرت اور تاریخ کے مسلمہ حقائق کے عین مطابق ہے۔ موجودہ نظریاتی دور نے تو اس کی افادیت اور بھی ثابت کر دی ہے۔ اس لیے اسے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں ہونا چاہیے اگر اس حقیقت کو قبولیت عامہ حاصل ہو جائے تو انسانیت فکری انقلاب کی شاہراہ کا دور پہلا مرحلہ طے کر سکتی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور جس کے سوا گزرنے کا کوئی اور راستہ نہیں۔ یہ تصور انقلابی تعبیریں رکھتا ہے۔

چونکہ انسان کا نصب العین دلکشی اور تکمیل سے متعلق اس کے تصورات کے ماخوذ ہوتا ہے لہٰذا وہ سب سے پہلے یہ بتا تا ہے کہ انسان میں پائی جانے والی نظریاتی خواہش کو انتہائی درجے کا خوبصورت، دلکش پسندیدہ اور جامع نظریہ ہی مطمئن کر سکتا ہے۔ اس حقیقت کو سب مانتے ہیں لیکن جب یہ پوچھا جائے کہ سب سے اچھا اور مکمل نظریہ کون سا ہے تو ان گنت جواب ملتے ہیں ایک گروہ کا خیال ہے وہ اشتراکیت یا معاشی مساوات اور معاشی آزادی ہے۔ دوسرے گروہ کی رائے میں جمہوریت یا سیاسی مساوات اور سیاسی آزادی سب سے بہتر نظریہ حیات ہے۔ بعضوں کے نزدیک ہٹلرازم، فاشزم، میکادوازم، گاندھی ازم، انگلش نیشنلزم، فرنچ نیشنلزم یا انڈین نیشنلزم کو یہ مقام حاصل ہے۔ لیکن اگر ہم ہیگل کی متعین کردہ ذاتِ الٰہی کی یہ تعریف قبول کرلیں کہ وہ ایک ایسا وجود ہے جس میں حسن و دلکشی اور جامعیت و تکمیل کی وہ جملہ خوبیاں پائی جاتی ہیں جو انسان کا ذہن سوچ سکتا ہے۔ تو واحد نظریہ ___ جو انسان کی نظریاتی جبلت کو مطمئن کر سکے، ایک خدا کا نظریہ یعنی نظریہ توحید ہی ہوسکتا ہے۔ اس نظریہ کا عملی زندگی میں نفاذ انسان کی معاشی و سیاسی مساوات اور آزادی پر منتج ہوگا۔ اس نظریہ سے محبت کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ بہترین طریقے سے معاشی اور سیاسی آزادی نافذ کی جائے۔ کیونکہ خوبصورتی کے وصف کو جسے ''قدر'' (VALUE) کہتے ہیں یا تو ایک دلکش نظریے کے جزو کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے یا بالکل نہیں۔ خوبصورتی کی قدریں باہم دگر معاون ہوتی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ایک قدر دوسری سے تعاون نہ کرے تو اسے اپنانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

نظریاتی جبلت کو انسانی شخصیت کو ڈرائیور مان لینے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ اسی جبلت کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ فرد اور قوم میں یہی کارفرما ہوتی ہے اور اسے خدا کے تصور کی طرف کھینچتی ہے۔ اگر یہ جبلت انسانی فطرت کو کسی صحیح نظریہ سے لگاؤ رکھنا نہ سکھا سکے تو لازماً اسے غلط تصور کی طرف لے جائے گی۔ اس جبلت کی پیروی کرتے ہوئے انسان اندھی گلی میں داخل ہو جاتا ہے اور غلط منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ وہاں سے اسے فوراً واپسی اختیار کرنی پڑتی ہے ورنہ اس کی شخصیت ختم ہو جاتی ہے۔

کسی فرد یا قوم کی سیاسی، اخلاقی، تعلیمی، قانونی، معاشی، منطقی، سائنسی، فنی اور فوجی

سرگرمیوں کو اُس وقت تک صحیح راستے پر نہیں ڈالا جا سکتا، جب تک ان کی منزلِ مقصود خدا کی ذات نہ ہو، خدا کے تصور کے بغیر انسان کی تمام سرگرمیاں نہ صرف اس کی قوت کو ضائع کرنے والی ہیں بلکہ قوم کے لیے ہلاکت خیز بھی۔ رُوئے زمین سے ایسی بہت سی نظریاتی قومیں اور تہذیبیں معدوم ہوگئیں جو خدا پر یقین نہیں رکھتی تھیں یا اُن میں اس یقین کے مطابق عمل کی قوت ختم ہوگئی تھی۔ اس سے یہ حقیقت بھی ثابت ہوتی ہے کہ موجودہ معاشرتی علوم کی تمام تر ترقی اپنے لادین تصور کی وجہ سے غلط اور بیکار ہے اور اس بات کی ضرورت ہے کہ انہیں ایسے انداز میں مرتب کیا جائے جس سے انہیں انسانی فطرت کی رہنما نظریاتی جبلت کو صحیح بنیاد میسر آ سکے۔ پس اس اصول کو کہ نظریاتی جبلت انسانی سرگرمیوں کو مہمیز کرنے والی قوت ہے، اس عالمگیر فکری انقلاب کا نعرہ بنایا جا سکتا ہے جو ناگزیر اور ناقابلِ مزاحمت ہے اور جس کے بعد کسی انقلاب کی ضرورت نہیں رہتی۔

پاکستان کو جو خود کو مکمل دینی ریاست میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا ہے، اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے نظریہ حیات کو فکری اور عقلی نکتہ نظر سے قابلِ قبول بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ کیونکہ فکری ترقی کے موجودہ دور میں مستحکم عقلی بنیادوں سے محروم نظریہ دوسروں کی ہمدردیاں اور تعاون حاصل نہیں کر سکتا، نہ زیادہ عرصے تک باقی رہ سکتا ہے۔ دوسری طرف نظریاتی جبلت کو انسانی سرگرمیوں کے لیے قوت محرکہ مان لینے سے پاکستان کو اپنے دینی نظریہ کے پھیلانے میں مدد مل سکتی ہے۔ یہ حقیقت ظاہر کرتی ہے کہ دینی نظریہ عقلی معیار پر پورا اترتا ہے بلکہ یہ بھی کہ کوئی دوسرا نظریہ عقلی لحاظ سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ گویا اہلِ پاکستان کو اس بات پر پوری طرح اعتبار کرنا چاہیے کہ ان کے پاس جو روشنی ہے، اس کی مدد سے وہ اپنے نظریہ کو نہ صرف خود واضح اور عام فہم انداز میں سمجھ سکتے ہیں بلکہ اسے بیرونی دنیا میں بھی اپنے نظریے کی تبلیغ کے لیے بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کو مستقبل کے پرامن اور خاموش انقلاب میں قیادت کی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں گی۔ اس گمان کو اس بات سے بھی تقویت پہنچتی ہے کہ عالمگیر فکری انقلاب کا نعرہ سب سے پہلے پاکستان میں لگایا گیا ہے۔

4

ڈاکٹر رفیع الدین کے تعلیمی نظریات

عباد اللّٰہ فاروقی

(از مجلّہ اسلامی تعلیم نومبر، دسمبر 1973ء)

ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک تعلیم ہمیشہ نظریۂ حیات سے معرضِ وجود میں آتی ہے۔ ان کا یہ نظریہ ڈیوی اور پرس نن کے نظریہ کے برعکس ہے جس کے مطابق تعلیم کسی مخصوص نظریہ حیات کی پابند نہیں ہے۔ ان کا فلسفۂ تعلیم یہ ہے کہ درسگاہ پورے سماج کا مظہر ہونی چاہیے۔ مدرسے کی چار دیواری میں وہی زندگی جاری وساری ہونی چاہیے جو پورے سماج میں جاری و ساری ہے۔ درسگاہ کی سماجی زندگی میں بچوں کو باہمی تعامل سے معاشرت کا رُکن بننا، اسی تمدن کا مظہر بننا اور انہیں روایات کے سہارے چلنا جن پر ان کے سماج کی بنیاد ہے، سیکھنا چاہیے۔

اس کے برعکس ڈاکٹر رفیع الدین کا نکتۂ نظر یہ ہے کہ ہر نظریۂ تعلیم کو اس نظریۂ حیات کی پوری وضاحت کرنی چاہیے جس کی خاطر وہ قائم ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تعلیم کے ابتدائی اصولوں میں جس نصب العین کو شامل کرنے پر زور دیا ہے وہ حسن، خیر اور صداقت پر مشتمل ہے۔ یہ نصب العین اپنے اجزاء کے مکمل ہونے کی صورت میں خالق حقیقی پر منتہی ہوتا ہے۔ مولوی سبطین احمد بدایونی اس توحیدی نصب العین کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کے زیر اثر جو چیز نمو پاتی ہے وہ انسان کا نفسیاتی وجود ہے۔ جس طرح حیاتیاتی وجود کو فطرت نے کچھ تقاضے

عطا کیے ہیں جو حفظ و بقا کا باعث ہوتے ہیں، اسی طرح نفسیاتی وجود کو ایک تقاضا دیا گیا ہے جو نفسیاتی نمو کا باعث ہوتا ہے۔ یہ تقاضا ہے حسن کی جستجو جو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ حسن کا محل صرف مادّی صورتیں نہیں ہیں بلکہ ہر خیر حسن ہے، ہر صداقت حسن ہے۔ لہٰذا انسان کو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا نصب العین ایسے تصور کو بتانا چاہیے جو سراپا حسن ہو، سراپا خیر ہو اور سراپا صداقت ہو اور ایسا نصب العین جو اِن محاسن کا مظہر کامل ہو صرف خدا کی ذات ہو سکتی ہے۔ تعلیم چونکہ نوخیز نسل کے نفسیاتی نمو کا اہتمام کرتی ہے اس لیے تعلیم کا مقصدِ اوّل بھی یہ ہونا چاہیے کہ نوعمر افراد میں اس نصب العین سے محبت اور اس کی خدمت و بندگی کا جذبہ پیدا ہو۔ تمام سرگرمیاں اور تمام آرزوئیں اسی محور پر گردش کرنے لگیں''۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تعلیمی نمو کا تقاضا انسان کی عین ذات کا تقاضا ہوتا ہے۔ جسم کا تقاضا نہیں ہوتا۔ یہ تقاضا نام ہے کسی تصور یا نصب العین کی آرزو کا جس کے متعلق یقین ہوتا ہے کہ حسن، خیر اور صداقت اس میں بدرجہ اَتم موجود ہیں۔ گویا تقاضا حسن، خیر اور صداقت طلب کرتا ہے اور انسان کا اخلاقی احساس طلب علم و ذوقِ جمال سب اسی کے تابع رہتے ہیں۔ یہ تقاضا انسان کے لاشعور سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کو فرائڈ Libido کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

بقول ڈاکٹر رفیع الدین جس طرح نصب العین بڑھ کر نظریاتی مسلک بن جاتا ہے اسی طرح نصب العین کا پرستار ایک نظریاتی ہستی یا شخصیت ہو جاتا ہے۔ ہر فرد جو اپنے نصب العین سے محبت کرتا ہے، جانتا ہے کہ نصب العین نے جو معیار قائم کیے ہیں، وہ کیا ہیں۔ ان کے بموجب وہ یہ امتیاز کر سکتا ہے کہ کون سی شے نیک ہے کون سی بد۔ کون سی حسین ہے اور کون سی بدنما۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ جس طرح حیاتیاتی نمو کا تقاضا متصور نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اس کو جسمانی صورت یا معنوی وجود کا تصور نہ کریں۔ جس کو اس تقاضائے نمو نے تخلیق کیا اور اپنی کارفرمائی کا مظہر بنایا ہے۔ اس طرح تعلیمی نمو کا تقاضا بھی تصور میں نہیں آسکتا، جب تک کہ ساتھ ہی ساتھ اس نظریاتی ہیئت، بالفاظِ دیگر اس شخصیت کا تصور نہ کریں جس کو یہ تقاضا تخلیق کرتا اور اپنی کارفرمائی کا مظہر بناتا ہے۔ نصب العین اسی طرح نظریاتی ہیئت یعنی ایک پیکر تصور بن جاتا ہے۔

نظریاتی مسلک کو مکمل اسی وقت کہا جائے گا کہ ظاہری پیکر اور باطنی جوہر دونوں مکمل

ہوں۔ باطنی جوہر تو وہ ذہنی تصور وہ اندرونی مغز ہوتا ہے جس کو نصب العین کہتے ہیں اور جس کی بنیاد پر نظریاتی مسلک تعمیر کیا گیا ہے۔ ظاہری پیکر وہ فطری سرگرمیاں ہیں جن پر نصب العین کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نظریاتی مسلک مکمل اسی وقت ہوسکتا ہے کہ نصب العین میں کوئی خامی یا کمی نہ ہو اور اس کو ان تمام اہم سرگرمیوں پر نافذ کیا جا سکے جس کو آدمی فطرتاً خیال کرتا ہے۔ مثلاً مذہبی، اخلاقی، قانونی، سیاسی، تعلیمی وغیرہ۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے تعلیمی نظریات کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنے نظریۂ تعلیم کی بنیادیں حقیقتِ انسان پر استوار کی ہیں' ان کے نزدیک انسان کائنات کے اعلیٰ ترین منازلِ ارتقاء کا مظہر ہے' حیاتیاتی ارتقاء انسان میں آ کر اعلیٰ ارتقا کی صورت اختیار کرتا ہے جس کی بدولت ارتقا کا یہ جسم اور بدن اعضاء و جوارح کی ترقی پذیر تبدیلیوں کی صورت میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ عقیدہ اور نظریۂ حیات کے ارتقا کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر حیاتیاتی اجتماع اور نظریاتی اجتماع کا موازنہ کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ نباتات اور حیوانات میں 'وجود' کی اکائی عضویہ ہے۔ جبکہ نظریاتی اجتماع میں وجود کی اکائی 'نظریاتی انسان' ہوتا ہے۔ عضویہ کا نشوونما حیاتیاتی عمل ہے جس میں بچپن، بلوغت، کبرسنی کے مدارج ہیں۔ ''نظریاتی انسان کی نشونما'' عشق کا عمل ہے۔ وہ محبت جو انسان اپنے نصب العین سے پیدا کرتا ہے، وسیلۂ ارتقاء ونشاۃ ہے۔ عضویہ بازتخلیق کے ذریعے توسیع نسل اور کثرتِ افراد میں نمود پذیر ہوتا ہے۔ جبکہ نظریاتی اجتماع میں وسیلہ باعثِ تعلیم و تربیت ہے۔ وہ لوگ جو ایک ہی نظریہ کے حامل ہوتے ہیں، تعلیم کے ذریعہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے ان میں نسل ہا نسل تسلسل اور وحدتِ تاریخ پیدا ہوتی ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین کے نزدیک تعلیم ،نظریاتی اجتماع کا وسیلۂ بقاء و ترقی ہوتی ہے۔ نیز تعلیم کا مقصد اس نظریہ اور طریقۂ زندگی کا فروغ ہے جس کے ذریعے وہ اجتماع وجود میں آتا ہے جو انسانوں کی منفرد خصوصیت ہے۔ اقوام و ملل کا قیام ہی اس امر پر ہے کہ وہ اپنی ماہیت اور اصلیت نظریۂ حیات (IDIOLOGY) پر مبنی ہیں۔ انسانوں کا زندہ رہنا اور ایام زندگی گزارنا ان کی حقیقت کا جز و ہے۔ مگر اس کے ساتھ وہ نظریاتی انسانوں کی حیثیت سے بھی زندہ رہتے ہیں۔ جس کی بدولت ان میں طریق زندگی کی وحدتِ اجتماعیت، اداراتی استحکام، اپنی ہیئت میں ایک ہی

تقدیر سے وابستہ ہونا اور ایک ہی مستقبل کے لیے تیار ہونا جیسے حقائق پائے جاتے ہیں جن سے معاشرتی زندگی مرکب ہوتی ہے۔ تعلیم کا مقصد اس اجتماعیت اور اس کے اسالیب اور بندھنوں کے قیامِ مسلسل کی ضمانت دینا ہے۔ اس لیے تعلیم ہمیشہ پابند نظریہ پیش رفت ہے جس کے ذریعہ اجتماع اپنے تسلسل کو قائم رکھتا ہے اور فرد اپنی فطرت حیات کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین یہ طے کر لینے کے بعد کہ تعلیم ارتقاء کی اعلیٰ ترین منازل یعنی تخلیقِ انسانی کا ناگزیر وسیلہ ہے اور اپنی ماہیت میں طرزِ زندگی اور عقیدۂ حیات کی اشاعت ہے، یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ صحیح عقیدہ ونظریہ کیا ہے؟ وہ اس کو بھی انسانی فطرت کے قوام میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کی فطری تقویم میں کسی نہ کسی غایت اعلیٰ کے لیے جدوجہد ودیعت کی گئی ہے۔ انسانی زندگی کا جوہر مسلسل عمل ہے۔ یہ عمل فطرت انسانی کے اصل تقاضا کی بازگشت ہے اور وہ اصل تقاضا کسی نہ کسی اعلیٰ ترین غایت کا حصول ہے اعلیٰ ترین غایت تلاشِ حسن ہے۔ وہ حسن یا غایت کی تعبیر اس امر سے کرتے ہیں کہ اعلیٰ ترین غایت وہ ہے جس میں کوئی نقص نہ ہو۔ اس میں بدرجہ اَتم حسنات موجود ہوں اور زندگی کے ہر اعلیٰ ترین تقاضے کی تشفی کا اس میں سامان ہو۔ چنانچہ اس کے اندر حق اور قوت جبر وقہر مانیت، شان وشوکت، جمال وجلال کے داعیان کی پوری تکمیل کے اسباب ہوتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر صاحب ہر شخص حسن کا متلاشی ہے۔ وہ اسے چھوٹے چھوٹے معروضات میں تلاش کرتا ہے۔ مگر مطمئن نہیں ہوتا۔ وہ حسین چیزوں سے لو لگاتا ہے لیکن محرومِ لذت رہتا ہے۔ وہ گویا ایک ایسے مقصد کو پالینے کی فکر میں مضطرب ہے، جو سراپا حسن و چشمۂ حیات ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فکر علامہ اقبال کے فکر سے مماثل ہے۔ علامہ فرماتے ہیں: ؎

چہ کنم کہ فطرت من بمقام در نسازد　　دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے　　تبد آں زماں دل من پئے خوبتر نگارے
ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے　　سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے ندارد　　بہ نگاہِ ناشکیبے بہ دلِ اُمید وارے

ڈاکٹر رفیع الدین یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پورے تعلیمی نظام کو جس غایت یا نظریاتی اساس پر تعمیر ہونا چاہیے وہ خدا کا تصور ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خدا کا تصور اتنا عالمگیر ہے کہ اس پر سب

انسان متحد ہوسکتے ہیں۔ اس طرح بلالحاظ واختلاف مذہب وملت محض انسانی غایات، محرکات اور تقاضوں کی تحلیل سے خدا تک رسائی ہوسکتی ہے۔ اس تصور سب ہی شریک ہوسکتے ہیں۔ وہ ایسے تعلیمی نظام کو تشکیل دینا چاہتے ہیں جس میں ہمارے معاشرے کی نظریاتی اساس صورت پذیر ہوسکے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس معاشرے میں سب ہی مذاہب کے لوگ شریک ہیں۔ افراد کو اللہ تعالیٰ کے اوصاف کا حامل بنانا اور ان کو خدائی اخلاق سے آراستہ کرنا ہمارے نظامِ تعلیم کا مدعا ہونا چاہیے۔ صرف ایسی صورت میں ہی عالمگیر اخوتِ انسانی کے نصب العین کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ بقول ڈاکٹر رفیع الدین ''انسان کی فطرت میں تعلیمی نمو کا ایک تقاضا ہوتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیوں میں قوتِ محرکہ صرف یہی تقاضا ہوتا ہے حتیٰ کہ ان سرگرمیوں میں بھی جو اس کی حیوانی جبلّتوں سے براہِ راست تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے ارتقائے حیات کی انسانی منزل پر آ کر جس کو تاریخ ارتقاء کہا جاتا ہے یہی تقاضا عملِ ارتقاء کا محرک ہوتا ہے۔ تعلیمی نمو کا تقاضا اپنا کامل اور آزادانہ مظاہرہ اس وقت کرسکتا ہے اور صحیح تشفی اسی حالت میں پا سکتا ہے کہ حسن، خیر اور صداقت کے کسی اعلیٰ و ارفع نصب العین کی طرف راجع ہو۔ اسی صورت میں انسانی شخصیت آزادی کے ساتھ کمال کو پہنچ سکتی ہے۔ جب تک اس نصب العین کے حصول کی طرف انسانی سرگرمی کو قصداً وعمداً رجوع نہ کیا جائے، اس وقت تک سرگرمی نہ تو اپنے علو اور رفعت کو پہنچ سکتی ہے اور نہ صحیح معنوں میں تعلیمی فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ جب سرگرمی کا رخ قصداً وعمداً اس نصب العین کی جانب نہیں رکھا جاتا تو وہ کسی دوسرے نصب العین کی طرف رخ کر لیتی ہے جس میں حسن، خیر اور صداقت کے اوصاف موجود نہیں ہوتے۔ ہر نصب العین کچھ نفسیاتی مکاتب اور فلسفے رکھتا ہے جو اس نصب العین پر مبنی ہوتے ہیں لیکن فلسفے اور نفسیاتی نظام سچے وہی ہوسکتے ہیں جو حسن، خیر اور صداقت کے اعلیٰ ترین مظہر پر مبنی ہوں۔ چونکہ صداقت اولیٰ میں دوئی کو دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے سائنس کی تمام معلومات خواہ طبعی ہوں یا حیاتیاتی یا نفسیاتی صرف اسی نصب العین سے ہم آہنگ ہوسکتی ہیں جو حسن، خیر اور صداقت کا مظہرِ کامل ہوں۔ ایسا نصب العین صرف وہ خود آگاہ ذات ہوسکتی ہے جو قادرِ مطلق ہو ہر نقص سے منزّہ ہو، وہی حقیقت اولیٰ ہوسکتی ہے۔ اسی کو کائنات کا واحد خالق اور رب یعنی پرورش کرنے والا یا ارتقاء دینے والا کہا جاسکتا ہے۔ انسان کی شخصیت کا یہ تقاضا

کہ تعلیمی نمو حاصل کرے اور کمال کو پہنچے درحقیقت آخری اظہار ہے اس تقاضے کا جو کائنات کی خودآگاہی میں انسانیت کو ذریعہ کمال پر پہنچانے کے لیے مضمر تھا۔ اس تقاضے نے اس سے پہلے یوں ظہور کیا تھا کہ عضویاتی ابدان نے حیاتیاتی نمو اور کمال کی طلب ظاہر کی تھی۔ یہ طلب حیاتیاتی قوانین کے روپ میں نمودار ہوئی اور زندگی کو انسان کے بدن کی شکل دے کر حیاتیاتی ارتقاء کا سلسلہ حدِ کمال کو پہنچا گئی۔ اس سے پہلے یہ تقاضا مادی کائنات میں مادی ارتقاء و کمال کی طلب بن کر کارفرما رہا تھا۔ یہ طلب طبیعی قوانین کے روپ میں ظاہر ہوتی رہی اور مادی عالم کو اس درجہ کمال تک لے آئی جہاں وہ ذی حیات اجسام کی پیدائش سے پہلے پہنچ گیا تھا''۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک معلم کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ وہ طالب علم کو توحیدی نصب العین کی اہمیت سے روشناس کرائے۔ فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں بیسیوں فکری مذاہب پیدا ہو گئے ہیں، جنہوں نے تصورِ توحید کے مقابلہ میں حریفانہ حیثیت حاصل کر لی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ افراد کے روحانی تقاضے گمراہ ہو رہے ہیں اور تعلیمی نمو کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے۔ ان مذاہب میں سب سے زیادہ ہر دل عزیز اور قوی الاثر، مگر تعلیمی اعتبار سے سب سے زیادہ مضرت رساں لادینی قوم پرستی ہے۔ چنانچہ قوم، وطن، ملک، نسل، زبان کو مقصود بالذات سمجھ کر جتنی زیادہ محبت کی جائے گی اللہ سے محبت اتنی کم ہو گی اور بچہ کامل تعلیمی نمو پانے اتنا ہی قاصر رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ طلبہ کے ذہن پر یہ بات نقش کر دینی چاہیے کہ حسن، خیر اور صداقت کے اوصاف جھوٹے اور غلط مذاہب کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں، محض فریب ہیں کیونکہ ان میں سے ایک بھی کائنات کا معما من حیث الکل حل نہیں کر سکتا۔ ان کی زندگی چندروزہ ہے کیونکہ ان کے پرستار عرصہ تک ان کے جھوٹے حسن سے مبتلائے فریب نہیں رہ سکتے۔ نوعِ بشر کے لیے ان سے مسلسل محبت کرتے رہنا تباہی کا باعث ہو گا۔ وہ تنہا نصب العین جو انسانیت کو مکمل اور مستقل طمانیت بخش سکتا ہے صرف خدا ہے۔ معلم کو یاد رکھنا چاہیے کہ فلسفہ خودآگاہی یعنی وہ فلسفۂ کائنات وہ فلسفۂ بشر جو حقیقت اولیٰ کے صحیح فہم پر مبنی ہے ایک طاقتور ذہنی اوزار ہے۔ معلم اس کو اپنے طلبہ کو باطل مکاتب فکر سے محفوظ رکھنے کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اگر ان سے کچھ گرویدگی پیدا ہو چکی ہے تو اس سے اس کی بیخ کنی بھی نہیں کر سکتا ہے۔

5

خودی اور عقل

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
(حکمت اقبال)

حقیقتِ عقل کا صحیح نظریہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کے فلسفۂ خودی کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان خدا کی محبت کا ایک طاقتور جذبہ ہے جسے سوچنے کے لئے ایک دماغ اور کام کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں دے دیے گئے ہیں۔ چونکہ خدا کی محبت ہی انسانی خودی کے تمام افکار و اعمال کا سرچشمہ ہے' ظاہر ہے کہ عقل انسانی زندگی میں محض ایک ثانوی کردار ہی ادا کر سکتی ہے' اس کے وجود کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ محبت کی خدمت اور اعانت کرے اور وہ اسی مقصد کو پورا کرتی ہے۔ زندگی یا خودی کا اصل سرمایہ خدا کی آرزو ہے، عقل اس آرزو کی پیداوار ہے۔

زندگی سرمایہ دار از آرزو ست
عقل از زائیدگان بطن او ست

خدا کا عشق خودی کا امام ہے اور عقل خودی کی غلام ہے۔

من بندہ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من

عقل محض ایک قوت ممیّزہ ہے جو خودی کو اس کے نصب العین کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے میں مدد دیتی ہے۔ نصب العین کسی تصور کے حسن کا ایک اندازہ ہوتا ہے جو خودی کو

براہ راست اپنے وجدان کی مدد سے کرنا پڑتا ہے۔ وجدان درحقیقت آرزوئے حسن کا ہی دوسرا نام ہے جو بالعموم اس وقت برتا جاتا ہے جب آرزوئے حسن کسی چیز کے خوب وزشت، حق و باطل یا نیک و بد کے متعلق فیصلہ صادر کر رہی ہو اور اپنے لئے علم بہم پہنچانے کا وظیفہ ادا کر رہی ہو۔

ہر تصورِ حسن ایک وحدت ہوتا ہے جس کے حسن کو براہِ راست محسوس کیا جا سکتا ہے۔ آرزوئے حسن اپنے فیصلے خود کرتی ہے، وہ عقل یا کسی اور قوت کے فیصلے قبول نہیں کرتی اور دراصل انسان کے پاس آرزوئے حسن کے علاوہ کوئی اور قوت ایسی ہے ہی نہیں جو حسن و قبح کے متعلق کوئی فیصلے صادر کر سکے۔ البتہ عقل آرزوئے حسن کو اپنے فیصلے کرنے میں مدد دیتی ہے۔ احساسِ حسن عقل کے دائرہ اختیار میں نہیں؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل حسن کی وحدت کو نہیں دیکھ سکتی، فقط اس کے اجزا کو دیکھ سکتی ہے اور حسن اجزا میں نہیں ہوتا بلکہ وحدت میں ہوتا ہے۔ عقل حسن کی نئی نئی وحدتوں کے اجزا کی طرف آرزوئے حسن کی راہنمائی کرتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی توجہ ان وحدتوں کی طرف ہو جاتی ہے جس کے اندر یہ اجزا موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا عقل خودی کی مدد دو طرح سے کرتی ہے ایک تو یہ کہ اسے بتاتی ہے کہ اسے اپنے موجودہ نصب العین کے لئے جدوجہد کس طرح سے کرنی چاہیے۔ اور دوسرے یہ کہ اسے نئے نئے بلند تر نصب العینوں یا تصورات حسن کے نظارہ یا مشاہدہ کے لئے اکساتی ہے۔ عقل نہ محبت کی قلمرو میں داخل ہو سکتی ہے اور نہ حسن کا مشاہدہ کر سکتی ہے، یہ امتیاز فقط آرزوئے حسن کو ہی حاصل ہے۔ چونکہ عقل ہمارے ساتھ کچھ راستہ طے کرتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ہم حسن کی منزل پر پہنچتے ہیں تو بھول جاتے ہیں کہ مدت ہوئی عقل ہم سے الگ ہو چکی تھی۔

خرد سے راہرو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے، چراغِ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا
چراغ رہ گزر کو کیا خبر ہے!

انسانی اور معاشرتی علوم کی بنیاد محبت ہے نہ کہ عقل

عقل کا یہ نظریہ نفسیات انسانی کے حقائق کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور عقل کے

دوسرے تمام نظریات کی نسبت زیادہ معقول اور زیادہ یقین افروز ہے۔ اس نظریہ کی رو سے یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ انسانی اعمال و افعال کے تمام فلسفے دوسرے لفظوں میں ہمارے تمام انسانی اور معاشرتی علوم مثلاً فلسفہ سیاست، فلسفہ اخلاق، فلسفہ تاریخ، فلسفہ اقتصاد، فلسفہ تعلیم، فلسفہ قانون انفرادی نفسیات، اجتماعی نفسیات وغیرہ عقل سے نہیں بلکہ محبت سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ عقل صرف محبت کی راہنمائی میں ان کو ترتیب دیتی ہے۔ اگر وہ نصب العین جس کی محبت ان کو وجود میں لاتی ہے، صحیح ہوگا تو ان کو ترتیب دینے والی عقل بھی صحیح ہوگی۔ لہٰذا جس انسانی یا معاشرتی علم کا بنیادی تصور خدا نہ ہو وہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام اعمال انسانی کا حقیقی سرچشمہ خدا کی محبت کا جذبہ ہے۔

مقامِ عقل کے متعلق دورِ حاضر کی غلط فہمی

افسوس ہے کہ اب تک انسان کے امتیازی اوصاف میں سے اسی ایک وصف کو جسے ادراک یا عقل کہا جاتا ہے حد سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے اور یہ سمجھا جاتا رہا ہے کہ انسان کا سب سے بڑا وصف جس کی وجہ سے اسے حیوانات پر فضیلت حاصل ہے یہی ہے۔ حالانکہ دراصل انسان کا امتیازی وصف جس کی وجہ سے وہ انسان بنتا ہے اور حیوانات سے برتر ٹھہرتا ہے اس کی آرزوئے حسن ہے جو صرف خدا کے تصور سے مستقل اور مکمل طور پر مطمئن ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی درجہ کی عقل تو اعلیٰ سطح کے حیوانات میں بھی موجود ہے۔ لیکن تصورات کے حسن و کمال کی محبت کم از کم حیاتیاتی زندگی سے اوپر کی سطح کے تصورات کی محبت سوائے انسان کے اور کسی حیوان میں موجود نہیں۔ انسان کی عقل کی اگر کوئی اہمیت ہے تو وہ فقط اس قدر ہے کہ وہ انسان کی آرزوئے حسن کی خدمت گزار ہے لہٰذا اس کی اہمیت ذاتی اور اصلی نہیں بلکہ آرزوئے حسن سے ماخوذ اور مستعار ہے۔ اگر انسان کی عقل آرزوئے حسن کی غلام اور خدمت گزار نہ ہو تو وہ اسے حیوانات سے بھی بدتر بنا دیتی ہے۔ حسن کی تمنا میں ہی انسان کی تمام آرزوئیں جنم لیتی ہیں اور اپنی جستجو کی راہیں معین کرتی ہیں۔ حسن کی تمنا ہی انسان کے تمام اعمال کی خالق اور راہبر ہے۔ عقل کو یہ مقام حاصل نہیں۔

حسن خلاق بہار آرزو ست   جلوہ اش پروردگار آرزوست

ہرچہ باشد خوب و زیبا و جمیل   در بیابان طلب ما را دلیل

نقش او محکم نشیند در دلت　　　آرزوہا آفریند در دلت

اقبال دورِ حاضر کے انسان کو جو اپنی نادانی سے عقل ہی کو انسان کا سب سے بڑا امتیازی وصف سمجھا ہوا ہے، خوب جھنجھوڑ کر جذبہ حسن کی اہمیت بتاتا ہے:

ہے ذوقِ تجلی بھی اس خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے
زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحب ادراک

تجلی کی اہمیت

ہر انسان کے لئے ضروری ہے خدا کی محبت کو تفکّر فی الخلق (مشاہدہٗ قدرت) تفکّر فی الصفات (عبادت) اور تخلّق باخلاق اللہ (حسن عمل) کے ذرائع سے فروغ دے کر درجہ کمال پر پہنچائے۔ اس طریق سے اس کے دل کے اندر خدا کی معرفت کا وہ نور پیدا ہوگا جسے اقبال 'تجلی' یا 'جلوہ' کا نام دیتا ہے اور چونکہ اس طریق سے اس کا جذبہ محبت پوری پوری تشفی حاصل کر لے گا اور اس جذبہ کے علاوہ تشفی کا تقاضا کرنے والا کوئی اور جذبہ انسان کے اندر ہے ہی نہیں لہٰذا اس کے لئے بے اطمینانی اور پریشانی کی کوئی وجہ باقی نہیں رہے گی اور عقل کے لئے ممکن نہیں رہے گا کہ وہ اس کے دل میں کوئی اعتراضات یا شکوک یا شبہات پیدا کر سکے۔ اس کے برعکس اگر انسان کے دل میں خدا کی محبت اس کی استعداد کے مطابق اپنے کمال کو نہ پہنچے گی تو چونکہ اس کے جذبہ محبت کا ایک حصہ غیر مطمئن رہے گا؛ اس کا سکون قلب مکمل نہ ہو سکے گا اور عقل کے لئے موقع باقی رہے گا کہ اس کو شکوک و شبہات میں ڈالتی ہے۔ اگر انسان کا دل خدا کی معرفت کے نور سے پوری طرح منور نہ ہو تو اس کی عقل جو فقط اس نور سے ہی راہنمائی پا سکتی ہے، بھٹکتی رہتی ہے اور اسے مسرور اور مطمئن ہونے نہیں دیتی۔ حکمت کے بیابانوں میں مدتوں خاک چھاننے کے بعد اگر عقل کو کہیں پناہ ملتی ہے تو توحید میں۔

درجہاں کیف و کم گردید عقل
پے بمنزل برداز توحید عقل

اس کے علاوہ چونکہ شریعت کی پابندی اور نیک عملی کی زندگی خدا کی محبت کا نہ رکنے والا تقاضا ہے لہٰذا جب خدا کی محبت اپنے کمال پر ہوگی تو انسان شریعت کی پابندی یا نیک عملی کی زندگی کو کسی مجبوری سے اختیار نہیں کرے گا بلکہ ایک ایسی خواہش سے اختیار کرے گا جسے روکنا اس کے بس کی بات نہ ہوگی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنی عقل کو مطمئن کرنا چاہتا ہے اگر وہ اس کے اعتراضات کا ایسا جواب مہیا کرنا چاہتا ہے جو اس کے لیے مکمل طور پر کافی اور شافی ہو اگر وہ چاہتا ہے کہ دین اور شریعت کے راستوں پر مجبوری سے نہیں بلکہ پورے ذوق وشوق سے گامزن رہے اور نہیں چاہتا کہ مختلف نظریات اور تصورات کے درمیان بھٹکتا پھرے تو اسے اپنے دل کو خدا کی محبت اور معرفت کے نور (تجلی) سے منور کرنا چاہیے ورنہ اس کی روح اس کے فاسد خیالات کی دولتیوں کی مار کھا کھا کر مردہ ہو جائے گی۔ دلوں میں خدا کے نور کا جلوہ فرد اور قوم دونوں کے لئے پیغام حیات ہے اور ہماری فطرت کا ایک زبردست تقاضا یہ ہے کہ ہم اس نور کو اپنے دلوں کے اندر بسائیں۔

؎ بے تجلی مردِ دانا رہ نہ برد
از لکد کوب خیال خویش مرد
بے تجلی زندگی رنجوری است
عقل مہجوری و دین مجبوری است

؎ نگہ پیدا کر اے غافل تجلی عین فطرت ہے
کہ اپنی موج سے بیگانہ رہ سکتا نہیں دریا

؎ ہے ذوق تجلی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل تو نرا صاحب ادراک نہیں ہے

؎ بے تجلی نیست آدم را ثبات
جلوہ ما فرد و ملت را حیات

تجلی سے یہاں اقبال کی مراد خدا کی معرفت یا خدا کی محبت کا نور ہے۔

6

خودی اور مشاہدۂ قدرت

ڈاکٹر محمد رفیع الدین
(حکمت اقبال)

خودی کی ایک اہم ضرورت مشاہدۂ قدرت ہے

خودی خدا کی محبت کے جذبہ کی مکمل تشفی چاہتی ہے جو اظہار محبت سے ہی ممکن ہوتی ہے لہٰذا خودی اپنے جذبہ محبت کی کامل تشفی کیلیئے اظہارِ محبت کے تمام ممکن ذرائع کو کام میں لاتی ہے۔ ان میں سے ایک ذریعہ مظاہر قدرت کے اندر خدا کی صفات کے حسن و جمال کا مشاہدہ اور مطالعہ ہے۔ خدا مخفی ہونے کے باوجود کائنات میں آشکار ہے۔ وہ زندگی ہے، وجود ہے اور وجود کا خاصہ آشکارائی ہے لہٰذا خدا نے اپنی صفات کو اپنی تخلیق میں پوری طرح سے آشکار کر رکھا ہے۔

گفتہ موجود آنکہ مے خواہد نمود　　آشکارائی تقاضائے وجود

کائنات کی حقیقت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ خدا کی صفات کے حسن کی جلوہ گاہ ہے یوں سمجھنا چاہیے کہ کائنات گویا ہے ہی نہیں، فقط خدا ہی خدا ہے جس کا حسن کائنات کی صورت میں بے حجاب ہو گیا ہے، یا ہم ہیں جو اس حسن کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

گفت آدم ! گفت از اسرار اوست　　گفت عالم ! گفت او خود روبروست

بہ بزم ما تجلی ہاست بنگر
جہاں ناپید اُو پیداست بنگر

؎ در و دیوار و شہر و کاخ و کو نیست
که ایں جا ہیچ کس جز ما اُو نیست

؎ زمین و آسماں و چار سو نیست
دریں عالم بجز اللہ ہو نیست

کائنات کا یہ مادی پیکرخودئ عالم کی ہستی اورقدرت اورقوت کے نشانات میں سے ہے۔اس کائنات کی ہر چیز جوہم دیکھتے ہیں اپنے وجود کے لئے خودی عالم کی صفات کی پراسرار تخلیقی کاروائی کی مرہونِ منّت ہے۔

پیکر ہستی و آثار خودیست ہر چہ مے بینی ز اسرار خودیست

لہٰذا خودی کوخدا کے حسن کے مشاہدہ سے لذت اندوز ہوکراپنے جذبہ محبت کی تشفی کرنے کے لئے کسی دقت کا سامنانہیں ہوسکتا۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم قدرت کے آئینہ پر نگاہ ڈال کرخدا کے حسن کا جلوہ مفت میں دیکھ لیتے ہیں۔لیکن حسن حقیقی کے اس نظارہ کے لیے شرط یہ ہے کہ ہمارافطری ذوق حسن یاخدا کی محبت کا جذبہ مردہ نہ ہوچکاہواور ہماری نگاہ سلامت رہے۔

اندھیری رات میں یہ چشمکیں ستاروں کی یہ بحر یہ فلک نیلگوں کی پہنائی
سفر عروس قمر کا عماری شب میں طلوع مہر و سکوت سپہر مینائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی
صبح و ستار و شفق و ماہ و آفتاب بے پردہ جلوہ ہائے نگاہ مے توان خرید

فطرت کے مطالعہ سے خدا کی جومعرفت حاصل ہوسکتی ہے وہ کتابوں کے مطالعہ سے نہیں ہوسکتی۔چمن کا ہرآتشیں رنگ گل لالہ انسان کے دل میں اپنی کشش پیدا کر کے انسانی خودی کی اس مخفی حقیقت کوآشکارکررہاہے کہ وہ سراپا آرزوئے حسن ہے۔

؎ کھلا جب چمن میں کتب خانہ گل
نہ کام آیا ملا کو علم کتابی
کہا لالہء آتشیں پیرہن نے
کہ اسرار جان کی ہوں میں بے حجابی

قدرت کا حسن خدا کے حسن کا آئینہ ہے

قدرت کا حسن خدا کا آئینہ ہے، میں خدا کا جمال منعکس ہوتا ہے اور قدرت کے حسن کا آئینہ جس میں قدرت کا حسن منعکس ہوتا ہے انسان کا دل ہے لیکن اچھے شاعر کا اچھا کلام انسان کے دل کا آئینہ ہے جس میں انسان کی آرزوئے حسن کا عکس نظر آتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے حسن کی جستجو کے لئے کرتا ہے۔

ے حسن آئینہ حق اور دل آئینہ حسن
دل انسان کو ترا حسن کلام آئینہ

حسن خداوندی نے اپنے اردگرد فطرت کا حجاب بنا ہوا ہے لیکن یہ حجاب اتنا باریک ہے کہ اس میں سے ان فرشتوں کے تبسم ہائے پنہاں جو اس حجاب کو بنتے ہوئے اس بات پر ایک رکی ہوئی ہنسی سے ہنس رہے ہیں کہ یہ حجاب ہے بھی اور نہیں بھی' آشکار نظر آتے ہیں۔ یہ کائنات انسان کو حق تعالیٰ کے دیدار کی دعوت دے رہی ہے اور یہ عجیب بات نہیں اس لئے کہ ہر حسین جس کا حسن چھپا ہوا ہو اپنے حسن کو بے حجاب کرنے کا آرزومند ہوتا ہے۔ خدا کے حسن کو آشکار ہونا ہی تھا

ے کوئی دیکھے تو ہے باریک فطرت کا حجاب اتنا
نمایاں ہیں فرشتوں کے تبسم ہائے پنہائی
یہ دنیا دعوت دیدار ہے فرزند آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوقِ عریانی

خودی کی تربیت اور ترقی کا ذریعہ

خودی کے جذبہ محبت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ خدا کے حسن کا مشاہدہ کرے اور اس مشاہدہ سے اطمینان اور سرور حاصل کرے تاکہ اپنے جذبہ محبت کو اور تیز کرے اور حسن کی نامعلوم گہرائیوں اور وسعتوں سے پوری طرح آشنا اور پوری طرح سے لذت اندوز ہو۔ فطرت کا حسن خودی کی اس کوشش کو آسان بناتا ہے۔ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، زمین اور آسمان، سمندر، جھیلیں، بادل، ندیاں، ہوائیں، سحر کا نور، شام کی شفق، باغ و راغ، رات اور دن کا تغیر، موسموں کا انقلاب،

حیوانات اور نباتات کی زندگی اپنی تمام رنگارنگی اور ثروت اور شوکت کے سمیت مختصراً قدرت کے تمام مظاہر جو قدرت کے مسلسل عمل تخلیق اور تربیت اور تعمیر اور ترتیب اور تنظیم اور تجویز اور تحفظ اور تحسن اور تجمیل اور تزئین کے آئینہ دار ہیں خالق کائنات کے حسن و کمال کا عکس ایسی ہی وضاحت اور صفائی سے پیش کرتے ہیں جیسے کہ کسی باکمال فنکار کا شاہکار اس کے ذہنی، جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی کمالات کا عکس پیش کرتا ہے اور خودی جس قدر کارخانۂ قدرت پر خدا کی صفات کے مظہر کے طور پر غور وفکر کرتی ہے، جس قدر مظاہر قدرت کی باریکیوں میں جاتی ہے اور ان کے عوامل اور اسباب کا ان کی تفصیلات اور جزئیات کا اور ان کے نتائج اور حاصلات کا جائزہ لیتی ہے اسی قدر زیادہ وہ خدا کی صفات کے حسن سے آشنا ہوتی ہے اور اسی قدر زیادہ اپنی آرزوئے حسن کی تشفی پا کر مسرت اور اطمینان حاصل کرتی ہے اور اسی قدر خدا کی محبت اور اس کے درجہ کمال کے قریب لاتی ہے اور اسی قدر اپنی تربیت اور ترقی کا اہتمام کرتی ہے۔ قدرت گویا انسان کو خدا کی معرفت کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے تختی کا کام دیتی ہے۔

کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر　　تختۂ تعلیم اربابِ نظر

قرآن حکیم میں مشاہدۂ حسن کی اس شکل کو 'تفکّر فی الخلق' کہا گیا ہے اور مومن کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے مظاہر قدرت پر غور وفکر کرے۔ اقبال شاید قرآن حکیم کے اسی ارشاد کی طرف اشارہ کرتا ہے جب وہ کہتا ہے کہ مؤمن قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ میں غرق رہتا ہے۔

علم ترساں از جلال کائنات
عشق غرق اندر جمال کائنات

مشاہدہ قدرت سے اقبال کا شغف

جہاں موقع ملتا ہے اقبال خود مزے لے لے کر مظاہر قدرت کا مشاہدہ کرتا ہے اور اس میں خدا کے حسن کو بے حجاب دیکھتا ہے جو بڑی بے پرواہی کے ساتھ دشت و راغ میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے

ے
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن
برگ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی باد صبح
اور اس موتی کو چمکاتی ہے سورج کی کرن
حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

مومن کے دل کی آنکھ کائنات کے مشاہدہ سے روشن ہوتی ہے کیونکہ وہ کائنات میں جو فقط خدا کی صفات کی مظہر ہے، خدا کی قدرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔

چشم او روشن شود از کائنات　　　تا بہ بیند ذات را اندر صفات

قدرت کا حسن قلب ونظر کی زندگی ہے کیونکہ وہ حسن ازل کی نمود ہے اور اس میں خود حقیقت وجود بے پردہ نظر آتی ہے۔

ے
قلب ونظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں
چشمہ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں
حسن ازل کی ہے نمود چاک ہے بے پردہ وجود
دل کے لئے ہزار سود ایک نگاہ کا زیاں
سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلسان

ہمیں زندگی کا راستہ اندھوں کی طرح سر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اپنے اردگرد کائنات کا مشاہدہ اور مطالعہ کر کے اپنی معرفت کے نور کو چمکانا چاہیے اور قرآن حکیم کا ارشاد بھی جو ہمیں اُنْظُرُ کہہ کر خطاب کرتا ہے یہی ہے۔

تو کہ مقصودِ خطاب اُنظری　　　پس چرا ایں راہ چوں کوراں میری

خدا نے ہمیں آنکھیں اس لئے دی ہیں کہ ہم ان کے نور سے قدرت کا مشاہدہ کریں اور اس مشاہدہ کے ذریعہ سے خالق قدرت کی محبت (نگاہ) پیدا کریں۔

بیا با شاہد فطرت نظر باز   چرا در گوشہ ٔ خلوت نشینی
ترا حق داد چشمے پاک بینے   کہ از نورش نگاہے آفرینی

کائنات کے حسن کا احساس

کائنات کا حسن ہمارے جذبہ حسن کا راہنما ہے، اسے اکساتا اور تیز کرتا ہے۔ اگر کائنات میں حسن نہ ہوتا تو ہماری خودی کی آرزوئے حسن نہ بیدار ہوتی نہ اپنے مقصود کو پاسکتی۔

حسن خلاق بہار آرزوست
جلوہ اش پروردگار آرزوست

لیکن اس کے برعکس یہ بھی درست ہے کہ اگر ہمارے دل میں حسن کی آرزو نہ ہوتی تو کائنات کا حسن حسن نہ ہوتا کیونکہ ہمارے پاس کوئی معیار ہی نہ ہوتا جس پر پرکھ کر ہم اسے حسن قرار دے سکتے پھر نہ ہم کائنات کے حسن کی ستایش کر سکتے نہ اس کے مشاہدہ اور مطالعہ سے اس کے خالق کا کوئی تصور قائم کر سکتے۔ حقیقت کا سارا علم ہمارے اندر ہے ہم سے باہر نہیں' قدرت کا مشاہدہ فقط اسے بیدار کرتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے؛ اسی لئے کہا گیا ہے کہ خدا کا عرفان اپنا عرفان ہے اور خدا پر ایمان لانا اپنے آپ پر ایمان لانا ہے۔ اگر قدرت حسن فروش ہے تو خودی خریدارِ حسن ہے اور ایک کے بغیر دوسرا اپنا مدعا نہیں پا سکتا۔ ایک طرف سے خدا کا حسن کائنات میں پیدا اور ظاہر ہے اور دوسری طرف سے انسان کی آنکھوں میں مخفی اور مستور بھی ہے اگر خدا کا حسن ظہور پائے اور انسان کے دل کی آنکھوں میں مستور نہ ہو یعنی انسان کے دل میں اپنا وہ اثر یا احساس پیدا نہ کر سکے جو وہ انسان کی مخفی آرزوئے حسن کی وجہ سے پیدا کرتا ہے تو اس کا ظہور بھی بے معنی رہے لہٰذا حسن کا اصل مقام انسان کے دل کے اندر ہے اور یہ انسان کا دل ہی ہے جو حسن کامل کا صحیح محک و معیار ہے اور خارجی اشیاء میں سے کوئی شے بھی ایسی نہیں جو مکمل طور پر اس کے معیار کے مطابق ہو۔

حسن را از خود بروں جستن خطا ست   آنچہ مے بایست پیش ما کجا است

اس سے ظاہر ہے کہ تجلی یا معرفت کاملہ کا دارومدار اسی حسن کے کامل احساس پر ہے جو انسان کے دل کے اندر مخفی ہے۔

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی　　میری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری
حکیم و صوفی و عارف تمام مست ظہور　　کسے خبر کہ تجلی ہے عین مستوری

خارجی کائنات کے مشاہدہ کا کام فقط یہ ہے کہ وہ اس احساسِ حسن کو بیدار کرتا ہے جو انسان کے دل کے اندر ہے اور مشاہدہ کائنات کا یہ کام نہایت ہی اہم ہے کیونکہ انسان کی معرفت کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔

ہر خودی نظروں سے مخفی رہتی ہے

کائنات کے مشاہدہ اور مطالعہ سے خدا کو جاننا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کہ مثلاً میں اپنے کسی بہترین دوست کو اس کے بیرونی اعمال و افعال کو دیکھ کر جان لوں۔ بے شک خودی عالم ہماری جسمانی یا مادی نظروں سے اوجھل ہے لیکن یوں اوجھل ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے لئے کسی دوسری خودی کی نسبت جسے ہم جانتے ہوں' کم قابل فہم نہیں۔نظروں سے اوجھل ہونا کائناتی خودی کی خصوصیت نہیں۔ ہر خودی ہماری جسمانی آنکھوں سے جو دراصل مادی اشیاء کو دیکھنے کے لیے بنی ہیں اوجھل ہوتی ہیں اور خودی عالم اس عام قاعدہ سے مستثنیٰ نہیں۔ انسان کا مادی جسم اس کی خودی کا ایک مظہر یا آلہ ہے۔ میں اپنے بہترین دوست کے بارے میں جو کچھ جانتا ہوں اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں نے اس کی خودی یا شخصیت کو ان آنکھوں سے دیکھا ہے جو ایک ناممکن بات ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کی شخصیت یا خودی کے بیرونی آثار اور نتائج کو دیکھتا ہوں اور ان کی بنا پر اس حقیقت کا (کوئی معروف معنوں میں منطقی یا علمی یا عقلی یا ریاضیاتی تصور نہیں بلکہ) ایک وجدانی تصور قائم کرتا ہوں یا براہ راست اور بلاواسطہ یہ احساس پیدا کر لیتا ہوں کہ وہ میری طرح کی ایک زندہ شخصیت یا خودی ہے کوئی روبوٹ یا مشین نہیں۔

ہر خودی مخفی بھی ہے اور آشکار بھی واحد بھی ہے اور کثیر بھی

گویا میرا دوست میرے لئے ایک پہلو سے مخفی ہے اور دوسرے پہلو سے آشکار ہے وہ ایک ہے تاہم اس لحاظ سے کثیر ہے کہ بہت سے اعمال و افعال میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ میں اس کو جو ایک ہے اور مخفی ہے اس لئے جانتا ہوں کہ وہ آشکار بھی ہے اور کثیر بھی۔اس طرح سے خدا

ایک ہے اور مخفی ہے لیکن کائنات کے اندر اپنے تخلیقی اعمال وافعال کی وجہ سے کثیر بھی ہے اور آشکار بھی۔ اقبال نے اس سارے مضمون کو صرف دو شعروں میں خوبصورتی سے ادا کیا ہے۔ خدا ایک ہے اور مخفی ہے اس کے باوجود وہ کائنات کی کثرت میں آشکار ہے اور خدا کا عاشق کائنات کو دیکھ کر خدا کو پہچانتا ہے۔ یہ کائنات اپنی بے اندازہ وسعت کے باوجود عاشق کے دل میں سماجاتی ہے کیونکہ وہ اس کے محبوب کے حسن کا مرقع ہے۔ اگر تو تخلیق عالم کے اسرار کو جاننا چاہتا ہے تو اپنے آپ کو دیکھ! تو ایک بھی ہے اور مخفی بھی ہے لیکن اپنے تخلیقی اعمال وافعال کی کثرت سے جانا جاتا ہے۔

ایں پستی و بالائی ایں گنبد مینائی — گنجد بدلِ عاشق با ایں ہمہ پہنائی
اسرار ازل جوئی بر خود نظرے وا کن — یکتائی و بسیاری پنہانی و پیدائی

اقبال لکھتا ہے!

''ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدرت خالص مادیت کا ایک ڈھیر نہیں جو کسی خلا میں پڑا ہوا ہو، یہ واقعات کی ایک تعمیر ہے اور کردار کی ایک منظّم صورت ہے اور اس لحاظ سے وجود مطلق کے ساتھ ایک عضویاتی تعلق رکھتی ہے۔ قدرت خدا کی شخصیت کے ساتھ وہی تعلق رکھتی ہے جو کریکٹر انسانی شخصیت کے ساتھ رکھتا ہے۔ قرآن کے خوبصورت الفاظ میں یہ اللہ کی عادت ہے۔ انسانی نقطۂ نظر سے یہ وجود مطلق کی تخلیقی فعلیت کی ایک توجیہ ہے جو ہم اپنے موجودہ حالات میں اس پر عائد کرتے ہیں ـــــ قدرت کا علم خدا کے کردار کا علم ہے۔ جب ہم قدرت کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم دراصل خودی مطلق سے ایک طرح کی واقفیت پیدا کر رہے ہوتے ہیں اور یہ عبادت ہی کی ایک اور شکل ہے۔'' (تشکیل الٰہیات جدید۔ صفحہ 57,56)

2

فلسفۂ خودی
تشکیل ریاست
کا تقاضا
کرتا ہے

242

2 فلسفۂ خودی تشکیلِ ریاست کا تقاضا کرتا ہے

کلام اقبال کا مطالعہ کریں۔ فارسی کلام پر نظر ڈالیں یا اردو کلام ذہن میں لائیں یہ بات واضح ہے کلام اقبال ایک منظّم، مدلّل اور واضح فکر ہے جو ایک مذہب کو نہیں بلکہ 'دین' کا منظر نامہ سامنے رکھ دیتا ہے۔ علامہ اقبال خود فرماتے ہیں:

ع مذہب زندہ دلاں خواب پریشانے نیست

زندہ دل لوگوں یعنی جن کی خودی بیدار ہو باضمیر بلکہ روشن ضمیر ہوں تو ان کا مذہبی فکر (انفرادی و اجتماعی) ایک پراگندہ ذہن کے آدمی کا خواب نہیں ہوتا جس کا نہ سر پتہ چلے نہ پیر کا۔ یا جیسے سورۂ یوسف میں بادشاہ کا خواب تھا، جسے کم ظرف بے ضمیر درباریوں نے 'اضغاث احلام' کہہ کر ٹال دیا مگر حضرت یوسف علیہ السلام نے اس کی ایک مدلل، RATIONAL تعبیر بتادی۔

کلام اقبال اور آپ کے خطبات ایک مکمل و منظّم فکر کو ظاہر کرتے ہیں اور ایک مکمل فکر پوری زندگی کے تمام کوششوں کی وضاحت کرتا ہے اور زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کے اکثر شارحین، اقبال کی زندگی (کلام) کے بعض جزوی محاسن کا ہی تذکرہ کرتے نظر آتے ہیں جیسے علامہ اقبال نے اپنے اور اپنے قریبی ساتھیوں (وتنقید کرنے والوں) کے بارے میں تبصرہ فرمایا تھا:

ع مرا یاراں غزل خوانے شمردند

☆ جناب ڈاکٹر محمد رفیع الدین علامہ اقبال کے ان چند شارحین میں سے ایک اور سب سے سر بلند (ON THE TOP OF LIST) ہیں جنھوں نے کلامِ اقبال کو جیسا وہ تھا ویسے سمجھا اور ایک دین کے طور پر اس کی شرح فرمائی اور 'کما حقۂ' پیش کر دیا۔ کسی دوسرے انسان کو پوری طرح سمجھنے میں کچھ اپنی شخصیت اور عمر کا بھی دخل ہوتا ہے۔ شادی (نکاح) کے معاملات دس سال کی عمر کا بچہ نہیں سمجھ سکتا چالیس سال کا انسان عقل مندرا اشارہ کافی' کے انداز میں فوراً PICK کر لیتا ہے۔

☆ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا اپنا مطالعہ اور وسیع الاطراف ذہن تھا جس نے علامہ اقبال کے کلام کو سمجھا اور بیان کر دیا۔ ڈاکٹر صاحب کا ذہن بالقوۃ (POTENTIALLY) مستقبل کا نظریۂ حیات (IDEOLOGY OF THE FUTURE) کے مصنف کا ذہن رسا تھا لہٰذا وہ فوراً بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ صحیح کہا جاتا ہے کہ ع ولی را ولی می شناسد' کسی ولی کو پہچاننے کے لیے اسی شعبہ (FIELD) کا بندہ ہونا ضروری ہے۔ 'ولی' کی عظمت وکمالات کو سمجھنے کے لیے 'ولی' ہونا ضروری ہے۔

☆ لہٰذا___ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی کلام اقبال کی مکمل اور شاندار عکاسی ہے اور بلا کم و کاست صحیح تصویر ہے جیسے آئینے کی تصویر میں تصویر کا کوئی گوشہ غلط منعکس نہیں ہوتا اور آئینہ صحیح ہو اور شکستہ نہ ہو تو پوری تصویر بھی سامنے آجاتی ہے۔

کلامِ اقبال چونکہ ایک مکمل دین، دین اسلام کو ظاہر کرتا ہے اور شارحِ اقبال سے زیادہ 'الشارح' معرفہ بنالیں کہ علامہ اقبال کے سب سے بڑے اور اصل شارح یا الشارح کہلانے کے پورے مستحق صرف ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہی ہیں۔

☆ قرآن مجید میں اسلام کے لیے مذہب کا لفظ کہیں نہیں آیا بلکہ میرے (کم فہمی کی بنا پر ناقص مطالعے کی حد تک) کسی حدیث میں بھی اسلام کے لیے مذہب کا لفظ نہیں آیا۔ مذہب ایک جزوی حقیقت ہے جبکہ دین ایک WHOLE اور انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ضابطہ حیات، ضابطہ عمل یا لائحۂ عمل ہے۔ قرآن مجید میں 'فرعون' کی زبان سے ہی کہلوایا گیا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) اور ان کا بھائی اپنی مساعی سے (اے میری قوم) تمہارے 'شاندار دین' (بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى) کو

ڈھا کر اپنے دین (خداشناسی وخود شناسی) کے نظریات کو غالب کرنا چاہتا ہے۔کسی ایک اقلیم میں دو دین نہیں رہ سکتے، برابری کی سطح پر نہیں رہ سکتے، CO-EXISTENCE محال ہے۔ ہاں ایک چھوٹا بن کر اور مذہب بن کر رہ سکتا ہے ایک بڑا اور غالب دین ہوسکتا ہے۔فرعونی نظریات اور طرز زندگی بھی طریقتکم المثلی اور LIFE STYLE تھا جوانفرادی واجتماعی پوری زندگی کومحیط تھا۔ مذہب کا لفظ مسلمانوں کے قرونِ اولیٰ کے لٹریچر میں مذہب شافعی، مذہب حنفی وغیرہ کے لیے آتا رہا ہے۔موجودہ حالات میں مذہب کا لفظ دورِ غلامی میں انگریزی تسلط کے ساتھ آیا ہے اور انگریزی لفظ RELIGION کا ترجمہ کرلیا گیا ہے۔

☆ قرآن مجید میں 13 سالہ مکی دور کے آخری حصے میں ہجرت کی شروعات کے ساتھ ہی اہل مکہ کے طرز زندگی کو دین سے تعبیر کر کے اس کو ردّ کر دیا گیا ہے اور مؤکد انداز میں 'مردود' کیا گیا ہے کہ بلاغت کی انتہا ہے۔اسی طرح موجودہ حالات میں مغربی تہذیب کے غلبے کو دیکھیں تو آج کا مغرب اور اس کے SPOKESMEN فرعونِ مصر کے لہجے میں بول رہے ہیں اور END OF HISTORY کہہ کر اپنی تہذیب اور LIFE SYLE کو 'دین' اور مکمل 'طرز حیات' کہہ رہے ہیں۔اہل مکہ کی طرح ان کا طرز زندگی جو بالعموم مکمل طرز زندگی ہے اسی لئے قرآن اسے دین سے تعبیر کرتا ہے۔علامہ اقبال نے بھی انفرادی واجتماعی زندگی کے مجموعے کو ہی دین کہا ہے ع جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دین کو اجتماعیت اور ریاست سے الگ کر دیں تو پاپائیت، رہبانیت، گدی نشینی یا خانقاہیت ہے۔ نام چاہے 'دین' کا لیا جائے۔

☆ لہٰذا___ کلام اقبال کہیں یا ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی شرحِ اقبال یا ڈاکٹر صاحب کی تصانیف___ دونوں ایک 'دین' کی شان کی حامل ہیں پوری انسانی زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتے ہیں اور دونوں کا منطقی تقاضا___ ایک ریاست ہے اور بیسویں یا اکیسویں صدی کی بات کریں تو حیاتِ اقبال اور کلام اقبال ایک ریاست کا متقاضی ہے، ایک مکمل انقلاب کا طالب ہے اور غلبہ چاہتا ہے۔کلام اقبال ایک دین کا تعارف کراتا ہے 'فلسفہ خودی' کا حامل ہے اور تعلیماتِ اسلامی کی بلاکم وکاست عصر حاضر میں (آج کے محاورے اور لہجے میں) آج کے 'انسان'

کے سامنے پیش کرنے کے لیے اسلام کی تعلیمات کی نمائندگی ہے۔

☆ جناب محمد مصطفیٰ ﷺ نے مکہ سے مدینہ کی طرف جانے کے ماحول میں 'لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ' (06:109) فرمایا تھا اوران سے ذہناً اور قلباً علیحدگی اختیار کرلی۔ جنوبی ایشیا کے ماحول میں علامہ اقبال نے 1923ء میں 'طلوعِ اسلام' نظم لکھی۔ برطانوی صہیونی استعمار کے زیر سایہ رہنے کی بجائے ایک علیحدہ ریاست کی تجویز دی۔ مسلم بیداری کے جذبے نے علیحدہ ملک حاصل کرلیا جو کئی مراحل سے گزر کر آج کا پاکستان ہے۔ اس پاکستان کو 'ریاست مدینہ' کا نمونہ بنانے کا پہلا تقاضا یہی ہے کہ آج کے مغرب (مغربی فکر اور فلسفہ وتہذیب جو کہ 'دین مغرب' ہے اور ایک پورا طرز زندگی اور لائف سٹائل ہے جو بدقسمتی سے ڈارون کے انسان، فرائڈ کی سوچ اور مارکس کے رجحانات کے مطابق معاشی حیوان ہیں) سے بھی کنارہ کشی اختیار کرلی جائے اور کہا جائے کہ لَکُمْ دِیْنُکُمْ (تمہارے لیے تمہارا طرز زندگی) وَلِیَ دِیْن (اور میرے لیے میرا دین (اسلام) کافی ہے) یعنی ہم مسلمانوں کو ہمارا دین مبارک رہے۔

☆ حالیہ فکروتہذیبِ مغرب ایک مکمل دین ہے اور وہ دین اسلام کو صحیح طور پر اپنا مخالف سمجھتا ہے اور CLASH OF CIVILISATIONS کے نام سے مسلم تہذیب کو ختم کر رہا ہے اور اس کے لیے LAST CRUSADE کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ نظریۂ خودی غلبہ چاہتا ہے اور اس میں طاقت ہے فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ خالق ارض وسماء کا بیان ہے: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ (دین تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے)۔ لہٰذا مغرب کو خطرہ ہے کہ مسلمان جب بھی جاگے اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہوگئے تو حالیہ مغربی تہذیب کا جنازہ اُٹھ جائے گا (یہ تقدیر مبرم ہے) مگر مغرب مسلمانوں کو بیدار ہونے سے پہلے PRE-EMPT کر کے ختم کر دینے کے خودساختہ اصول پر عمل پیرا ہے۔ نتیجہ وہ ہوگا جو اللہ چاہے گا اور اسلام ہی غالب ہوگا۔

☆ میری اور آپ کی ذمہ داری قرآن مجید اور حضرت محمد ﷺ کی تعلیمات کو اور عصر حاضر میں علامہ اقبال کے 'نظریۂ خودی' کو جو قرآن مجید ہی سے ماخوذ ہے اور جس کی حد درجہ قابل فہم اور

آسان تشریح ڈاکٹر محمد رفیع الدین صاحب نے کردی ہے، مضبوطی سے تھامیں، اس کو PROMOTE کریں، اقبال کے افکار سے منسلک رہیں استحکامِ پاکستان کے لیے فکرِ اقبال سے وابستہ رہیں اور قرآن کی بنیاد پر اپنی آئندہ نسلوں کے لیے علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے افکار کے مطابق نظامِ تعلیم وضع کر کے چلائیں۔ مستقبل اسلام کا ہے نظریۂ خودی کا ہے۔

THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM

BY:ALLAMA MUHAMMAD IQBAL

علامہ اقبال کی یہ کتاب ان کے LECTURES (خطبات) کا مجموعہ ہے

جو انھوں نے مدراس مسلم ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام مدراس اور علی گڑھ میں دیے تھے

Published by : SH. MUHAMMAD ASHRAF

Publisher, Booksellers & Exporters, 7-Alibak Road. Lahore

حصّہ ہشتم
نظریۂ خودی
کی اساس پر
ریاست کی تشکیل

نوید انقلاب
یعنی
ریاست کی تشکیل

1

نویدِ انقلاب
یعنی ریاست کی تشکیل

(علامہ اقبال کے فارسی کلام سے انتخاب)

۱۔ کرمِ کتابی

(کتابی کیڑا)

شنیدیم شبے در کتب خانۂ من   بہ پروانہ می گفت کرمِ کتابی

میں نے ایک رات اپنے کتب خانہ میں کتاب خور کیڑے اور پروانہ کی گفتگو سنی کہ وہ کیڑا پروانے سے کہہ رہا تھا کہ

باوراقِ سینا نشیمن گرفتم   بسے دیدہ ام نسخہ فاریابی

میں نے ابن سینا کی کتابیں بھی ہضم کرلی ہیں اور فارابی کے نسخہ علم وحکمت بھی چٹ کرلیا ہے

نہ فہمیدہ ام حکمت زندگی را   ہمہ تیرہ روزم ز بے آفتابی

مگر ابھی تک میں زندگی کی حکمت کو نہیں سمجھ سکا اور میری صبح وشام روشنی سے محروم ہیں

نکو گفت پروانۂ نیم سوزے   کہ ایں نکتہ را در کتابے نیابی

پروانۂ نیم سوز نے بہت خوب جواب دیا کہ (دوست) یہ نکتہ تمہیں کتابوں میں نہیں ملے گا

تپش می کند زندہ تر زندگی را   تپش می دہد بال و پر زندگی را

تپش (عشق) زندگی کو زندہ تر کرتی ہے اور تپش سے ہی زندگی نشو ونما پاتی ہے

(کلیاتِ اقبال (فارسی) از پیامِ مشرق)

ب۔ حُدی

دورِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اور اس کے قریباً بارہ صدیاں قبل سفر اونٹوں، خچروں، گدھوں پر یا پیدل ہوتا تھا۔ صحرائے عرب شتر بانوں کا گہوارہ تھا اور وہاں کے لوگ تجارتی اور مذہبی اسفار زیادہ تر اونٹوں پر کرتے تھے اور یہ ان کے ہاں صدیوں سے رواج تھا۔ جب سینکڑوں اونٹوں کا قافلہ ہوتا تھا تو ان اونٹوں کو محوِ حرکت رکھنے لیے ایک قسم کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ اشعار پڑھنے والا شخص قافلے میں شروع والے اونٹ پر سوار ہوتا تھا اور بلند آواز کے ساتھ اور خاص قسم کی 'لَے' میں یہ اشعار پڑھتا تھا تا کہ ایک قسم کی ہم آہنگی (RYTHEM) پیدا ہو اور تمام قافلے والے انسان اور اونٹ سب اس RYTHEM پر محوِ حرکت رہیں۔ ان اشعار کو 'حُدی' کہا جاتا تھا۔ علامہ اقبال نے شکوہ، شمعِ شاعر، جوابِ شکوہ، ذوق وشوق، طلوعِ اسلام جیسی نظمیں لکھیں پھر خطبہ الٰہ آباد کے بعد مسلمانوں میں حرکت پیدا ہوئی تو انہوں نے 'حدی' کے نام سے یہ نظم بھی لکھی ہے تا کہ مسلمان سفرِ قیامِ پاکستان یا نظریۂ خودی کے مطابق حکومت یا عالمگیر خلافت کے قیام تک جذبے سے ہم آہنگ ہو کر محوِ سفر رہیں۔

حُدی (نغمۂ ساربانِ حجاز) ص۲۷۹

ناقۂ سیّارِ من	میری اونٹنی، میری تاتاری ہرنی (تاتار کی ہرنی کی طرح
آہوئے تاتارِ من	حسین اور تیز رفتار) میرا چاندی اور سونا،
درہم و دینارِ من	میری کل پونجی (دولت)
اندک و بسیارِ من	میری جاگتی ہوئی قسمت (دولت) یعنی میرے معاش
دولتِ بیدارِ من	اور روزی کا ذریعہ۔
تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست	ذرا اور تیز قدم اٹھا، ہماری منزل دور نہیں ہے
دلکش و زیبا ستی	تو دل کش اور زیبا ہے (حسین ہے)
شاہدِ رعنا ستی	تو حسین محبوب ہے تو حور کی ہمسر ہے (حوروں کے لیے
روکشِ حورا ستی	باعثِ رشک ہے)

غیرتِ لیلا ستی
دخترِ صحرا ستی

تو لیلیٰ کو شرماتی ہے، تو صحرا کی بیٹی ہے،
ذرا اور تیز قدم اٹھا ہماری منزل دور نہیں ہے

تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

در تپش آفتاب
غوطہ زنی در سراب
ہم بہ شب ماہتاب
تند روی چوں شہاب
چشم تو نادیدہ خواب

سورج کی تپتی ہوئی دھوپ میں
تو سراب میں غوطہ لگاتی ہے (یعنی صحرا کو طے کرتی ہے)
ایسے ہی چاندنی رات میں تو شہاب کی طرح تیزی سے گزر جاتی ہے
تیری آنکھ نے نیند نہیں دیکھی
ذرا اور تیز چل، ہماری منزل دور نہیں ہے

تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

لکۂ ابرِ رواں
کشتی بے باد باں
مثل خضر راہ داں
بر تو سبک ہر گراں
لختِ دلِ سارباں

تو اُڑتے ہوئے بادل کا ٹکڑا ہے
تو بلا بادبان کی کشتی ہے
خضر کی طرح راستہ جاننے والی ہے
ہر بوجھل تجھ پر ہلکا ہے
ساربان کے دل کا ٹکڑا ہے
ذرا اور تیز چل ہماری منزل دور نہیں ہے

تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

سوزِ تو اندر زمام
ساز تو اندر خرام
بے خورش و تشنہ کام
پا بہ سفر صبح و شام
خستہ شوری از مقام

تیری تڑپ نکیل میں، تیری مستی خرام میں (تجھ میں سوز و ساز دونوں کیفیتیں پائی جاتی ہیں)۔
بنا کھائے پیئے دن رات سفر اور سفر۔ تو ستانے سے تھک جاتی ہے (اگر تو کسی جگہ مقیم ہو جائے تو یہ قیام تیرے لیے تکلیف کا موجب ہو جاتا ہے)
ذرا اور تیز چل ہماری منزل دور نہیں ہے

تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

شامِ تو اندر یمن
صبح تو اندر قرن

تیری شام یمن میں،
تیری صبح قرن میں،

ریگ درشت وطن
پائے ترا یاسمن
اے چو غزالِ ختن
تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

(محبوب کے) وطن کی کھردری ریت، تیرے پاؤں کے لیے چنبیلی ہے، اے ختن کے ہرن جیسی (تیری چال ختن کے ہرن جیسی ہے)
ذرا اور تیز چل ہماری منزل دور نہیں ہے

مہ ز سفر پا کشید
در پس تل آرمید
صبح ز مشرق دمید
جامہ شب بردرید
بادِ بیاباں وزید
تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

چاند نے سفر سے پاؤں کھینچ لیا (سفر ختم ہوا)
وہ ٹیلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔
مشرق سے صبح طلوع ہوئی رات کا لباس ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، صحرا کی ہوا چلی،
ذرا اور تیز چل، ہماری منزل دور نہیں ہے

نغمہ من دلکشاے
زیر و بمش جانفزاے
قافلہ ہا را دراے
فتنہ ربا، فتنہ زاے
اے بہ حرم چہرہ ساے
تیز ترک گام زن منزلِ ما دُور نیست

میرا نغمہ دل کھولنے والا ہے۔
اس کا اُتار چڑھاؤ جان میں جان ڈالنے والا ہے۔
یہ قافلوں کی گھنٹی ہے۔
ہنگاموں کو کھینچنے والا، ہلچل پیدا کرنے والا ہے۔ اے حرم کی خاک پر منہ رگڑنے والی۔
ذرا اور تیز چل، ہماری منزل دور نہیں ہے

زبورِ عجم (حصہ دوم) 30 (ص 486)
خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

شیخ شہر از رشتہ تسبیح صد مومن بدام
کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار تاب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!
میر و سلطان نرد باز و کعبتین شان دغل
جانِ محکوماں ز تن بردند و محکوماں بخواب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!
واعظ اندر مسجد و فرزند ِاو در مدرسہ
آں بہ پیری کودکے ایں پیر در عہد ِشباب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!
اے مسلماناں فغاں از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہاں ارزان و یزداں دیریاب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!
شوخی ٔباطل نگر! اندر کمین حق نشست
شپر از کوری شبیخونے زند بر آفتاب!
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!
در کلیسا ابن مریم را بدار آویختند!
مصطفیٰؐ از کعبہ ہجرت کردہ با اُمّ الکتاب!

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

من درونِ شیشہ ہائے عصر حاضر دیدہ ام

آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب!

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

باضعیفان گاہ نیروے پلنگاں می دہند

شعلہ شاید بروں آید ز فانوسِ حباب!

انقلاب!

انقلاب! اے انقلاب!

(ج) ابلیس کی مجلس شوریٰ

ابلیس

(اپنے مشیروں سے)

اس نظم میں علامہ اقبال فرماتے ہیں مغربی تہذیب نے ابلیسی نظریات اختیار کر لیے ہیں اور سارا مغرب اس ابلیسی شکنجے میں جکڑا گیا ہے۔ نظریۂ خودی ایک حقیقت ہے اور یہ نظریہ یورپ اور امریکہ کے اہل علم کو بھی لاجواب کر چکا ہے۔ درحقیقت اندر سے تو سارے مغربی فلاسفر لرزاں ترساں ہیں کہ یہ نظریہ دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے یا مسلمان ختم ہو جائیں یا مسلمانوں کو اپنے ڈھب پر صیہونی ابلیسی تہذیب کے ذریعے عیاشی، بدمعاشی، شراب، بے حیائی اور بدکاری پر لگا دیا جائے۔ اس ضمن میں مغرب کے ایوانوں میں لرزہ طاری ہے۔ مغربی رہنما اور سیاست دان تو کیا ابلیس کے بعض مشیر بھی حیران پریشان ہیں۔ ابلیس اس نظم میں ان کو تسلی دے رہا ہے کہ کوئی بات نہیں حوصلہ رکھو۔ خطرہ ہمیں اسلام سے ہے مگر تم اسلام کو چھپاؤ، بدنام کرو، مسلمانوں کو پریشان کرو، توہین رسالت کے واقعات کثرت

سے کرواور قرآن کو بے وقعت کر دو ہو سکے تو قرآن کو متنازع بنادو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے جادوگر بلائے تھے اور سرکاری خرچ پر ان کی عیاشی کرائی تھی۔آج نظریۂ خودی کے فروغ کو روکنے کے لیے تم لہو ولعب، ٹی وی شوز، اینکر پرسنز (ANCHOR PERSONS) فلمی ستارے، کرکٹ ستارے، ڈرامے، ڈانسر، ایکٹر، گویّے، بےضمیر صحافی اور بےضمیر میڈیا کو سامنے لے آؤ تا کہ نوجوان نسل اسلام سے برگشتہ ہو جائے۔

یہی کچھ مغرب دنیا میں ایک صدی سے کر رہا ہے اور یہی 1897ء کے یہودی اکابرین کے رہنما اصولوں میں 'بڑوں' نے طے کر دیے تھے اور اس کی تحت دنیا جاری ہے۔UNO اسی کام کے لیے خاص طور پر مسلمان ممالک میں، خاندانی منصوبہ بندی، ENTERTAINMENT، کھیل کود کے شیطانی طریقے، فلموں، ڈراموں، اولمپکس، میڈیا، موبائل فون ، ,FACEBOOK YOUTUBE, TWITTER, INSTAGRAM وغیرہ کے ذریعے دنیا کی آئندہ نسلوں کو اور بالخصوص مسلم نوجوان نسل کو خراب کر رہا ہے۔

اس شوریٰ میں ابلیس اسی طرح کے اپنے منصوبے بتا رہا ہے کہ مسلمان نوجوان کو قرآن سے غافل رکھو اور خودشناسی (خودی) سے دور کر دو۔مغرب کامیاب رہے گا۔

1

ہے مرے دستِ تصرف میں جہانِ رنگ و بو
کیا زمیں، کیا مہر و مہ، کیا آسمانِ تو بتو
دیکھ لیں گے اپنی آنکھوں سے تماشا غرب وشرق
میں نے جب گرما دیا اقوامِ یورپ کا لہو
کیا امامانِ سیاست، کیا کلیسا کے شیوخ
سب کو دیوانہ بنا سکتی ہے میری ایک ہو!

کارگاہِ شیشہ جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جام و سبو
دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو
کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو
ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس اُمت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے، جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے!

2

مراحل انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کتاب رسولِ انقلابﷺ کا طریق انقلاب سے ماخوذ

مراحل انقلاب

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

انقلاب کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ انقلاب کسے کہتے ہیں۔ اس کے لفظی معنی ہیں تبدیلی۔ لہٰذا ہم یہ لفظ کسی بھی لفظ کے ساتھ جوڑ کر استعمال کر لیتے ہیں۔ مثلاً علمی انقلاب، ثقافتی انقلاب، سائنسی انقلاب، فوجی انقلاب۔ لیکن لفظ ''انقلاب'' کے اصطلاحی مفہوم میں اس استعمال کی گنجائش نہیں۔ بلکہ کسی معاشرے کے سیاسی نظام، معاشی نظام یا سماجی نظام میں سے کسی ایک میں بنیادی تبدیلی کو صحیح انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ آج دنیا بھر میں انسانی زندگی کو دو حصّوں میں تقسیم مانا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ فرد کی انفرادی زندگی سے متعلق ہے، جبکہ دوسرا حصہ زندگی کے اجتماعی معاملات کو محیط ہے۔ ان میں سے مقدم الذکر حصہ مذہب کا دائرۂ کار ہے جو کہ عقائد (dogmas) مراسم عبودیت (rituals) اور سماجی رسومات (social customs) پر مشتمل ہے۔ آج دنیا بھر میں ان معاملات میں فرد کو آزاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہر شخص کو آزادی حاصل ہے کہ وہ جس طرح کے چاہے عقائد اپنا لے۔ چاہے وہ ایک خدا کو مانے، چاہے سو کو مانے یا ہزار کو مانے، چاہے کسی کو بھی نہ مانے۔ جس طرح چاہے مراسمِ عبودیت بجا لائے۔ چاہے گوشہ نشین ہو کر تپسیائیں کرے، چاہے بتوں کے آگے سجدے کرے، یا

ایک نادیدہ خدا کی پرستش کرے۔ مراسمِ عبودیت کی اسے آزادی ہے۔ چاہے روزے رکھے' نماز پڑھے' چاہے مندر میں جائے یا چرچ میں' اجازت ہے۔ اسی طرح سماجی رسومات ادا کرنے میں وہ آزاد ہے۔ شادی کے موقع پر چاہے نکاح پڑھوائے چاہے پھیرے ڈلوائے۔ فوت شدہ شخص کی میت کو چاہے دفن کیا جائے چاہے اسے جلا دیا جائے۔

زندگی کا دوسرا حصہ تہذیب' تمدن' ریاست اور سیاست یعنی اجتماعی نظام سے متعلق ہے اور یہ سیاسی نظام' معاشی نظام اور سماجی نظام (The Politico-Socio- Economic System) پر مشتمل ہے۔ اس کا تعلق مذہب سے نہیں ہے۔ اس کا نام سیکولرزم ہے۔ واضح رہے کہ سیکولرزم کا مطلب لا مذہبیت نہیں ہے' بلکہ یہ ہمہ مذہبیت' لا دینیت کے اصول پر مبنی ہے۔ سیکولرزم میں مذہب تو سارے قابلِ قبول ہیں۔ یہ بات تو بش بھی کہتا ہے کہ "We are ready to embrace Islam" اسلام بطور مذہب پر انھیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے امریکہ میں آ کر سینیگاگ اور چرچ خریدے اور انھیں مساجد بنالیا' ہم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ انھوں نے یہاں بڑی تعداد میں ایفروامریکنز کو اور کچھ گوروں کو بھی convert کر کے مسلمان بنالیا' ہم نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس لیے کہ بحیثیتِ مذہب ان کی اسلام سے کوئی جنگ نہیں ہے' لیکن ایک نظام (Politico-Socio-Economic System) کی حیثیت سے اسلام انھیں قطعاً گوارا نہیں۔ اسلام کے اسی تصور کو وہ فنڈامنٹلزم کا نام دیتے ہیں۔ اور اس وقت چونکہ کچھ فنڈامینٹلسٹ لوگوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس پر دہشت گردی کا لیبل لگ گیا ہے' لہٰذا وہ فنڈامینٹلزم کو دہشت گردی (Terrorism) کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ کبھی وہ ''دہشت گردی کے خلاف جنگ'' کا نعرہ لگاتے ہیں تو کبھی ''بنیاد پرستی کے خلاف جنگ'' کا۔ حقیقت میں یہ جنگ اسلام کے نظامِ حیات کے خلاف ہے۔ یہ جنگ اسلام کے عقائد' عبادات اور رسومات کے خلاف نہیں ہے۔

آج کی اصطلاح میں انقلاب اس اجتماعی نظام میں کسی تبدیلی کو کہتے ہیں۔ مذہبی میدان میں کسی بڑی سے بڑی تبدیلی کو بھی انقلاب نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بہت اہم نکتہ ہے' اس کو سمجھ لیجیے۔ تاریخِ انسانی میں سب سے بڑی مذہبی تبدیلی ۳۰۰ عیسوی میں ہوئی تھی جب شہنشاہِ روم قسطنطینِ اعظم نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور ساری سلطنت عیسائی ہوگئی تھی۔ مذہبی تاریخ

کے اندر اتنی بڑی تبدیلی (Conversion) کبھی نہیں ہوئی۔ سلطنت روما اُس وقت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی‘ یعنی پورا شمالی افریقہ‘ پورا مشرقی یورپ اور پورا مغربی ایشیا۔ لیکن اتنی بڑی مذہبی تبدیلی کا نام کبھی انقلابات کی تاریخ میں نہیں گنوایا گیا۔ اس لیے کہ اس مذہبی تبدیلی سے سیاسی‘ معاشی یا سماجی نظام میں کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ انقلاب (Revolution) وہ تبدیلی کہلائے گی جو کسی ملک کے سیاسی نظام‘ معاشی نظام‘ یا سماجی نظام سے متعلق ہو اور بنیادی نوعیت کی ہو۔

کامل انقلاب کی واحد مثال: انقلابِ نبوی ﷺ

☆ اب ہم دنیا کے چند مشہور انقلابات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان میں ''انقلابِ فرانس'' بہت مشہور ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ واقعی انقلاب تھا۔ لیکن اس سے صرف سیاسی نظام میں تبدیلی آئی تھی۔ مذہب پہلے بھی عیسائیت تھا‘ بعد میں بھی وہی رہا۔ سماجی ڈھانچے (Social Structure) میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ تو انقلابِ فرانس میں صرف سیاسی نظام تبدیل ہوا۔ دوسرا بہت مشہور انقلاب روس کا بالشویک انقلاب ہے جو ۱۹۱۷ء میں آیا۔ اس سے صرف معاشی نظام تبدیل ہوا۔ تمام ذرائع پیداوار قومیا لیے گئے اور انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ نوٹ کیجیے کہ یہ دونوں انقلابات ہیں جبکہ رومن امپائر کا بیک وقت کرسچین ہو جانا انقلاب نہیں ہے۔

☆ اس سے میں یہ نتیجہ اخذ کرتا ہوں کہ آج عہدِ حاضر میں اجتماعیات‘ سوشیالوجی یا پولیٹکل سائنس کا کوئی طالب علم پوری دیانت داری سے انقلاب کا صحیح طریقِ کار اخذ کرنا چاہے تو اسے صرف محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے مکمل راہنمائی مل سکتی ہے۔ مارکس‘ اینجلز‘ لینن یا والٹیئر کی زندگیوں سے اس ضمن میں قطعاً کوئی راہنمائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ گویا طریقِ انقلاب کے لیے اب دنیا کے سامنے صرف ایک ہی منبع و سرچشمہ (source) ہے اور وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ ہے۔ چنانچہ میں انقلاب کے طریقِ کار پر جو کچھ عرض کر رہا ہوں اس کے لیے میرا source صرف سیرتِ محمدی ﷺ ہے۔ میں اسلامی اصطلاحات دین‘ اسلام‘ ایمان‘ جہاد اور قتال استعمال کیے بغیر جدید اصطلاحات میں انقلاب کے مراحل آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دورِ زوال کے دوران ان اصطلاحات کا

مفہوم محدود اور مسخ (limited and perverted) ہو گیا ہے اور ہم جب بھی کوئی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس کا وہی مسخ شدہ تصور ذہن میں آتا ہے۔ لہٰذا اگر ان اصطلاحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے جدید terminology میں بات کی جائے تو انقلاب کا خاکہ نسبتاً آسانی سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس کے بعد مناسب ہوگا کہ اس خاکہ میں قرآن و حدیث کی اصطلاحات، سیرت النبی ﷺ اور واقعات کا رنگ بھر دیا جائے۔

انقلابی عمل کے لوازم و مراحل

ایک مکمل انقلاب کے چھ یا سات مراحل ہیں:

(۱) انقلابی نظریہ

(۲) تنظیم

(۳) تربیت

(۴) صبرِ محض (Passive Resistance)

(۵) راست اقدام (Active Resistance)

(۶) مسلح تصادم (Armed Conflict)

(۷) تصدیرِ انقلاب

مذکورہ بالا چھ مراحل کے علاوہ انقلاب کا ایک ساتواں مرحلہ بھی ہے اور یہ ایک حقیقی انقلاب کا litmus test ہے۔ ایک حقیقی انقلاب کبھی بھی اپنی جغرافیائی یا قومی و ملکی اور حکومتی سرحدوں کے اندر محدود نہیں رہتا۔ کیونکہ اگر انقلابی نظریہ زوردار، قوی، مضبوط، مدلل اور مبرہن ہے تو یہ لوگوں کے قلوب و اذہان کو اپنی گرفت میں لے گا۔ چنانچہ حقیقی انقلاب لازماً برآمد (Export) ہوتا ہے، وہ اپنی حدود میں نہیں رہ سکتا۔

یہ ہے انقلابی عمل کا وہ خاکہ جسے میں نے سیرتِ نبوی ﷺ سے اخذ کیا ہے، لیکن دینی اصطلاحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عمومی انداز میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ اب ہم اس خاکے میں سیرتِ نبوی ﷺ اور انقلابِ نبوی ﷺ کا رنگ بھرتے ہیں۔

اسلامی انقلابی تنظیم اور اس کی اساسات

جو لوگ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے، انھیں آپ ﷺ نے منظم کیا اور ان کی تربیت کی۔ اس تنظیم کی سب سے پہلی بنیاد یہ تھی کہ جن لوگوں نے مان لیا کہ آپ ﷺ اللہ کے نبی ہیں، آپ ﷺ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اللہ کی جانب سے کہہ رہے ہیں، یہ آپ ﷺ پر وحی آئی ہے تو پھر ان کے لیے آپ ﷺ کے حکم سے سرتابی کیسے ممکن ہے؟ کیا نبی کی بات سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے؟ اس سے زیادہ مضبوط جماعت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جو نبوت کی بنیاد پر قائم ہو۔ آج کی دنیا میں بھی آپ کو مثال ملے گی کہ سچی نبوت تو تنظیم کی بہت بڑی بنیاد ہے ہی، جھوٹی نبوت بھی بہت بڑی بنیاد ہے۔ غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کی بنیاد پر جو جماعت چل رہی ہے ذرا اس کا اندازہ کیجیے کہ کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ اور ان کا لاہوری فرقہ، جس نے غلام احمد قادیانی کو نبی نہیں مانا، وہ منتشر ہو کر ختم ہو گیا۔ تو مضبوط ترین جماعت جو دنیا میں ہو سکتی ہے وہ نبوت کے دعویٰ کی بنیاد پر ممکن ہے۔ چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ کی سچی نبوت اور آخری نبوت کی بنیاد پر جو جماعت بنی وہ دنیا کی مضبوط ترین جماعت تھی، جس کے بارے میں قرآن حکیم میں فرمایا گیا: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ ''اللہ کے رسول محمد (ﷺ) اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ہیں۔'' اس جماعت میں کسی نے رسول اللہ ﷺ کو جماعت کا صدر منتخب نہیں کیا تھا بلکہ آپ ﷺ نبی ہونے کی حیثیت سے اور داعی ہونے کی حیثیت سے خود بخود امیر تھے۔ آپ ﷺ کے ساتھی ''سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور مانا) کے اصول پر کاربند تھے۔ البتہ حضور ﷺ نے مستقبل کے لیے ایک مثال قائم کرنے کے لیے کہ آئندہ اگر اسی انقلابی جدوجہد کا مسلمانوں نے آغاز کیا تو اس کے لیے جماعت کیسے بنے گی، بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ملاحظہ کیجیے جو بخاری اور مسلم دونوں کی روایت ہے اور سند کے اعتبار سے اس سے زیادہ صحیح حدیث ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ ''ہم نے بیعت کی اللہ کے رسول ﷺ سے''۔ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ ''اس بات پر کہ آپ ﷺ کا ہر حکم سنیں گے اور اطاعت کریں گے'' فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ

''تنگی اور سختی میں بھی اور آسانی میں بھی'' وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَہِ ''طبیعت کی آمادگی کی صورت میں بھی اور طبیعت پر جبر کرنا پڑا تب بھی''۔ وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَيْنَا ''اور چاہے آپ ﷺ دوسروں کو ہم پر ترجیح دے دیں''۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ آپ ﷺ نے ایک نو وارد نوجوان کو ہم پر امیر کیوں بنا دیا؟ ہم آپ ﷺ کے پرانے خدمت گار اور جان نثار ساتھی ہیں' ہم پر اس نوجوان کو کیوں امیر بنا دیا؟ آپ ﷺ کا اختیار ہوگا جو چاہیں کریں۔ وَعَلٰی اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ ''اور جس کو بھی آپ ﷺ امیر بنا دیں گے اس سے جھگڑیں گے نہیں''۔ وَعَلٰی اَنْ نَّقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ ''اور یہ کہ ہم حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں' اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہیں کریں گے''۔ ہماری جو رائے ہوگی' ہمارے نزدیک جو بات حق ہوگی وہ ضرور کہہ دیں گے۔ اس لیے زبانیں بند نہیں کریں گے کہ لوگ کہیں گے کہ لو جی انھوں نے کیا کہہ دیا۔ یہ ہے آرگنائزیشن کی دوسری بنیاد۔ آپ بھی تجزیہ کر لیجیے کہ کیا حضور ﷺ کو اس کی ضرورت تھی؟ کیا آپ ﷺ پر ایمان لانا ہی کافی نہیں تھا کہ آپ ﷺ کی ہر بات ماننی ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (النساء:٦٤) ''ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے۔'' اس کے باوجود آنحضور ﷺ نے بیعت لی تو یہ دراصل آئندہ کے لیے رہنمائی کے لیے تھی!

غزوۂ بدر سے پہلے حضور ﷺ نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی تھی کہ قریش کا ایک قافلہ شمال سے مالِ تجارت سے لدا پھندا آ رہا ہے جس کے ساتھ صرف چالیس یا پچاس محافظ ہیں' جبکہ کیل کانٹے سے لیس ایک مسلح لشکر جنوب سے آ رہا ہے اور اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان دو میں سے ایک پر تمہیں ضرور فتح عطا فرما دے گا۔ بتاؤ' کدھر چلیں؟ کچھ ہم جیسے کمزور لوگ بھی موجود تھے' انھوں نے کہا کہ حضور! قافلے کی طرف چلیں' تھوڑے سے آدمی ہیں' ان پر ہم آسانی سے قابو پا لیں گے' مالِ غنیمت بہت ہاتھ آ جائے گا' اور ہتھیار بھی ملیں گے' جن کی ہمیں اشد ضرورت ہے۔ لیکن حضور ﷺ مزید مشورہ طلب فرماتے رہے۔ تب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اندازہ کیا کہ حضور کا اپنا رجحانِ طبع کچھ اور ہے۔ چنانچہ اس مرحلے پر پہلے مہاجرین نے تقریریں کیں کہ حضورؐ! آپؐ ہم سے کیا پوچھتے ہیں' جو آپ کا حکم ہو ہم حاضر ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر

فاروق ؓ نے تقریریں کیں، لیکن حضور ﷺ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے حضور کسی خاص بات کے منتظر ہیں۔ مہاجرین میں سے ہی حضرت مقداد بن اسود ؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ ''حضور ﷺ جو آپ کا ارادہ ہو بسم اللہ کیجیے، ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں پر قیاس نہ کیجیے جنھوں نے اپنے نبیؑ سے یہ کہہ دیا تھا کہ ''اے موسیٰؑ آپ اور آپ کا رب دونوں جائیں اور جا کر جنگ کریں، ہم تو یہاں بیٹھے ہیں''۔ کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو ہمارے ذریعے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ لیکن حضور اب بھی انتظار کی کیفیت میں تھے۔

اب حضرت سعد بن معاذ ؓ کو خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ کا روئے سخن دراصل انصار کی جانب ہے۔ بیعت عقبہ ثانیہ میں طے یہ ہوا تھا کہ اگر قریش آپ ﷺ کا پیچھا کرتے ہوئے مدینے پر حملہ آور ہوئے تو ہم آپ ﷺ کی اس طرح حفاظت کریں گے جیسے اپنے اہل وعیال کی کرتے ہیں۔ لیکن صورتِ واقعہ یہ تھی کہ قریش نے مدینے پر حملہ نہیں کیا تھا اور حضور ﷺ خود باہر نکل کر تصادم کا آغاز کر چکے تھے، لہٰذا انصار اس معاہدے کی رو سے مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنے کے پابند نہیں تھے۔ حضرت سعد ؓ کو فوراً خیال آ گیا کہ ہو نہ ہو حضور ﷺ ہماری تائید کے منتظر ہیں۔ چنانچہ حضرت سعد ؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ کا روئے سخن ہماری جانب ہے۔ اب دیکھئے کس قدر عمدہ جملہ کہا: فَاِنَّا آمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ یعنی حضور! ہم آپ ﷺ پر ایمان لا چکے ہیں اور ہم نے آپ ﷺ کی تصدیق کی ہے۔ ہم نے آپ ﷺ کو اللہ کا نبی اور رسول مانا ہے۔ اب ہمارا اختیار کہاں رہا؟ آپ ﷺ جو بھی حکم دیں گے، سر آنکھوں پر! آپ ﷺ ہمیں جہاں بھی لے جانا ہو لے چلئے۔ خدا کی قسم، اگر آپ ﷺ ہمیں اپنی سواریاں سمندر میں ڈالنے کا حکم دیں گے تو ہم ڈال دیں گے......!

تو حضور ﷺ کو کسی کی بیعت کی ضرورت نہیں تھی، آپ ﷺ تو اللہ کے نبی اور رسول ہونے کی حیثیت سے مطاع ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ نے بیعت کیوں لی؟ اس لیے کہ آئندہ کوئی مسلمان جماعت بنانے کے لیے انگریزوں سے، روسیوں سے یا جرمنوں سے کوئی طریقہ مستعار نہ لیتا پھرے، بلکہ جماعت بنانے کے لیے وہ بنیاد اختیار کرے جو میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔

منہج انقلابِ نبوی ﷺ کا حالاتِ حاضرہ پر انطباق

دوسری بات یہ کہ آج وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا ہے اور حالات میں بہت تبدیلی آ چکی ہے۔ لہٰذا اس وقت ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں نبی اکرم ﷺ کے طریق انقلاب پر جوں کا توں عمل کیا جائے گا یا اس کے لیے کسی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں اوپر بیان کیے گئے پہلے پانچ مراحل میں قطعاً کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا انقلابی نظریہ آج بھی وہی نظریہ توحید ہے اور آج بھی ہمیں ایمان کی دعوت دینی ہے جس کا منبع و سرچشمہ قرآن ہے۔ یہ تصور درست نہیں ہے کہ ہم مسلمان ہیں تو ہمارے اندر ایمان تو موجود ہے۔ اس لیے کہ اسلام اور شے ہے' ایمان اور شے ہے۔ ہم مسلمان اس لیے ہیں کہ مسلمان ماں باپ کے گھر پیدا ہو گئے ہیں۔ ایمان ہمیں اپنے قلوب و اذہان میں خود پیدا کرنا ہے۔ توحید پر' آخرت پر' رسالت پر یقین والا ایمان ہماری اولین ضرورت ہے:

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!

رسول اللہ ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن تھا۔ آج بھی یہی قرآن ہمارا آلۂ انقلاب ہے۔ لہٰذا رجوع الی القرآن کی دعوت وسیع پیمانے پر عام کی جائے۔ میرے نزدیک قرآن کی حیثیت مقناطیس کی ہے جو سلیم الفطرت لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ جن لوگوں کی فطرت مسخ ہو چکی ہو ان پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ مقناطیس لوہے کے ٹکڑوں کو تو کھینچ لے گا لیکن لکڑی کے ٹکڑوں کو نہیں کھینچے گا۔ لہٰذا قرآن کے مقناطیس کو اس معاشرے میں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ الحمد للہ کہ میں نے چالیس برس تک اس شہر لاہور میں قرآن کی چکی پھیری ہے۔ مجھے یہ خطاب بھی دے دیا گیا تھا کہ یہ قرآن کا قوّال ہے اور میں نے خوشی سے اس خطاب کو قبول کیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

''ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلا حدیثِ دوست کہ تکرار می کنیم''

کے مصداق میں نے جو کچھ پڑھا تھا سب بھلا دیا۔ میڈیکل پڑھی تھی سب بھلا دی۔ ہاں یہ حدیثِ دوست ہے' اللہ کا کلام ہے' اس کی تکرار میں کر رہا ہوں۔ بہرحال پہلا زینہ یہی ہوگا۔ پھر جو لوگ اس میگنٹ کے ساتھ چمٹ کر آ جائیں انھیں بیعت کی بنیاد پر منظّم کیا جائے' جو محمد رسول اللہ ﷺ ہمارے لیے بطور اُسوہ چھوڑ گئے ہیں۔ تنظیم کی بنیاد کسی انگریزی نظام پر نہ ہو' کوئی دو تین سال کی امارت کا معاملہ نہ ہو' کوئی انتخابِ امیر کا معاملہ نہ ہو' بلکہ جس داعی نے تمہیں دعوت دی اور تم نے اس کی بات کو صحیح تسلیم کیا' اس کی دعوت پر اعتماد کیا' اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ اس عہد کے ساتھ دے دو کہ ہم شریعت کے دائرہ کے اندر اندر آپ کا حکم مانیں گے۔ اپنا مشورہ ضرور دیں گے لیکن فیصلہ آپ کا ہوگا۔ جو لوگ اس بنیاد پر جمع ہو جائیں اب ان کی تربیت کی جائے۔ قرآن ان کے اندر اتارا جائے۔ راتوں کو جاگنے کی تشویق دلائی جائے۔ اللہ کی راہ میں انفاقِ مال اور بذلِ نفس کی تلقین کی جائے۔ نفاق کو ختم کرنے والی شے انفاق ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ صبرِ محض (Passive Resistance) کا مرحلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ آج صبرِ محض کی شکل کیا ہوگی؟ ہم ابھی حکومت کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہیں۔ مکہ کی چھوٹی سی آبادی میں تو سو پچاس آدمی بھی خطرہ بن کر نظر آ گئے تھے' لیکن یہاں پندرہ کروڑ میں دو چار ہزار آدمی ایسے ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے؟ لہٰذا ابھی ان پر حکومت کی طرف سے یا اس نظام کی طرف سے کوئی داروگیر شروع نہیں ہوگی۔ البتہ ان کا امتحان شریعت پر عمل کرنے میں ہوگا۔ انھیں رشوت چھوڑنی ہوگی' لیکن اس سے اپنے گھر والے دشمن ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ ناشتے میں پہلے پراٹھے اور انڈے کھاتے تھے' اب انھیں روکھی سوکھی پر گزارہ کرنا پڑے گا۔ سورۃ التغابن میں ارشاد ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ﴾ (آیت ۱۴) ''اے ایمان والو! تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے تمہارے دشمن ہیں' پس ان سے بچ کر رہو''۔ آپ اپنے گھر میں شرعی پردہ نافذ کریں گے تو آپ کی پوری برادری آپ کا سوشل بائیکاٹ کر دے گی۔ تو یہ ہے وہ صبرِ محض (Passive Resistance) کا مرحلہ جس سے ابھی ہم گزر رہے ہیں' لیکن اللہ کرے کہ وہ وقت بھی آئے کہ اتنے لوگ مجتمع ہوں کہ حکومت کو ان سے اندیشہ لاحق ہو جائے کہ یہ اس نظام کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ پھر داروگیر ہوگی' دارورسن کا معاملہ ہوگا۔

دورِ حاضر میں حالات واقعتاً اس درجے تبدیل ہوگئے ہیں کہ انقلاب کے آخری مرحلے یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) کے بارے میں اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کے دور میں ایک طرف مسلمان اور دوسری طرف کفار تھے' اور حربی کافر کی گردن مارنے میں کسی کو کیا جھجک ہوسکتی تھی۔ جبکہ آج صورت حال یہ ہے کہ اِدھر بھی مسلمان ہیں اور اُدھر بھی مسلمان۔ ہمارے حکمران جیسے بھی ہوں' ہیں تو مسلمان۔ بھٹو' بےنظیر' ضیاء الحق' نواز شریف اور پرویز مشرف سب مسلمان ہیں۔ دوسرے یہ کہ اُس زمانے میں طاقت کا فرق صرف تعداد کے اعتبار سے تھا۔ اِدھر ۳۱۳ رضا کار (volunteers) تھے تو اُدھر ایک ہزار رضا کار۔ اُدھر بھی باقاعدہ تربیت یافتہ مسلح فوج نہیں تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اُدھر ٹینک' توپیں' میزائل اور بم ہوں اور اِدھر مجاہدین صرف تلواریں لیے کھڑے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کی فوج کا رسالہ دو گھوڑوں پر مشتمل تھا' اُدھر سو گھوڑوں پر مشتمل رسالہ تھا۔ چنانچہ تعداد میں فرق ضرور تھا' نوعیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہ تھا۔

مزید برآں عمرانی ارتقاء (Social Evolution) کے نتیجے میں آج اس بات کا امکان موجود ہے کہ بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کی جاسکتی ہے۔ آج یہ مانا جاتا ہے کہ ریاست اور ہے' حکومت اور ہے۔ شہری ریاست کے وفادار ہوتے ہیں' حکومت کے نہیں۔ حکومت کی تبدیلی تو عوام کا حق ہے۔ اُس وقت تک ابھی عمرانی ارتقاء اس سطح تک نہیں پہنچا تھا' لہٰذا حکومت اور ریاست گڈمڈ تھے۔ اب یہاں پر بغیر جنگ کے حکومت تبدیل کرنے کے دو راستے ہیں' ایک الیکشن کا راستہ اور ایک احتجاجی تحریک (Agitation) کا راستہ۔ الیکشن کے راستے سے نظام نہیں بدل سکتا' خواہ الیکشن کتنا ہی شفاف اور منصفانہ ہو۔ اس سے تو صرف نظام کو چلانے والے ہاتھ بدل جاتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کے معاشرے میں طاقت کے جو ستون موجود ہیں الیکشن میں انہی کا انعکاس ہوگا۔ اگر ملک میں جاگیردارانہ نظام ہے تو کوئی جاگیردار ہی منتخب ہو کر آئے گا۔ اگر سرمایہ دارانہ نظام ہے تو کوئی سرمایہ دار ہی آئے گا۔ یہ تو شہروں میں کچھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے کہ کبھی کراچی میں جماعت اسلامی کی پوزیشن مستحکم ہوگئی تھی' کبھی ایم کیو ایم کی ہوگئی۔ کیونکہ شہروں میں نہ جاگیردار ہیں نہ قبائلی سردار۔ البتہ ہمارے دیہی علاقوں میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام قائم ہے۔ سرمایہ دار اور جاگیردار الیکشن کے ذریعے منتخب ہو کر اقتدار میں آئیں گے تو کیا وہ جاگیرداری اور

سرمایہ داری ختم کر دیں گے؟ اس طرح تو وہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماریں گے۔ تو جان لیجیے کہ الیکشن کسی نظام کو چلانے کے لیے ہوتا ہے' اسے بدلنے کے لیے نہیں ہوتا۔ امریکہ میں دو پارٹیز ہیں' ری پبلیکنز اینڈ ڈیموکریٹس۔ ان دونوں کے مابین امریکہ کے نظام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دونوں پارٹیوں کا دعویٰ صرف یہ ہے کہ ہم اس نظام کو اچھے انداز سے چلا سکتے ہیں۔ ان کے منشور میں فرق ہوگا تو ٹیکسیشن پالیسی' ہیلتھ پالیسی یا امیگریشن پالیسی کا ہوگا۔ برطانیہ میں کنزرویٹوز اور لیبر پارٹی کے نام سے دو پارٹیاں ہیں۔ نظام کے بارے میں ان کے مابین بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہاں' اگر امریکہ میں کمیونسٹ ہوں تو وہ نظام کے خلاف بولیں گے۔ چنانچہ سی ایٹل اور واشنگٹن میں گلوبلائزیشن کے خلاف ہونے والے مظاہرے یہ پتا دیتے ہیں کہ وہاں کمیونسٹ عنصر موجود ہے۔ لیکن ظاہر بات ہے وہ لوگ الیکشن کا راستہ کبھی بھی اختیار نہیں کریں گے' الیکشن کے ذریعے ان کی کامیابی کا سوال ہی نہیں۔ ....

موجودہ دور میں اقدام کی نوعیت

دریں حالات ایک ہی راستہ باقی ہے۔ وہ یہ کہ ایک پُرامن' منظّم عوامی تحریک اٹھے جو توڑ پھوڑ نہ کرے اور سرکاری یا غیر سرکاری املاک کو نقصان نہ پہنچائے۔ البتہ یہ لوگ خود جانیں دینے کو تیار ہوں۔ اس کو میں ''یک طرفہ جنگ'' سے تعبیر کرتا ہوں۔ یہ لوگ سڑکوں پر آ کر منکرات کے خلاف احتجاجی مظاہرے کریں۔ یہ لوگ حکومت پر اپنا موقف واضح کریں کہ ہم نے منکرات کے انسداد کے لیے آپ سے بہت درخواستیں کیں' آپ کے آگے ہاتھ جوڑے کہ خدارا سود ختم کر دو' لیکن اب ہم picketing کریں گے' دھرنا دیں گے' بینکوں کا گھیراؤ کریں گے اور اس سودی نظام کو جیتے جی نہیں چلنے دیں گے۔ چلاؤ ہم پر گولیاں!

میرے خیال میں اس وقت انقلاب کے لیے یہی قابل عمل طریقہ ہے۔ اگر ہم مشتعل ہو کر اسلحہ اٹھائیں تو کس کے خلاف اٹھائیں گے؟ بری افواج یا ایئر فورس کے خلاف؟ کیا ہماری ماضی کی حکومتوں نے بلوچستان میں دو مرتبہ ایئر فورس استعمال نہیں کی؟ کیا ایئر فورس کے ذریعے سے حافظ الاسد نے ایک دن میں ہزاروں اخوان ختم نہیں کر دیے تھے؟ اور ان کا مرکز بمباری کر کے تباہ و برباد نہیں کر دیا تھا؟ تو آج مقابلہ بہت غیر مساوی (unequal) ہے۔ جہاں ممکن ہو

دوطرفہ جنگ بھی ہوسکتی ہے' کسی پہاڑی ملک میں کوئی چھاپہ مار جنگ بھی ہوسکتی ہے' یہ حرام نہیں ہے۔ دین کو قائم کرنے کے لیے حضورﷺ نے جنگ لڑی ہے تو ہم بھی لڑ سکتے ہیں اور کلمہ گو کے خلاف بھی لڑ سکتے ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کے موقف کے مطابق مسلمان حکمران اگر فاسق و فاجر ہوں تو ان کے خلاف بغاوت کی جاسکتی ہے۔ پہلے تو امر بالمعروف و نہی عن المنکر زبان سے کیا جائے۔ اگر یہ زبان سے کہنا مؤثر ثابت نہ ہو تو پھر تلوار کے ذریعے سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کیا جاسکتا ہے۔ تو جنگ اگرچہ جائز ہے' لیکن موجودہ حالات میں عملاً ممکن نہیں ہے۔ آج کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف یک طرفہ جنگ ہی موزوں لائحہ عمل ہے۔

اگر کسی حکومت کے خلاف اس طرح کی ایک احتجاجی تحریک چلتی ہے تو ظاہر ہے اسے روکنے کی کوشش کی جائے گی۔ شروع میں فوج حکومت کا حکم مانے گی اور مظاہرین پر گولیاں چلائے گی۔ لیکن ایک وقت میں آ کر فوج ہاتھ اٹھا دے گی کہ ہم اپنے ہم وطنوں کا مزید قتل نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی قابض فوج نہیں ہے' قومی فوج ہے' اور جو سامنے کھڑے ہیں وہ بھی کہیں اور سے نہیں آئے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر نے اگر سینکڑوں ہزاروں افراد بھون کر رکھ دیے تھے تو اسے ان کا کیا دکھ تھا؟ وہ انگریز تھا اور مرنے والے ہندوستانی تھے' چاہے مسلمان ہوں چاہے ہندو یا سکھ ہوں۔ لیکن اپنی قوم کے لوگوں کو مارنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ ایک حد تک تو حکم کی تعمیل کی جاتی ہے' پھر ایک وقت آتا ہے کہ جب اپنے فوجی افسر ہاتھ کھڑے کر دیتے ہیں۔ جیسے لاہور میں بریگیڈیئر محمد اشرف گوندل' اللہ تعالیٰ انہیں اجر وثواب دے' کھڑے ہو گئے کہ اب ہم لوگوں پر مزید گولیاں نہیں چلائیں گے۔ پھر دو اور بریگیڈیئر کھڑے ہو گئے اور بھٹو صاحب کو پیغام مل گیا۔ چند دن پہلے انھوں نے ٹیلی ویژن پر خطاب کرتے ہوئے اپنی کرسی کے بازو پکڑ کر اکڑتے ہوئے کہا تھا کہ میری یہ کرسی بہت مضبوط ہے۔ مجھے آج تک وہ نقشہ یاد ہے۔ لیکن جب لاہور سے پیغام پہنچ گیا کہ فوج کا اب یہ نقطہ نظر ہے تو وہ کرسی ڈول گئی۔ پھر انھوں نے پی این اے کو مذاکرات کا پیغام بھجوایا۔ بہرحال اسلامی انقلاب کے لیے جانیں تو دینی ہوں گی' اس کے بغیر یہ کام نہیں ہوگا۔

دورِ حاضر میں ہمارے سامنے ایرانیوں کی مثال موجود ہے کہ انھوں نے اپنی جانیں

دے کرانقلاب برپا کر دکھایا۔ اگرچہ ایرانی انقلاب کو میں صحیح اسلامی انقلاب نہیں سمجھتا' بلکہ میرے نزدیک تو وہ ایک حقیقی انقلاب بھی نہیں تھا' اس لیے کہ وہ اپنی سرحدوں سے باہر نکل نہیں سکا' جبکہ ''تصدیرِ انقلاب'' ایک حقیقی انقلاب کا لازمی خاصہ ہے۔ ۸۵/۱۹۸۴ء میں مَیں نے مسجد دارالسلام باغ جناح میں اس موضوع پر خطابات کیے تھے کہ کیا ایرانی انقلاب اسلامی انقلاب ہے؟ اور پھر اس کے بعد ''منہج انقلابِ نبوی ﷺ'' کے موضوع پر گیارہ تقریریں کی تھیں' جن کا خلاصہ آج آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ وہ تقریریں اب ''منہج انقلابِ نبوی ﷺ'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔ اگر آپ کے دل میں ذرا بھی کوئی جذبہ ابھرا ہے تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

وقت کی اہم ترین ضرورت

آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ طریق انقلاب واضح ہو جائے۔ آج مسلمانوں میں جذبے کی کمی نہیں ہے۔ ہزاروں لوگ جانیں دے رہے ہیں۔ اپنے جسموں سے بم باندھ کر اپنے جسموں کو اڑا رہے ہیں۔ کشمیر کے اندر جو جذبہ ابھرا اسے پوری دنیا نے دیکھ لیا۔ کشمیریوں کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ تو لڑنے والی قوم ہے ہی نہیں' اب اس کے اندر جان پیدا ہو چکی ہے۔ پاکستان سے جا کر کتنے لوگوں نے وہاں پر جامِ شہادت نوش کر لیا۔ لیکن اسلامی انقلاب کا طریق کار یہ نہیں ہے۔ اس سے کہیں کامیابی نہیں ہوگی۔ اس طریقے سے آپ صرف اپنا غصہ نکال سکتے ہیں۔ آپ نے جا کر افریقہ میں امریکہ کے دو سفارت خانوں کو بم سے اڑا دیا' اس سے امریکی تو دس پندرہ مرے' جبکہ ۲۰۰ وہاں کے لوکل افریقی مر گئے۔ فائدہ کیا ہوا؟ بس یہی کہ آپ نے اپنا غصہ نکال لیا۔ تو ان طریقوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ الیکشن سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اس طرح اسلامی انقلاب کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔ آپ کا خلوص اپنی جگہ' لیکن یہ طریقہ غلط ہے۔ اسلامی انقلاب کے لیے طریقہ محمدی ﷺ اختیار کرنا ہوگا۔ کیا حضور ﷺ عرب میں الیکشن کے ذریعے سے کامیاب ہو سکتے تھے؟ قرآن تو کہتا ہے ﴿وَاِنۡ تُطِعۡ اَكۡثَرَ مَنۡ فِى الۡاَرۡضِ يُضِلُّوۡكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ﴾ (الانعام:۱۱۷) ''اگر تم زمین میں رہنے والوں کی اکثریت کی پیروی کرو گے تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر کے چھوڑیں گے''۔ الیکشن میں تو صرف اکثریت اقلیت کا مسئلہ ہے۔ میں اس سے بھی بڑھ کر کہتا ہوں' کیا آیت اللہ

خمینی الیکشن کے ذریعے ایران میں برسرِ اقتدار آ سکتے تھے؟ قطعاً ناممکن! خدا کے لیے اپنے آپ کو دھوکہ دینا چھوڑ دو۔ آج پوری امت عذابِ الٰہی سے صرف اس صورت میں نکل سکتی ہے کہ کم از کم کسی ایک ملک میں اللہ کے دین کو قائم کر کے پوری دنیا کو دعوت دے سکے کہ آ ؤ دیکھو' یہ ہے اسلام! اس کی برکتیں دیکھو ــــ اس کی سعادتیں دیکھو ــــ یہاں کی مساوات اور یہاں کا بھائی چارہ دیکھو ــــ یہاں کی آزادی دیکھو ــــ یہاں کا امن وامان دیکھو!! اگر ہم یہ نہ کر سکے تو پھر اللہ کا عذاب سخت سے سخت تر ہوگا۔ ؏ ''اور کچھ روز فضاؤں سے لہو برسے گا!'' عذاب کی شدت بڑھے گی' گھٹے گی نہیں۔ اور سب سے بڑھ کر عالمِ عرب پر عذابِ خداوندی کے کوڑے برسیں گے۔ اس لیے کہ ان پر اللہ کا بہت بڑا احسان ہوا تھا۔ رسولِ عربی محمد رسول اللہ ﷺ ان میں سے تھے ؏ ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!'' پھر یہ کہ ان کی زبان میں اللہ نے اپنی آخری کتاب نازل فرمائی۔ ہم تو چٹائی توڑ تعلیم حاصل کرنے کے بعد عربی سیکھ کر قرآن کو سمجھ سکتے ہیں' لیکن ان کی یہ مادری زبان ہے۔

بہرحال پاکستان کی بقا اسی میں ہے کہ یہاں اسلامی انقلاب آئے۔ یہی اس کی وجہ جواز ہے۔ ورنہ پاکستان کا حال تو اس وقت یہ ہے جیسے سورۃ الواقعہ کے آخری رکوع میں نقشہ کھینچا گیا ہے کہ جب کسی پر نزع کا عالم ہوتا ہے اور اس کے رشتے دار کھڑے ہوئے دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ وہ جا رہا ہے' لیکن بے بس ہوتے ہیں ــــ فرمایا: ﴿فَلَوْ لَآ اِنْ کُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ ''پھر اگر تم کسی کے محکوم نہیں ہو تو اس کی نکلتی ہوئی جان کو واپس کیوں نہیں لے آتے اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو؟'' اسی طرح میں کہہ رہا ہوں کہ یہ پاکستان جا رہا ہے۔ پھر آپ کے محل آپ کے نہیں' کسی اور کے ہوں گے۔ آپ کی ملیں' آپ کے کارخانے کسی اور کے ہوں گے ؏ 'دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں!'' اگر یہاں اسلام نہ آیا تو پاکستان کو باقی رہنے کا حق حاصل نہیں رہے گا۔ میں نے ''موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام اور پاکستان کا مستقبل'' کے جامع عنوان کے تحت دو تقریریں کی تھیں ــــ موجودہ عالمی حالات کے پس منظر میں اسلام کا مستقبل کیا پاکستان کے خاتمے کی الٹی گنتی شروع ہو چکی ہے؟ اور کیا ابھی نجات کی کوئی راہ کھلی ہے؟ ــــ نجات کی واحد راہ یہ ہے کہ یہاں اسلامی نظام لایا جائے۔ لیکن اس کی خواہش اور جذبہ رکھنے والوں کے سامنے چونکہ طریق کار واضح نہیں ہے

لہٰذا وہ اِدھر اُدھر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔

میں نے سیرتِ نبوی ﷺ سے استفادہ کرتے ہوئے اس سے استنارِنُو رکرتے ہوئے آپ کے سامنے وہ طریق انقلاب رکھ دیا ہے کہ اس کو اختیار کریں گے تو کامیابی کا امکان ہے ورنہ آپ کا خلوص واخلاص اپنی جگہ پر کامیابی ممکن نہیں۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

3

انقلاب کا مفہوم
یعنی منشورِ انقلاب
منشورِ اسلام

انقلاب کا مفہوم یعنی منشورِ انقلاب

انقلاب کے معنی تبدیلی کے ہیں۔نظریۂ انقلاب دینے والے ذہن میں اس انقلاب، اس کے مراحل، اس کی مخالف قوتیں، مزاحمتی کشاکش کا سارا نقشہ بہت حد تک واضح ہوتا ہے۔ انقلاب کے داعی کے ساتھ اور باعتبار قریبی افراد بھی سمجھتے ہیں۔تاہم علامہ اقبال کے نظریۂ خودی کو ایک صدی ہونے کو آ رہی ہے اور انقلاب کا مفہوم اور اس کے مراحل دھندلا چکے ہیں لہٰذا اس حصے میں یاددہانی کے لیے قارئین اور نظریۂ خودی کے تحت انقلاب کے خواہشمند حضرات کے لیے انقلاب کا مفہوم ازسرنو سامنے رکھ رہے ہیں تاکہ نصب العین اور منزل سامنے رہے۔

ا۔ علامہ اقبال کا تصور

(2) جانتا ہوں میں یہ اُمّت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں
الحذر! آئین پیغمبرؐ سے سو بار الحذر
حافظ ِناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقاں، نے فقیر رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک وصاف
مُنعِموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں، اللہ کی ہے یہ زمیں!
چشمِ عالم سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب
یہ غنیمت ہے کہ خود مومن ہے محرومِ یقیں!
ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتابُ اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے

(3)

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات!
ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات؟
آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے
یا مجدد، جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات؟
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم
اُمتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟
کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دَور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالم کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!

خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات!
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات!
مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ب۔ ڈاکٹر رفیع الدین کا تصور

منشورِ اسلام

یعنی اسلام کی تشریح ایک ایسے نظریۂ زندگی کی
حیثیت سے جو آخر کار لازماً دنیا میں پھیل کر رہے گا

یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَ یَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ○ ھُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ○

یہ (کفار اور مشرکین) چاہیے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہہ (کی پھونکوں) سے بجھا دیں۔ لیکن اللہ اپنے نور کو پورا کیے بغیر نہیں رہے گا خواہ یہ بات کافروں کو کتنی ہی بری کیوں نہ لگے۔

اللہ ہی تو وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق (سچے نظریۂ حیات) کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ وہ اس دین حق کو تمام ادیانِ عالم پر غالب کر دے۔ اگر چہ مشرکوں کو کتنی ہی ناخوشی کیوں نہ ہو۔ (سورۂ توبہ آیات ۳۲،۳۳)

اسلام کیا ہے؟

اسلام کی مختصر تعریف یہ ہے کہ اسلام اس نظریۂ حیات کا نام ہے جس کی تعلیم انبیاء کرام علیہم السلام ابتدائی زمانہ سے دیتے رہے ہیں۔ دنیا کے تمام خطوں میں بے شمار انبیاء وقتاً فوقتاً ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں تاکہ نوعِ انسانی کے تمام حصوں کو اُن کے زمانہ کے حالات، ان کی زندگی کے واقعات اور ان کے ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی ارتقا کے مقامات کے مطابق اس نظریۂ حیات کی تعلیم دیں۔

وَاِنْ مِنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ (۳۵:۲۴)

اور کوئی اُمت (قوم) ایسی نہیں جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلًا مِنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ (۴۰:۷۸)

اور ہم نے تم سے پہلے (بہت سے) پیغمبر بھیجے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن کے حالات تم سے بیان کر دیے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے حالات بیان نہیں کیے۔

ان انبیاء کی تعداد کا اندازہ ایک لاکھ سے زیادہ گیا گیا ہے، اور چونکہ ان سب کی دعوت بنیادی طور پر یکساں رہی ہے اس لیے ہر نبی نے اپنے پیش رو انبیاء کی صداقت کی گواہی دی ہے اور اپنے بعد آنے والے نبی کے ظہور کی پیش گوئی کی ہے۔ بہر حال چونکہ حضرت محمد ﷺ کی نظری تعلیم اور عملی زندگی کی مثال میں تمام انبیاء کی دعوت کی نظری تلقین اور انسان کی قدرتی عملی زندگی کے تمام ضروری شعبوں پر (جن میں ان کی زندگی کے عمرانی، اقتصادی، سیاسی اور فوجی شعبے بھی شامل ہیں، اس کا عملی اطلاق دونوں اپنے کمال کو پہنچ گئے ہیں۔ لہٰذا آپ بجا طور پر آخرالانبیاء قرار پائے ہیں اور 'اسلام' کی اصطلاح بھی آپ ہی کی تعلیمات کے لیے جو قرآن وسنت کے اندر موجود ہیں، مخصوص ہوگئی ہے۔ چونکہ تمام انبیاء کی تعلیم بنیادی طور پر ایک ہی ہے اور اس کا سرچشمہ بھی جو خدا کی ذات ہے، ایک ہی ہے۔ لہٰذا قرآن کا ارشاد ہے کہ جو شخص گزشتہ انبیاء میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے وہ سچا مسلمان نہیں۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی کتاب ''منشورِ اسلام' کے ابتدائی حصہ کے عنوانات اور سرخیاں ملاحظہ ہوں

1۔ اسلام کی روح

2۔ اسلام کی ضرورت

3۔ انسانی فطری تجزیہ،انسان کی طبعی خواہشات کے دو درجے،انسان کی نچلے درجے کی خواہشات

4۔ انسان کی بلند تر درجہ کی خواہشات

5۔ آرٹ کی ایک عام قسم

6۔ نصب العین کی خواہش انسان کی تمام دوسری خواہشات پر حکمران ہوتی ہے

7۔ نصب العین کی خواہش اور نوعِ انسانی کی ذہنی اور اخلاقی صحت

8۔ تاریخ کا مدعا

9۔ نصب العین کی عمومی صفات

ج۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا تصور

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے تصور انقلاب کے مطابق جب کسی ملک میں اسلامی انقلاب برپا ہو جائے تو یہ تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ گویا یہ تبدیلیاں انقلاب کی نشانیاں ہوں گی۔

(i) سماجی سطح پر

☆ کامل انسانی مساوات اور گہری اسلامی اخوت قائم ہوگی اور نسل، رنگ، زبان، پیشے اور جنس کی بنیاد پر نہ کوئی اونچا رہے گا اور نہ کوئی نیچا، بلکہ عزت اور شرافت کا معیار صرف تقویٰ اور پرہیز گاری ہوگا۔

☆ پردہ یعنی ستر وحجاب کے شرعی احکام کے نفاذ سے خواتین کی نسوانیت اور عزت و وقار کو کامل تحفظ حاصل ہوگا اور اسلام کے ''حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں'' خاندانی نظام (غیر مخلوط تصور معاشرت) کے تحت خواتین کو معاشی کفالت کی پوری ضمانت حاصل ہوگی تا کہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ آئندہ نسل کی تربیت کے فرائض بہترین طور پر انجام دے سکیں۔ البتہ ان کے حقوق ملکیت و وراثت کو مکمل تحفظ حاصل ہوگا اور (غیر مخلوط ماحول میں) تعلیم، صحت اور گھریلو صنعتوں کے میدان میں ان کی قوتیں اور صلاحیتیں قومی سطح پر بھرپور بروئے کار آئیں گی۔

☆ اسلامی حدود اور تعزیرات کے نفاذ سے بدامنی کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا اور قتل، چوری

اور ڈاکہ کے علاوہ زنا اور تہمتِ زنا کی بھی بیخ کنی ہو جائے گی۔

☆ سماجی برائیوں جیسے رشوت، بے جا اسراف، نمود و نمائش پر دولت کا ضیاع اور شادی بیاہ کی ہندوانہ رسومات کا استیصال ہو جائے گا۔

☆ مفت اور جلد انصاف مہیا ہوگا اور جھوٹی گواہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

☆ تعلیم کے ضمن میں جدید اور قدیم، دینی اور دنیوی اور امراء اور غرباء کی تقسیم ختم ہو جائے گی۔ سب کے لئے ایک ہی نظام تعلیم ہوگا جو کم از کم میٹرک تک مفت ہوگا۔

(ii) معاشی سطح پر

☆ ریاست ہر شہری کی ناگزیر بنیادی ضروریات یعنی غذا، لباس، رہائش، تعلیم اور علاج کی کفالت کی ذمہ دار ہوگی اور اس کے لیے مسلمانوں سے زکوٰۃ اور عشر اور غیر مسلموں سے جزیہ کی وصولی کا نظام پوری طرح سے نافذ ہوگا۔

☆ مزید برآں صدقاتِ نافلہ، انفاقِ فی سبیل اللہ اور قرضِ حسنہ (یعنی بلا سود قرضہ دینے) کا جذبہ پروان چڑھے گا۔

☆ سود کی لعنت کا مکمل طور پر خاتمہ ہو جائے گا اور جوئے، سٹے، لاٹری، دوطرفہ آڑھت اور خرید و فروخت کی جملہ حرام صورتوں کے کلی انسداد سے سرمایہ داری کی جڑ کٹ جائے گی۔

☆ شریعت اسلامی کی حدود کے اندر اندر انفرادی ملکیت اور آزاد معاشی جدوجہد کی فضا برقرار رہے گی۔ اس ضمن میں صحت مند مقابلہ سے صنعت و تجارت کو فروغ اور پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

☆ آجر و مستاجر یعنی مزدور اور کارخانہ دار کے درمیان اسلامی اخوت اور عدل و انصاف کے علاوہ قانونی سطح پر باہمی سودا کاری میں مزدور کو ریاست کی جانب سے کفالت کی ضمانت کا سہارا حاصل ہوگا۔

☆ جاگیرداری کی لعنت کا مکمل خاتمہ ہو جائے گا (جس سے زمینداری کی ساری برائیاں بھی ختم ہو جائیں گی) اور خواہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے متفقہ فتویٰ پر عمل کے ذریعہ کہ مزارعت (اپنی اکثر صورتوں میں) حرام ہے اور خواہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد (جو عراق کی مفتوحہ زمینوں کے ضمن میں انھوں نے اختیار کیا) پر مبنی فقہ حنفی کے اس فتویٰ پر عمل کے ذریعہ کہ جو علاقے کسی بھی وقت بزور شمشیر فتح ہوئے تھے ان کی اراضی انفرادی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ

اسلامی ریاست کے بیت المال کی ملکیت ہوتی ہے۔

(iii) سیاسی سطح پر

☆ حاکمیّت مطلقہ صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ چنانچہ کوئی قانون سازی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کے منافی نہیں کی جاسکے گی اور اعلیٰ عدالتوں کو پورا اختیار ہوگا کہ قرآن وسنت کے منافی ہر قانون کو بلا استثناء کالعدم قرار دے دیں۔

☆ ریاست کے کامل شہری صرف مسلمان ہوں گے (چنانچہ کلیدی عہدوں پر صرف مسلمان فائز ہوسکیں گے) اور ان کے حقوقِ شہریت بالکل مساوی ہوں گے (تاہم ذمہ داریوں کے لیے اضافی شرائط ملحوظ رکھی جائیں گی) اور وہ اسلام کے اصول مشاورت کے مطابق باہمی مشورے سے ملک کے نظام کو چلائیں گے۔

☆ قانون کی نگاہ میں سب برابر ہوں گے اور کوئی شخص حتیٰ کہ صدرِ ریاست (خلیفہ یا امیر یا وزیر اعظم) بھی قانون سے بالاتر نہ ہوگا۔

☆ غیر مسلموں کی جان و مال اور عزت وآبرو کی حفاظت کا پورا ذمہ لیا جائے گا اور انہیں کامل معاشی اور مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ چنانچہ وہ اپنی آئندہ نسلوں کی اپنے مذہب کے مطابق تعلیم وتربیت کے حقدار ہوں گے۔البتہ انہیں مسلمانوں میں تبلیغ کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

☆ وحدانی یا فیڈرل یا کنفیڈرل نظام ریاست اور اسی طرح (اماراتی یا) صدارتی یا پارلیمانی طرزِ حکومت میں سے کسے اختیار کیا جائے،اس کا فیصلہ عوام کی کھلی رضامندی پر منحصر ہوگا اس لئے کہ ان میں سے کوئی بھی نہ دینی اعتبار سے لازمی ہے نہ حرام یا ناجائز۔

☆ علاقائی یا نسلی یا قبائلی روایات میں سے جو شریعت اسلامی سے متصادم نہ ہوں، انہیں پورا تحفظ حاصل ہوگا۔اسی طرح علاقائی زبانوں کے حقوق کی حفاظت ہوگی البتہ سب سے زیادہ زور عربی (زبان کی تعلیم وترویج) پر دیا جائے گا۔

الغرض پاکستان دور جدید کی بہترین اسلامی (شورائیت کے اصولوں پر مبنی) جمہوری اور فلاحی ریاست (اور "ثم تکون خلافة علی منهاج النبوة" کا مصداق) بن جائے گا۔اللہ ہمیں اس عظیم مقصد کے لیے تن من دھن لگانے کا عزم مصمم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

حصّہ نہم

اقبال شناسی سے فکرِ اقبال کی تعمیل کی طرف

1
تذکرہ
و
تبصرہ

1 تذکرہ وتبصرہ

علامہ اقبال اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی کا حاصل بلاشبہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں بالعموم اور سرزمین جنوبی ایشیا کے شمال مغرب میں مسلم اکثریتی علاقہ میں تصورِ خودی پر مبنی ایک ریاست وجود میں آئے جو ترقی پا کر 1930ء کے الٰہ آباد کے خطبے میں درج مقاصد کو پورا کرے اور خلافت راشدہ کے معیار پر (اس سے ملتا جلتا) نظامِ عدلِ اجتماعی قائم کر کے دکھا دے۔

اس ضمن میں گذشتہ ایک صدی کی مساعی کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(ا) ع کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

عصر حاضر کی مغربی تہذیب کی بالادستی کے طے شدہ ابلیسی اقدامات میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے دنیا کے تمام مذاہب اور تہذیبی اکائیوں سے ان کا حقِ زندگی چھین لیا ہے اور حق تبلیغ واشاعت (اپنے پیروکاروں اور اولاد کو اپنا دین و مذہب سکھانا) بھی سلب کر لیا ہے۔ مغرب نے ایک دفعہ ظلم وتشدد اور ناجائز وناروا طریقوں سے عالمی قبضہ حاصل کر کے اب محکوم اقوام کی آزادی سلب کر لی ہے۔ آزادی کا نام استعمال ہوتا ہے اور آزادی یا FREEDOM لفظ بھی چھوٹے بڑے کی زبان پر ہے مگر اس آزادی کا مطلب ہر ضابطے، اصول، مذہبی روایت، آسمانی ہدایت کے احکام وضوابط، سماجی وقبائلی روایات کے تحفظ کے جذبے سے آزادی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک عالمی گلوبل TREND وسعت پذیر ہے یہ سیکولرازم اور لبرل ازم (مادر پدر آزادی) کی لہر ہے جو میڈیا کی لہروں پر سوار ملکوں کی سرحدوں، پہاڑوں، دریاؤں، ریگستانوں کو پاٹتی ہر انسانی بستی پر حملہ آور

ہے جہاں کچھ انسان زندہ ہیں۔اس عالمی تہذیب کے جان لیوا حملے سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں یا بچ گئے ہیں جو بجلی اور انٹرنیٹ استعمال نہیں کرتے۔اس لیے کہ جو شخص بجلی اور انٹرنیٹ کا رسیا ہو گیا ہے وہ ضرور بجلی ڈائرکٹ یا کوئی موبائل RECHARGE کر کے استعمال کر لے گا۔ جو بجلی اور انٹرنیٹ استعمال نہیں کر رہا اس کو کوئی انسانی بنا ہوا آلہ TRACE نہیں کر سکتا۔

(ب) آدھا خالی گلاس والی مثال

قنوطیت اور رجائیت کی آنکھ سے مشاہدہ

☆ قارئین کرام! کسی بھی انفرادی یا اجتماعی، گھریلو یا سماجی، قومی یا ملکی، قبائلی یا معاشرتی غرض ہر قسم کے معاملہ پر تبصرہ کا معاملہ تبصرہ نگار کی ذات یعنی اس کی سوچ سے الگ نہیں کیا سکتا۔ منظر ایک ہی ہوگا مگر دیکھنے والی ہر آنکھ اس منظر کو اپنے انداز میں دیکھے گی۔ عام فہم انداز میں اس بات کو سمجھانے کے لیے ایک مثال دی جاتی ہے کہ اگر چند طلباء کے سامنے میز پر شیشے کے ایک گلاس میں آدھا پانی ڈال کر رکھ دیا جائے کہ اس پر تبصرہ کرو تو ایک قسم کے ذہن کا تبصرہ یہ ہوگا کہ گلاس آدھا خالی ہے جبکہ دوسرے ذہن کا تبصرہ یہ ہوگا کہ آدھا بھرا ہوا ہے۔ پہلا تبصرہ مایوس لوگوں کا تبصرہ ہوگا اور قنوطیت پسندی PESSIMISTIC کہلاتا ہے جبکہ دوسرا تبصرہ OPTIMISTIC انداز کا ہے اس کو رجائیت یا رجائیت پسندی کہا جاتا ہے۔

☆ دونوں انداز کے تبصروں کے پیچھے اپنے انداز کا ذہن کارفرما ہے اور ان مخصوص قسم کے لوگوں کے لیے خاص انداز سے بات کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

☆ پاکستان کے موجودہ حالات میں فکر اقبال کی تعمیل کے حوالے سے دن بدن قنوطیت اور مایوسی کا غلبہ بڑھ رہا ہے اور رجائیت کے حامل افراد جو قیام پاکستان کے وقت 99% تھے تو اب گھٹ کر 40% رہ گئے ہیں اور یہ تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ وجہ بظاہر یہ ہے کہ پاکستان کا کوئی ادارہ یعنی نظامِ تعلیم، اخبارات، الیکٹرونک میڈیا، ٹاک شوز، منبر و محراب کی گفتگو، غرض کہیں سے بھی فکرِ اقبال کی تجدید و احیاء کے بارے میں آواز نہیں اُٹھائی جا رہی۔

☆ مغربی تہذیب کے صہیونی کارپردازوں نے مسلمانوں اور بالخصوص ہر آنے والی نسل کو علامہ اقبال سے نابلد رکھ کر اس سے لاتعلق کر دیا ہے۔ حکومتی سطح پر پہلے صرف سرکاری چھٹی یا دیگر

چند موقعوں پر علامہ اقبال کا ذکر خیر ہوتا تھا اب وہ بھی زوال پذیر ہے۔

علامہ اقبال کا فکر ہی مٹ گیا تو اس کی تعمیل و ترویج اور پاکستان کے دنیا کی سطح پر عالمی رول ادا کرنے کا اسلامی جذبہ کہاں سے آئے گا؟ یہ سوال حکومتی ایوانوں، فکر اقبال کے وارثوں اور علامہ اقبال کے مداحوں اور ثنا خوانوں کے لیے خطرہ کی گھنٹی ہے۔

حکمت بالغہ کی اس خصوصی اشاعت کا مقصد بھی یہی ہے اور اس سے پہلے کہ ہم کہیں کہ اب اصلاح ناممکن ہے، IT IS TOO LATE، آج جاگنا چاہیے اور اپنا فرض ادا کرنا چاہئے اور اپنے حصے کا کام کرنا چاہیے۔

(ج) مثبت رویے کی کمی منفی رویوں کو بڑھا رہی ہے

اوپر قدرے وضاحت ہوگئی ہے جب مشاہدہ یہ پکار رہا ہے کہ پاکستان میں فکر اقبال کی تعمیل و ترویج کے لیے فکر مند لوگ بتدریج کم ہو رہے ہیں تو اس بات کا لامحالہ منطقی نتیجہ ہے کہ قنوطیت اور مایوسی بڑھ رہی ہے۔ علامہ اقبال سے مایوسی ــــ اسلام سے مایوسی ہے۔ فکر اقبال سے لاتعلقی پاکستان کے قیام پر عدمِ اعتماد ہے۔ پاکستان کے قیام پر عدمِ اعتمادی اور عدم جواز پاکستان کے لیے پڑوس میں موجود بھارت جیسے دشمن کے ہوتے ہوئے سم قاتل ہے اور جیسے بڑی مچھلی چھوٹی کو کھا جاتی ہے یا موسمیاتی زبان میں ہوا کے دباؤ کی کمی آندھیوں کو جنم دیتی ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں میں فکر اقبال سے لاتعلقی پاکستان کے مستقبل سے وابستہ اُمنگوں، آرزؤں اور خوابوں کو چکنا چور کر دے گی، پھر پاکستان کی بقا اور استحکام کے لیے سوچنے والے کم اور اس کی بقا سے لاتعلق آج سے دس سال بعد بہت زیادہ ہوں گے۔ ان حالات میں پاکستان کا وجود اور عدمِ وجود برابر ہو جائے گا۔ یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے جو آج پاکستانی مسلمان سوچ بھی نہیں سکتا، مگر افسوس اس بات کا ہے ہم سب اسی تباہی کی طرف ہی بڑھ رہے ہیں۔ بقول اقبال:

؎ وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی ہے
تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

دو قومی نظریہ بے وقعت ہوگیا۔ اسلامی ریاست نہ رہی ہجرت اور جہاد کا جذبہ مغربی و امریکی دباؤ میں TERRORISM قرار پایا تو پھر جو کچھ بچے گا وہ فلمی دنیا کی CELEBRITIES

اور کرکٹ سٹارز ہیں، فلمی دنیا کے ستارے اور کرکٹ سٹارز پہلے ہی مسلمان نوجواں کے ذہن سے ہدایت کے ستاروں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، دین، قرآن، آخرت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی اور فدائیت کا جذبہ کھوکھلا کر چکے ہیں۔ اگر کوئی زوردار داعیہ آج ملک پاکستان کی غم زدہ اور متفکر PRO_PAKISTAN اور PRO-IQBAL زندہ اقلیت کو سہارا نہ دے سکا اور یہ بھی مزید کمزور پڑ گئی تو پھر نہ کہنا کہ وقت گذر گیا اب اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اللہ ایسا نہ کرے۔ یہ ہماری سیاہ بختی ہو گی اور بدبختی کی انتہا ہو گی کہ یہ سب کچھ ہمارے سامنے ہو، ہماری نگاہوں کے سامنے ہو اور اس قنوطیت کے قافلے ہماری اگلی نسل میں بھی شامل ہوں۔ اعاذنا اللہ من ذالک۔

مسلمان خواتین کے لیے

مجھے مستور رہنے دو.....!
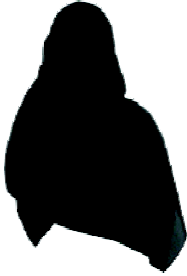
میں حکم ربّ پہ نازاں ہوں، مجھے مسرور رہنے دو
رداء ہے یہ تحفّظ کی ، مجھے مستور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو............

مثال سیپ میں موتی ، مجھے رب قیمتی سمجھے
مجھے اپنی قدر افزائی پہ مغرور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو............

زمانے کی نظر گہنا نہ دے پاکیزگی میری
حیا کے لعل و گوہر سے مجھے پُر نور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو............

زمانہ خلق ہے ، میں ذریعۂ تخلیق ٹھہری ہوں
مجھے اس منصبِ تخلیق پہ معمور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو............

نہیں محتاج میری ذات مصنوعی سہاروں کی
حیا کی پاسداری سے ، مثال حور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو............

میرے سر پر جو چادر ہے میرے ایمان کا سایہ
اسی سائے کی ٹھنڈک سے ہر اِک غم کافور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو......

برہنہ کر دے انساں کو یہ ہے شیطان کا حربہ
حجاب ڈھال ہے اپنی' اُسے پسپائی پہ مجبور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو......

میں اپنے دیں پر شیدا ہوں، یہ میرا تاج ہے گویا
میرے اس دیں کی کرنوں کو میرا منشور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو......

دعا ہے ناز کی آقا کہ اس اُمت کو غیرت دے
میں اس اُمت کا مرکز ہوں، مجھے غیور رہنے دو
مجھے مستور رہنے دو......

2

مفکر پاکستان علامہ اقبال کی سرزمین پاکستان میں فکرِ اقبال کی تعمیل کا کام

2 مفکرِ پاکستان علامہ اقبال کی سرزمین پاکستان میں فکرِ اقبال کی تعمیل کا کام

علامہ اقبال کی تجویز پر منصۂ شہود پر آنے والے ملک پاکستان کا آج کیا حال سناؤں اسی ملک میں جہاں کبھی اقبال کا راج اور فکر کی قدر تھی آج علامہ اقبال کو کوئی جانتا بھی نہیں، نئی نسل نے بالکل ہی فراموش کر رکھا ہے۔ ہر اقبال شناس اور فکر اقبال سے متأثر شخص اسی غم کا اظہار کر رہا ہے۔ ذیل میں ہم ڈاکٹر اسرار احمد کی کتاب ''برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل اور اس سے انحراف کی راہیں'' سے ایک باب نقل کر رہے ہیں تا کہ یہ بات عیاں ہو سکے کہ آج سے تیس سال پہلے کیا حال تھا جس کا وہ افسردہ دل کے ساتھ ذکر کر رہے ہیں آج کیا حال ہوگا یہ آپ خود اندازہ لگائیں اس باب کا عنوان ہے

(ا) اسلام کا انقلابی فکر اور اس کا زوال

معروف سکالر ڈاکٹر اسرار احمد جو علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کو اپنے دینی علم کا ایک منبع مانتے ہیں ان کے نزدیک ــــــ اسلام کے انقلابی فکر کو اگر ایک جملے میں بیان کیا جائے تو وہ یہ ہے کہ ــــــ دین و دنیا اور مذہب و سیاست کو یکجا کر کے ان کے مجموعے پر اللہ کی حاکمیّت یعنی کتابُ اللہ اور سنت رسولؐ کی غیر مشروط اور بلا استثناء بالا دستی قائم کرنے کی جد و جہد میں تن من دھن کے ساتھ حصہ لیا جائے تا کہ دین حق کے غلبے کی صورت میں وہ نظامِ عدلِ اجتماعی قائم ہو

جائے جوانسانی حریّت، اخوت اور مساوات کے معتدل اور متوازن مجموعے کی حیثیت سے خلق کے لیے خالق کی رحمت و ربوبیت اور عدل وقسط کا جامع اور کامل مظہر بن جائے ـــــ اور علاّ مہ اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار کے مطابق اس مقصد عظیم کے لیے تن من دھن لگا دینا' حتیٰ کہ ضرورت پڑنے پر جان دے دینا' دین حق کا لازمی تقاضا ہے

مقامِ بندگی دیگر' مقامِ عاشقی دیگر
زنوری سجدہ می خواہی' ز خاکی بیش ازاں خواہی
چناں خود را نگہداری کہ با ایں بے نیازی ہا!
شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

اور صرف ان عظیم ہستیوں کو مستثنیٰ کرتے ہوئے جنہوں نے خواہ اس مقصد کے لیے کوئی عملی اقدام اور اجتماعی جدوجہد نہ کی ہو' لیکن اپنی پوری زندگی ایسی کسی جدوجہد کی تمہیدی اور ابتدائی مساعی میں صرف کر دی ہو' جیسے مثلاً شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور علامہ اقبال مرحوم' باقی جس مسلمان کی زندگی اس جہد و جہاد سے خالی اور سینہ اس راہ میں جان دینے کی آرزو سے محروم ہو وہ سورۃ الحجرات کی آیات ۱۴ اور ۱۵ کی رو سے ''قانونی مسلم'' تو ہوسکتا ہے ''حقیقی مومن'' ہرگز نہیں ہوسکتا اور ایک حدیث نبوی ﷺ کی رُو سے ایسے مسلمان کی موت ایک قسم کے نفاق پر واقع ہوتی ہے۔ (مسلمؒ عن ابی ہریرہؓ)

رہے وہ لوگ جو کسی ایسی جدوجہد میں بالفعل شریک رہے ہوں' پھر خواہ اپنی کسی ذاتی کمزوری اور خامی کی بنا پر یا کسی نوع کے تکبر اور انانیت کے باعث یا کسی داعی اور قائد کی کم ہمتی سے بددل ہوکر یا اس ''خوئے دل نوازی'' کی کمی کی شکایت کی بنا پر یا اس کے کسی مرحلے پر غلط رخ اختیار کر لینے اور پھر اس پر ضد اور اصرار کے باعث علیحدگی اختیار کرلیں --- ان میں سے جو لوگ اس جدوجہد سے بالکل دست کش ہوکر بیٹھ رہیں اور عضو معطل بن کر رہ جائیں ان سے بھی اللہ کے یہاں سخت جواب طلبی ہوگی' لیکن وہ لوگ جو اپنی بزدلی اور کم ہمتی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس فکر ہی کو مجروح کرنے کی کوشش شروع کر دیں وہ تو حدیث نبوی ﷺ کے الفاظ: ''**شَرُّ النَّاسِ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ**'' کے مصداقِ کامل' یعنی آسمان تلے کی بدترین مخلوق شمار کیے جانے کے لائق ہیں۔

تاہم اس اہم حقیقت کی وضاحت کے لیے ایک اجمالی تاریخی تجزیہ ضروری ہے۔

اس حقیقت کا اعتراف تو اپنے اور غیر' دوست اور دشمن سب کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی بیس سالہ عظیم اور معجزانہ انقلابی جدوجہد کے ذریعے دین حق کے غلبے کی صورت میں متذکرہ بالا نظام عدل وقسط بالفعل قائم فرما دیا تھا ـــــ اور مزید یہ کہ یہ نظام اپنی کامل اور مکمل صورت میں آپ ﷺ کے انتقال کے بعد بھی کم ازکم تیس برس تک قائم رہا۔ البتہ اس کے ضمن میں دو وسوسے اغیار اور اعداء نے پیدا کر دیے ہیں جن کی جانب اجمالی اشارہ مناسب ہے۔ ان میں سے پہلا وسوسہ ایک ''طعنے'' کی صورت میں ہے یعنی: ''اللہ کا عطا کردہ دین' اور صرف تیس برس کی قلیل مدت؟'' جس کا مُسْکِتْ جواب یہ ہے کہ نظام اسلام کے بارے میں تو آپ بھی مانتے ہیں کہ یہ کم ازکم ایک بار اپنی کامل صورت میں قائم ہوا اور تیس برس تک قائم رہا' جبکہ جن نظاموں کا ڈھنڈورا آپ پیٹتے ہیں ان میں سے تو کوئی بھی آج تک اپنی اصل مجوزہ صورت میں کہیں ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں ہوسکا۔ چنانچہ افلاطون کی ''ریپبلک'' تو خیر تھی ہی خیالی جنت' جس جمہوریت کا خواب والٹیئر اور روسو نے خود دیکھا اور دنیا کو دکھایا تھا اس کے بارے میں جمہوریت کے بڑے سے بڑے علمبردار بھی صرف یہی کہتے ہیں کہ ع'' چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!'' کے مصداق ابھی ہم اس کی جانب پیش قدمی کر رہے ہیں! رہا مارکس اور اینجلز کا ''غیر طبقاتی اور غیر ریاستی معاشرہ'' تو یہ خواب تو اپنی تعبیر کی ادنیٰ ترین جھلک دکھائے بغیر ہی طاقِ نسیاں کی زینت بن چکا ہے!

دوسرا وسوسہ اس ''مغالطے'' کی صورت میں ہے کہ تیس برس کے بعد اسلامی نظام بالکل ختم ہوگیا تھا' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے اختتام پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی اختیار کردہ تعبیر کے مطابق دین حق کے نظام عدل اجتماعی کی چھ منزلہ عمارت کی صرف چھٹی یعنی سب سے بلند منزل منہدم ہوئی تھی' بقیہ پانچوں منزلیں قائم رہیں جو بعد میں ایک ایک کر کے کہیں ایک ہزار سال میں منہدم ہوئیں اور اس کے بعد بھی لگ بھگ دو سو سال تک کیفیت یہ رہی کہ ع ''کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی!'' ـــــ تیس برس بعد' یعنی خلافت راشدہ کے اختتام پر تو صرف یہ کمی واقع ہوئی تھی کہ حکومت کا نظام اسلام کے اعلیٰ ترین شورائی معیارات پر برقرار نہ رہا بلکہ اس میں قبائلی عصبیت کا عمل دخل ''شروع'' ہوگیا۔ تاہم اسے بھی پوری طرح ''ملوکیت'' کی صورت اختیار

کرنے میں کم از کم ایک صدی کا عرصہ لگا اور ملوکیت اپنی پوری شان اور جملہ لوازم کے ساتھ بالفعل دورِ عباسی میں جلوہ گر ہو سکی۔

پھر یہ تو ہماری تاریخ کا نہایت شاندار اور قابل فخر باب' اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیم وتربیت کا عظیم مظہر ہے کہ خلافت کے ملوکیت میں تبدیل ہونے کے تدریجی عمل کے ہر مرحلے پر اصحاب ہمت وعزیمت اس زوال اور انحطاط کو روکنے کے لیے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ چنانچہ اولین مرحلے پر سیدنا حسین ابن علی اور سیدنا عبداللہ ابن زبیر اور درمیانی اور آخری مراحل میں حضرت حسینؓ کی اولاد میں سے حضرت زید ابن علی اور حضرت حسنؓ کی اولاد میں سے محمد ابن عبداللہ المعروف بہ نفس زکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم ابن عبداللہ نے اس زوال کو اپنی جانوں کی قربانی کے ذریعے روکنے کی کوشش کی۔ اور اگر ان تمام حضرات کی مساعی دنیوی اور فوری اعتبار سے ناکام ہو گئیں تو اس سے ان پر ہرگز کوئی حرف نہیں آتا' اس لیے کہ دنیوی اور فوری اعتبار سے تو ان سے پہلے بے شمار انبیاء کرام بھی دنیا سے ''ناکام'' ہی گزر گئے تھے!

افسوس ہے کہ آج کے دور میں بعض کم ظرف اور کم ہمت بلکہ بد باطن لوگ ان نفوس قدسیہ کا ذکر توہین آمیز انداز میں کر کے اور ان کے عظیم کارناموں کو خود ساختہ فقہی اور قانونی معیار پر پرکھنے کی کوشش کر کے اپنے خبث باطن کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنی کورچشمی کے باعث وہ اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں کہ فقہ اسلامی کے دونوں اولین ائمہ' یعنی فقہاء اسلام کے سیّد الطائفہ اور ''امام اعظم'' حضرت ابوحنیفہؒ اور حدیث نبوی ﷺ کا پہلا مجموعہ مرتب کرنے والے امام دار الہجرت حضرت مالک ابن انسؒ نے حضرت نفس زکیہؒ سے دامے درمے سخنے تعاون کیا تھا' جس سے بآسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر ان حضرات کو حسینؓ ابن علیؓ اور عبداللہؓ ابن زبیرؓ کا زمانہ ملا ہوتا تو ان کا طرزِ عمل کیا ہوتا!

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ جیسے ''ایمان'' کے لطیف اور ماورائی حقائق کو ارسطو کی منطق کی محدود میزان میں تولنا ناممکن ہے' اسی طرح ان حضرات کی منوں ہی نہیں ٹنوں وزنی عزیمت کو ملوکیت کے ''نازک مزاجِ شاہاں تابِ سخن نہ دارد'' والے دور میں پروان چڑھنے والی ''فقہ'' کی سناروں والی نازک ترازو میں تولنے کی کوشش کرنا حماقت محض ہے!

بہر حال جب عالم اسلام میں حدیث نبوی ﷺ کے الفاظ میں ''کاٹ کھانے والی ملوکیت'' اور ''جابرانہ بادشاہت'' کا نظام مستحکم اور متمکن ہوگیا اور اس کی پہلوٹھی کی بیٹی بھی جوان ہوگئی یعنی جاگیرداری بھی پوری طرح رائج ہوگئی' اور عوام کو اس ظالمانہ استبدادی نظام کو ایک امر واقعی کی حیثیت سے عملاً قبول کرنا پڑا تو اس کے لازمی اور منطقی نتیجے کے طور پر مسلمانوں کے دینی تصورات میں بھی تنزل کا عمل شروع ہوگیا۔ یوں اسلام رفتہ رفتہ ''دین'' کی بجائے صرف ایک ''مذہب'' کی صورت اختیار کرتا چلا گیا جس کا اصل موضوع ''عبادات اور رسومات'' ہوتی ہیں نہ کہ ریاست و سیاست! ہوتے ہوتے یہ بات تقریباً اصول موضوعہ کی حیثیت سے تسلیم اور قبول کر لی گئی کہ حکومت کا معاملہ تو علامہ ابن خلدونؒ کی اصطلاح کے مطابق صرف ''عصبیت'' ہی کی بنیاد پر چل سکتا ہے اور اس میدان میں تو لامحالہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس' ہی کے اصول پر عمل ممکن ہے ــــ رہے ''علماء دین'' تو ان کا کام اول تو ان امراء وسلاطین کی ''سول سروس'' میں خطیبوں' مفتیوں اور قاضیوں کی خدمات سرانجام دینا ہے۔ جو لوگ اس سے آگے بڑھ کر ''دین کی خدمت'' کی ہمت اور حوصلہ رکھتے ہوں وہ علوم اسلامی یعنی تفسیر' حدیث' فقہ اور علم کلام کو اپنی جولانگاہ بنائیں یا اگر اس کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو عوام کو وعظ و نصیحت اور تعلیم و تلقین کے ذریعے محبت الٰہی' اتباعِ رسول ﷺ اور ترجیح آخرت کی ''دعوت'' دیں اور ''تذکیر'' کا فریضہ ادا کرتے رہیں ــــ اور جو اس سے بھی زیادہ ہمت اور عزیمت کے مالک ہوں وہ تزکیہ نفس اور سلوک کے مراحل خود بھی طے کریں اور دوسروں کو بھی کرائیں اور اس مقصد کے لیے خانقاہیں آباد کر کے بیٹھ رہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا! رہی سیاست اور حکومت تو یہ ''دنیاداروں'' کا کام ہے' اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ''نظام'' کو بدلنے کی کوشش تو ''خروج'' اور بغاوت ہے' جو کفر اور ارتداد سے بس کچھ ہی کم تر ہے!

اس تصور کے تحت ایک جانب:

> ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
> ہوس کی امیری' ہوس کی وزیری

کے مطابق سلاطین و امراء اور منصب داروں اور سپہ سالاروں میں عیاشی وسفا کی اور ہوس ملک گیری بڑھتی چلی گئی' اور دوسری جانب مذہب صرف ایک ''پیشہ'' بن کر رہ گیا۔ اس کے

ضمن مین معاصرانہ چشمک اور پیشہ ورانہ رقابت اور پھر مدرسہ وخانقاہ کی تقسیم اوران کی باہمی منافرت کے باعث اخلاقی زوال کا عمل جس قدر جلد شروع ہوا اور جتنی تیزی سے بڑھا اس کا اندازہ طبقہ تبع تابعین سے تعلق رکھنے والے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کے اس شعر سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ:

ے وَمَا اَفْسَدَ الدِّیْنَ اِلّا الْمُلُوك

واحْبَارُ سَوءٍ و رُهبَانها

''اور نہیں تباہ کیا دین کو مگر بادشاہوں نے اور بُرے علماء اور اسی طرح کے پیروں نے''، جس کی بہترین ترجمانی کی ہے ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال نے اپنے اس شعر میں کہ:

ے باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری

اے کشتۂ ملائی و سلطانی و پیری!

یہ امر یقیناً بہت قابل غور ہے کہ اگر یہ مرض تبع تابعین کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا جس کا شمار ''خیر القرون'' میں ہوتا ہے تو ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا!'' ''میرے باغ سے میری بہار کا اندازہ کر لے''۔ کے مصداق بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مزید ایک ہزار برس کا عرصہ گزر جانے کے بعد نوبت کہاں تک پہنچ گئی ہو گی!

الغرض، اب سے لگ بھگ تین سو برس قبل اِدھر عالم اسلام میں تو دینی واخلاقی زوال اور قومی وسیاسی اختلال کی تاریکیاں ع ''زینہ زینہ اتر رہی تھی رات'' کے مانند شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھیں اور فی الجملہ وہ صورت پیدا ہو چکی تھی جس کا نقشہ علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ:

پیش ما یک عالم فرسودہ است

ملّت اندر خاکِ او آسودہ است!

''ہمارے سامنے ایک فرسودہ جہاں ہے جس کی خاک کے اندر مِلّت سو رہی ہے''۔

لیکن اُدھر وسطی یورپ میں ہسپانیہ کے ان مسلمانوں کے زیر اثر جو قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعے یورپ کو بیدار کر کے خود خواب خرگوش کے مزے لوٹنے کے باعث:

ع ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں!''

کی عبرتناک مثال بن چکے تھے، اصلاح مذہب اور احیاء العلوم کا غلغلہ بلند ہوا، جس کے نتیجے میں ایک جانب سائنس اور ٹیکنالوجی نے تیزی سے ترقی کرنی شروع کی اور دوسری جانب انسانی حقوق بالخصوص حریت کا تصور اجاگر ہونا شروع ہوا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے جو ''قوت کا دباؤ'' بڑھا اس نے مغربی استعمار کی صورت میں افریقہ اور ایشیا کا رخ کر لیا اور اب سے تقریباً ڈھائی سو برس قبل سوائے سلطنت عثمانیہ کے تقریباً پورا عالم اسلام اس کے زیر نگیں آ گیا۔ لیکن عجیب اور دلچسپ تضاد یہ ہے کہ گھر سے باہر بدترین نو آبادیاتی نظام کے قیام کے ساتھ ساتھ اہل یورپ نے خود اپنے گھر کے اندر انسانی حقوق کی بازیافت اور ظلم و جبر اور استبداد و استحصال کے خاتمے کی بھرپور جدوجہد شروع کر دی۔

اس انقلابی جدوجہد کا پہلا نتیجہ اب سے دو سو سال قبل انقلاب فرانس کی صورت میں ظاہر ہوا جس سے دنیا میں بادشاہت اور جاگیرداری کے خاتمے اور جمہوریت کی مختلف صورتوں کے رواج کا آغاز ہوا۔ لیکن چونکہ اس کے ساتھ ہی سائنسی ترقی کے نتیجے میں ''صنعتی انقلاب'' بھی رونما ہو چکا تھا لہٰذا اس جمہوریت نے عملی اعتبار سے ''سرمایہ داروں کی آمریت'' اور ع ''دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب'' ''ظلم کا دیو جمہوری لباس میں ناچ رہا ہے''۔ کی صورت اختیار کر لی، جس کا شدید ردّعمل اس صدی کے آغاز میں ''انقلاب روس'' کی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہ وہ وقت تھا جب برعظیم پاک و ہند کے اس منظر پر علامہ اقبال فکر اسلامی کی تجدید اور ''الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کے دعوے اور اسلامی انقلاب کی زوردار دعوت کے ساتھ نمودار ہوئے، جس کے پس منظر میں تصوفِ اسلامی اور الف ثانی کے مجدد شیخ احمد سرہندیؒ علوم اسلامی کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور جہاد اسلامی کے مجدد سید احمد بریلویؒ کی تین سو سالہ تجدیدی مساعی کے اثرات موجود تھے۔

فکر کے میدان میں علامہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک جانب سائنس کو ''روحِ قرآن'' کا ظہور اور بروز اور دوسری جانب عدل اجتماعی کی ان تمام اعلیٰ اقدار کو جن کا شعور یورپ میں اجاگر ہوا تھا ''نورِ مصطفیٰ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مستعار قرار دے کر دین اور دنیا کے فرق، مذہب اور سیاست کی علیحدگی، اور مشرق و مغرب کے فاصلے کو آنِ واحد میں ختم کر کے رکھ دیا:

ے
ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یاز نورِ مصطفیٰ ﷺ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ ست!

''جہاں کہیں بھی تو جہانِ رنگ و بو دیکھتا ہے کہ اس کی خاک سے آرزو (بھلائی) پیدا ہوتی ہے۔ یا تو اس کو نورِ مصطفیٰ سے روشنی حاصل ہے یا ابھی تک نورِ مصطفیٰ کی تلاش میں ہے''۔

چنانچہ یہ اسی کا مظہر ہے کہ حضرت علامہ نے ''ری پبلکن طرز حکومت'' کو اسلام کی روح کے عین مطابق قرار دیا۔ اور یہ تو ان کی جرأتِ رندانہ اور شانِ قلندری کا نمایاں ترین مظہر ہے کہ انہوں نے ''مارکسزم + خدا = اسلام'' کا فارمولا پیش کر دیا۔ اس لیے کہ اس میں کیا شک ہے کہ خدا کی حاکمیت مطلقہ کی تابع جمہوریت اور اللہ کی ربوبیت عامہ کے تقاضوں کو پورا کرنے اور کفالت عامہ کی ضمانت دینے والے نظام ہی کا نام ''نظام خلافت'' ہے، جس کا قائم کرنا مسلمانوں کا فرض منصبی اور اسلامی انقلاب کا مقصود و مطلوب ہے!

مزید برآں علامہ اقبال نے ایک جانب ''ایمان'' کا رشتہ ارسطو کی منطق یا افلاطون کے عالم مثال کی بجائے اعلیٰ ریاضی اور جدید طبیعیات، فلکیات، حیاتیات اور نفسیات کے ساتھ قائم کرنے کی سعی مشکور کا آغاز کیا جس سے ''الٰہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید'' کی راہ ہموار ہوئی ـــــ اور دوسری جانب ''اسلام کا انقلابی فکر'' بھی مرتب اور مدوّن کر دیا اور انقلاب کے طریق اور منہج کی بھی اجمالی نشان دہی کر دی۔ تاہم ان موضوعات پر قدرے تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے۔

(ب) فکرِ مغرب اور تہذیب مغرب کی بالادستی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں فکر اقبال کے سفر کی داستان

☆ 1938ء میں علامہ اقبال کی وفات حسرتِ آیات کے بعد بھی فکر اقبال کی بالقوہ اطاعت کا ہے اثر تھا کہ اگلے 9 سالوں میں علامہ اقبال کے خواب کی مجسم تعبیر سامنے آ گئی۔ اس وقت تک ہر مسلمان یہی سمجھتا تھا کہ یہ علامہ اقبال و قائداعظم کا احسان ہے کہ جنوبی ایشیا کی مسلمان

اقلیت کو وطن مل گیا۔

☆ پاکستان بننے کے بعد بھی قائداعظم محمد علی جناح اور دوسرے اکابرین مسلم لیگ نے اس جذبے کو زندہ رکھا۔ جناب لیاقت علی خاں نے بطور وزیراعظم ذمہ داریاں سنبھالیں تو ـــــــ اگرچہ ملک کا رائج قانون مسلم لیگ کے ذمہ داران اور مسلم دینی زعماء کی کوتاہی کے سبب 1947ء سے پہلے ہی رائج کردیا گیا۔ اس لیے کہ کوئی اسلامی فقہی مدوّن قانون جو عصر حاضر کے موجود عدالتی نظام کے کام آسکے اس کا احساس ضرور تھا۔

☆ اس احساس کا مظہر اوّل یہ تھا کہ جدی پشتی مسلمانوں اور ان کی جماعتوں کے سربراہوں سمیت سب نوزائیدہ مسلم ریاست کے لیے مدوّن قانون اسلامی (CODIFIED ISLAMIC LAW) کی ضرورت سے بے خبر تھے۔ علامہ اقبال کی بیدار مغزی اور مستقبل بینی (VISION) کا اندزہ لگائیے (اور دل کرے تو برملا نہیں تو دل میں داد دیجیے) کہ وہ 1930ء سے پہلے بھی اور فوراً بعد اور شدت سے قانون اسلامی کی تدوین کے لیے فکرمند تھے۔

☆ اس وقت کی قیادت کو سلام ہے اور اس میں محمد علی جناح ہی پیش پیش تھے لہٰذا علامہ اقبال اور چودھری نیاز علی خان کے مشترکہ دوست (جنہیں مولانا مودودی سے پہلے چودھری نیاز علی خان ہی علامہ اقبال سے ملاقات کے لیے لائے تھے) ہماری مراد ہے جناب علامہ محمد اسد (نومسلم) کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا پاسپورٹ جاری کیا گیا۔ شہریت عطا کی گئی اور ایک محکمہ بنا کر اس کا سربراہ مقرر کیا گیا اس محکمہ کا نام تھا ISLAMIC RECONSTRUCTION۔

علامہ محمد اسد نے بخوشی یہ ذمہ داری سنبھالی مگر ایک سال کے بعد یہ محکمہ بند کردیا گیا۔ صاحب موصوف نے ایک کتاب لکھی ہے ROAD TO MECCA (1954)۔ اس کے آغاز میں ہی انہوں نے پاکستان میں اپنے محکمے کا حال درج کیا ہے۔ ہم یہاں اس حصے کو نقل کر رہے ہیں تاکہ قارئین خود بھی اس کا مطالعہ کرسکیں

At first they assumed that mine was the case of a European 'expert' employed by an Eastern government for a specified purpose, and that I had conveniently adapted myself to the ways of the nation which I was serving; but when my

activities at the United Nations made it obvious that I identified myself not merely 'functionally' but also emotionally and intellectually with the political and cultural aims of the Muslim world in general, they became somewhat perplexed. More and more people began to question me about my past experiences. They came to know that very early in my life I had started my career as a foreign correspondent for Continental newspapers and, after several years of extensive travels throughout the Middle East, had become a Muslim in 1926, that after my conversion to Islam, I lived for nearly six years in Arabia and enjoyed the friendship of King Ibn Saud; that after leaving Arabia I went to India and there met the great Muslim poet-philosopher and spiritual father of the Pakistan idea, Muhammad Iqbal. It was he who soon persuaded me to give up my plans of travelling to Eastern Turkestan, China and Indonesia and to remain in India to help elucidate the intellectual premises of the future Islamic state which was then hardly more than a dream in Iqbal's visionary mind. To me, as to Iqbal, this dream represented a way, indeed the only way, to a revival of all the dormant hopes of Islam, the creation of a political entity of people bound together not by common descent but by their common adherence to an ideology. For years, I devoted my self to this ideal, studying, writing and lecturing, and in time gained something of a reputation as an interpreter of Islamic law and culture. When Pakistan was established in 1947, I was called upon by its Government to organize and direct a Department of Islamic Reconstruction, which was to elaborate the ideological, Islamic concepts of statehood and community upon which the newly born political organization might draw. After two years of this extremely stimulating activity, I transferred to the Pakistan Foreign Service and was appointed Head of the Middle East Division in the Foreign Ministry, where I dedicated myself to strengthening the

ties between Pakistan and the rest of Muslim world; and in due course I found myself in Pakistan's Mission to the United Nations in New York.

☆ اس موقع قائداعظم محمد علی جناح کی جیب کے کھوٹے سکوں نے بھاگ دوڑ کر کے پاکستان کو حقیقی اسلامی جمہوری فلاحی ریاست بنانے کے راستے میں روڑے اٹکائے۔قائداعظم کی رحلت کے بعد علامہ محمد اسد کے کام میں مداخلت ڈالی گئی اور ایک سال بعد ہی یہ محکمہ بند کر دیا گیا اور اس محکمہ کا نام بدل کر IQBAL ACADEMY PAKISTAN کر کے کمزور اور غیر مؤثر ادارہ بنا دیا گیا۔ یاد رہے کہ قائداعظم کی جیب کے کھوٹے سکوں کی حقیقت یہ تھی کہ 1946ء کے انتخابات کے بعد پنجاب کی حکومت انگریز بہادر نے سازش کے تحت اکثریتی پارٹی مسلم لیگ کو دینے کی بجائے یونینسٹ پارٹی (مسلمان غداروں کی پارٹی کو ہندوؤں سکھوں کے ساتھ مل کر حکومت بنانے کا موقع دیا جو چل نہ سکی) مارچ 1947ء میں حکومت ختم ہوگئی۔اس وقت یہ حکومت کے وفادار مسلمان طبقے نے اپنے آقاؤں کے خلاف رونا رویا کہ آپ سے وفاداری کا ہمیں کیا صلہ ملا اب پاکستان بن رہا ہے اور یہ مسلمان ہمیں غدار سمجھتے ہیں تو ہماری تو زندگی برباد ہو جائے گی۔ غالباً انگریز آقاؤں نے مشورہ دیا کہ تم جلدی سے مسلم لیگ میں شامل ہو جاؤ۔ چنانچہ بہت سے لوگ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے یہ وہ طبقہ تھا جس نے مسلم لیگ میں شمولیت کسی مثبت جذبہ کے ساتھ نہیں بلکہ مفادات کے تحفظ کے لیے کی تھی۔

☆ اسی طبقے نے آتے ہی پاکستان بننے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی قیامِ پاکستان کے مقاصد کے خلاف کام کیا بلکہ اپنے سابقہ آقاؤں کے مفاد اور اپنے مفادات کو مقدم رکھا۔علامہ اسد کی کوششوں پر پانی پھیر دیا۔موصوف کو UNO بھیج دیا اور اس کے محکمہ کی بساط لپیٹ دی ایک غیر مؤثر معمولی ادارہ اقبال اکیڈمی پاکستان قائم کر دیا گیا جس کو بعد میں آئینی بنا دیا گیا۔

3

بیسویں صدی میں پاکستان کے قیام کے علاوہ عالم اسلام میں 3 اسلامی سلطنتوں کا قیام

3 بیسویں صدی میں پاکستان کے قیام کے علاوہ عالم اسلام میں 3 اسلامی حکومتوں کا قیام

بیسویں صدی عیسوی (یا اسلامی کیلنڈر کے لحاظ سے چودھویں صدی 1301ھ یا 1400ھ یعنی 1882ء تا 1979ء) مغربی تہذیب کے لحاظ سے بھی، نیز مسلمانوں کے مستقبل کے لحاظ سے بھی بہت اہم صدی ہے۔ اس میں عالمی سیاسی حالات میں ہلچل مچی رہی اور واقعات کی تیزی واقعتاً ایسی تھی کہ جیسے تسبیح کا دھاگہ ٹوٹ جائے تو اس کے دانے گرتے ہیں اور یہ تشبیہ ایک فرمانِ رسالت ﷺ میں آئی ہے۔

اس صدی کے آغاز (یعنی ابتدائی عشروں) میں برطانوی منحوس سامراج، جس کا سرخیل برطانیہ ہی تھا اور اس کے پس پردہ صہیونی بنی اسرائیل کا بگڑا ہوا طبقہ تھا (اور اب بھی ہے) ....۔ پہلی جنگ عظیم (1914ء تا 1918ء) ایک سوچی سمجھی اور ENGINEERED جنگ تھی۔ سلطنت عثمانیہ 1750ء کے قریب پورے براعظم افریقہ، مشرق وسطیٰ، افغانستان، جنوبی ایشیا، کاشغر تک روسی علاقہ جات، آدھا یورپ بشمول جرمنی اور فرانس کے کچھ علاقہ جات سمیت بہت وسیع تھی۔ جسے صہیونی ذہن روس اور برطانیہ نے بانٹ کر ملکوں کو فتح کرنا شروع کر دیا، بالآخر پہلی جنگ عظیم میں جرمنی جو محل وقوع کے اعتبار سے مسلمانوں کا صدیوں سے پرامن پڑوسی تھا اور تجارت کا رابطہ رکھتا تھا اس لیے پہلی جنگ کے بہت بعد تک مشرقِ وسطیٰ میں جرمنی کا ساختہ سامان از قسم کموڈ فلش، گھریلو آلات، ریڈیو، آڈیو پلیئر لالٹین وغیرہ بکتے تھے۔ برطانیہ نے جرمنی کے

خلاف جنگ چھیڑی اور فرانس وغیرہ کو ساتھ ملالیا۔ سلطنت کے علاقہ جات پر برطانیہ کی للچائی نظریں تھیں بالخصوص مشرقِ وسطیٰ، سعودی عرب اور فلسطین جو سلطنت عثمانیہ کے پاس تھا سلطنت عثمانیہ نے جرمنی سے اتحاد کرلیا۔ جرمنی کو شکست سے دو چار کر دیا گیا نتیجتاً سلطنت عثمانیہ بھی ختم ہوگئی اور تاوانِ جنگ کے طور پر اس کے اثاثے ضبط اور علاقے تقسیم کر دیے گئے۔

حدیث پاک ﷺ میں آیا ہے کہ قربِ قیامت میں جنگیں ہوں گی جس میں دونوں طرف ایک ہی فریق ہوگا۔ بظاہر سمجھ نہیں آتا مگر برطانیہ کے پیچھے بھی یہودی سرمایہ دار ساہوکار تھے اور جرمنی کے پیچھے بھی۔ کوئی جیتے شرائط صلح یہود کی تھیں کہ فلسطین میں یہودیوں کو آباد ہونے کا موقع دیا جائے چانچہ ایسا ہی ہوا اور 1917ء میں فلسطین پر برطانوی قبضے پر برطانوی وزیر خارجہ نے بالفور ڈکلریشن کے ذریعے فلسطین میں یہودیوں کو اراضی خریدنے اور آباد ہونے کا پروانہ جاری کر دیا۔

اس جنگ کے خاتمہ 1918ء تک خلافت ختم کر دی گئی اور کئی مراحل سے گذر کر 4 مارچ 1923ء کو خلیفہ اور خلافت ختم، مغربی جمہوریت رائج، اسلامی قانون ختم اور (منحوس) رومن لاء کا نفاذ ہوگیا۔ اس کے بعد امن ہوا تو مشرق وسطیٰ سمیت سعودی عرب کا نقشہ بالکل مختلف تھا۔

سعودی عرب میں آلِ سعود کی حکومت

فکر شیخ محمد بن عبدالوہاب (1924ء تا حال)

سعودی عرب میں اٹھارھویں صدی عیسوی سے مشرقی علاقے میں آل سعود اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کے مابین معاہدے کے تحت اشتراکِ عمل چلا آ رہا تھا۔ اقتدار کبھی بڑھ جاتا تھا کبھی سکڑ جاتا تھا اس لیے کہ پہلے اصلاً حاکم سلطنت عثمانیہ تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد تیسری دہائی میں ایک معاہدے کے بعد آلِ سعود کو ریاض میں اقتدار ملا جو پھیل کر مکہ اور مدینہ تک پہنچ گیا۔ اس حکومت میں آج بھی دو صدیاں پہلے کا معاہد کارفرما ہے۔ مذہبی معاملات آلِ شیخ کے پاس ہیں اور اقتدار آلِ سعود کے پاس ہے۔ دولت کی ریل پیل سے سعودی عرب کا نقشہ ہی بدل گیا ہے اس حکومت کا سرکاری نام "المملكة السعودية العربية" ہے۔ خاندانی بادشاہت ہے۔ آج کا

سعودی عرب 50-60 سال پہلے کے سعودی عرب سے تقابل کریں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔

ب ایران میں اسلامی حکومت کا قیام

(1979ء تا حال)

عالم اسلام کی ایک تقسیم مسلمانوں کے درمیان قرونِ اولیٰ سے موجود ہے ایک سنی اسلام اور ایک شیعہ اسلام۔ مسلمان آپس میں تو اس کو برداشت کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کی کتابیں پڑھتے ہیں درس نظامی کی کئی کتابیں شیعہ مسلک کے لوگوں کی تحریر کردہ ہیں۔ صحاحِ ستہ میں کئی راوی شیعہ مسلک کے ہیں۔ کئی تفاسیر بھی شیعہ مسلک کے اہل قلم کی ہیں جو متداول ہیں۔ تاریخ میں بھی کئی نامور نام اہلسنّت کے ساتھ ساتھ اس طبقے سے بھی ہیں۔

صہیونیت بھی اس تقسیم کو جانتی ہے بلکہ اس کو EXPLOIT کرتی ہے۔ ایران سے 1900ء کے بعد کے حالات میں برطانوی عمل دخل زیادہ ہوگیا اور بالاخر پہلوی خاندان برسر اقتدار آ گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کا عمل دخل سیاست میں بڑھا تو ایران کا بادشاہ آریہ مہر رضا شاہ پہلوی امریکہ کا مُہرہ بن گیا مگر یہودی ذہن نے کیا سوچا اپنے ہی مہرے کو بدلنے کا پروگرام بنالیا۔ 1978ء۔1979ء میں ملک گیر ہنگامے ہوئے اور مذہبی بنیاد پر شاہ کے خلاف بغاوت ہوگئی شاہ معزول ہوگیا اور امام خمینی جو فرانس میں جلاوطن تھے ان کے ورود کے ساتھ ملک میں انقلاب آ گیا۔ اس تبدیلی کے بعد ایران کا سرکاری نام 'اسلامی جمہوریہ ایران' سامنے آیا (یاد رہے کہ پاکستان 1947ء میں بنا تھا اور اس کا سرکاری نام اسلامی جمہوریہ پاکستان اس وقت سے معروف تھا)۔ اس کے بعد ایران میں نیچے سے اوپر تک ہر سطح پر بہت تبدیلیاں آئیں لیکن شیعہ مسلک کے زعماء دنیا کی سنی اکثریت کو مطمئن نہ کر سکے اس کے باوجود شروع میں اس انقلاب کی حمایت میں کئی ممالک پیش پیش تھے مگر ایران کے .... کے بعد محسوس ہوا کہ صرف شاہ کو گرانا مقصود تھا۔ بہت جزوی تبدیلی آئی ہے۔ بہر حال اسلامی جمہوریہ ایران شاہ کے ایران سے کہیں بہتر ہے۔

ج　　افغان طالبان کی حکومت

(1996ء تا 2001ء اور مابعد)

اسی عرصے میں روس (USSR) نے گرم پانیوں تک رسائی کے لیے افغانستان پر حملہ کردیا۔ افغان اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے 1979ء سے 1990ء تک دس سال جنگ رہی پاکستان بھی اس جنگ سے بہت متأثر ہوا تقریباً 40 لاکھ افغان مسلمان مہاجرین پاکستان کے مہمان رہے (دوسرے ممالک میں بھی افغان مسلمان ہجرت کر گئے بالآخر افغان مسلمانوں کے جذبہ حریت نے فتح پائی اور 1990ء میں USSR تحلیل ہو کر 70 ریاستیں برآمد ہوئیں جو اکثر مسلمان تھی انیسویں صدی میں سلطنت عثمانیہ سے چھینی گئی تھیں۔ اب روس ایک ریاست ہے USSR کا نام دنیا سے ختم ہو گیا۔

اس جنگ میں کئی افغان گروہوں نے حصہ لیا۔ روس کے خاتمے کے بعد خانہ جنگی ہوئی اور جس طبقے نے فتح پائی وہ افغان طالبان کہلائے اور انہوں نے 1996ء میں افغانستان میں 'اسلامی امارت افغانستان' کے نام سے حکومت بنائی جسے پاکستان، امریکہ، سعودی عرب سمیت دنیا کے کئی ممالک میں تسلیم کر لیا گیا۔

2001ء میں امریکہ نے اس حکومت کے خلاف سازش کر کے حملہ کر دیا اور افغانستان کے حکمران افغان طالبان نے پسپائی اختیار کر کے گوریلا جنگ کا اعلان کر دیا اب وہ 18 سال بعد افغانستان کے 80% علاقے پر قابض ہیں اور کئی سال سے امریکہ سے مذاکرات ہو رہے ہیں افغان طالبان کہتے ہیں کہ امریکہ افغانستان سے نکل جائے ہم افغان بھائی خود مل بیٹھ کر فیصلے کر لیں گے مگر امریکہ شکست پر شکست کھا کر بھی 'باعزت' طور پر نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ مستقبل قریب میں اس خطے افغانستان میں دوبارہ افغان طالبان کی اسلامی حکومت قائم ہوگی جو تا دیر قائم رہے گی (ان شاء اللہ)۔

تجسیمِ فکرِ اقبال

1

منہجِ انقلابِ نبوی ﷺ

کے مراحل میں

معجزانہ طور پر

(BY DIVINE INTERVENTION)

قیامِ پاکستان

معجزانہ طور پر
(BY DIVINE INTERVENTION)
1
قیامِ پاکستان

قیامِ پاکستان بلاشبہ نہ صرف تاریخ اسلام کا ایک محیر العقول واقعہ ہے بلکہ تاریخ انسانی میں لاثانی واقعہ ہے اور عصر حاضر، بیسویں صدی میں صہیونی مغربی عالمی استعمار کے اقتدار کے وقت CLIMAX (عین نصف النہار پر) دنیا کی پانچویں بڑی آبادی والا ملک ایک غلام ابن غلام ابن غلام قوم کی جمہوری جدوجہد سے (ایک آتش نوا قرآنی تعلیمات کو بیان کرنے والے شاعر کی شاعری سے) آزاد ہو جانا کسی جدید فلسفے اور انقلابی جدوجہد کے پیمانوں میں FIT نہیں بیٹھتا۔ ___ ماسوائے اس کے کہ تسلیم کیا جائے کہ اس کائنات کا ایک خالق و ربّ ہے جو فاطر ارض و سماء بھی ہے اور تخلیق انسانی کا باعث بھی۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا بھیجنے والا بھی نیز رسولوں علیہم السلام کو مبعوث فرمانے والا بھی اور تکمیل دین و اِتمامِ ہدایت کا سرچشمہ بھی۔ دنیا میں گزرنے والے حالات و واقعات کا جاننے والا بھی، ان میں مداخلت کر کے اپنی منشا و مشیت کے مطابق چلانے والا بھی اور DOWN TO GROUND فاعل حقیقی اور موثر حقیقی بھی اور عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر بھی ایسا خالق و مالک و رب کہ چاہے تو اسباب دھرے رہ جائیں اور نتیجہ نہ نکلے اور چاہے تو اسباب کے بغیر اپنی WILL اور چاہت کے مطابق نتیجہ نکال کر دکھا دے۔ کسی کے ذریعے کام کرا کے اس کو عزت بخش دے اور کسی کے ذریعے مطلوبہ نتائج نہ نکلنے پر ناکامی کا دھبّہ لگا دے مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَ مَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ ۔ ایسا قادرِ مطلق کہ اُف کی مجال نہیں۔ بشرطیکہ جذبہ خالص ہو۔ اُمنگیں اس کی

ہدایت، رہنمائی اور قرآن مجید کے بیانیہ کے مطابق (IN LINE) ہوں اور انسان اس کا وفادار ہو۔

جیسے حضرت محمد ﷺ کی تشریف آوری پر اسلام عملاً انفرادی و اجتماعی زندگی پر غالب ہوا اور حقیقی اور جامع ترین انقلاب آ گیا کہ عرب کے شتر بانوں کی زندگیوں میں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے کہ کونسی چیز نہیں بدلی۔ بعدازاں عام انسانوں کے ہاتھوں سے خلافت راشدہ کا انسان دوست، اخلاق دوست، خود شناس اور خدا شناس انتہائی اعلیٰ معیارات کی انسانی اقدار کا احیاء و رواج کہ آج تک دوبارہ اس کی مثال نہ ملے اور یہ حسین دور باضمیر انسانوں کے لیے اور ہر دور کے مرد و زن کے لیے ایک 'خواب' بن کر رہ جائے ایسا منظر کہ ایک دفعہ دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی خواہش ہے۔

بعینہٖ اسی طرح حضرت محمد ﷺ کے دور نبوت و رسالت کے آخری حصے میں قیام پاکستان کا معاملہ بھی بڑا خاص ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا (متن ضمیمہ جات میں دیکھیں) کہ باقی رسولوں اور ان کی امتوں کو اللہ تعالیٰ ایک ایک ہزار سال کا عرصہ دیا، مجھے امید ہے کہ میری امت کو (جو آخری امت ہے) نصف یوم یعنی پانچ صدیاں اضافی عطا فرمائے گا۔

(ا) قیامِ پاکستان

اوپر درج حدیث مبارکہ کے متن کے مطابق اس اُمت مسلمہ اور جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو بالخصوص نصف یوم اضافی ملا ہے اور شاید (اللہ کرے ایسا ہی ہو) اسی نصف یوم کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں نظریۂ خودی (جو نظریہ توحید ہے)، اس کی اشاعت پر مسلمانوں کا اکٹھے ہو جانا (چار صدیوں کے مجددین) کا جنوبی ایشیا میں تشریف لانا، حضرت مجدد الف ثانی سے شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ، تحریک شہیدین کے بانیان، جنگ آزادی کے ہیرو، شیخ الہند محمود حسن، علامہ اقبال، مولانا الیاس وغیرہم کی مساعی کے نتیجے میں مسلمانوں کی بیداری اور اس امت میں سے ایک حصے کا دوقومی نظریہ پر کھڑے جانا ہی قیام پاکستان (حصول ریاست وحکومت) کا ذریعہ بن جانا اللہ تعالیٰ کی خصوصی منشا (DIVINE INTERVENTION) اور معجزانہ شان کا حامل ہونا ہے۔

(ب) اس طرح مسلمانوں کی ایک علیحدہ ریاست کے حصول اور اس کو چلانے کی اہلیت کے

فقدان کے پیش نظر پاکستان اور مسلمانوں کی مثال ایک PREMATURE DELIVERY سے مشابہ ہے اور مسلمان زعمائے ملت اور دین کا درد رکھنے والے عوام کا امتحان ہے کہ اس ملک خداداد کی حفاظت وصیانت و بقاواستحکام و پھیلاؤ کے لیے کیا قدام کرتے ہیں۔

ب۔ معجزانہ طور پر حصول ریاست وحکومت

اور ہماری ذمہ داریاں

☆ ذرا ٹھنڈے دل سے پاکستان کے موجودہ حالات پر غور کرنے تجزیہ کرنے اور نتائج نکال کر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سمت میں آگے بڑھنے سے پہلے اپنے غور وفکر کے لیے جو نکات سامنے رکھنے ضروری ہیں وہ درج ذیل ہیں:۔

(i) ہمارے آقا حضرت محمد ﷺ کی سیرت میں ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے اس میں مسلمانوں میں کوئی دورائے نہیں ہیں آپ ﷺ نے بعثت کے بعد اہل ایمان کی 13 سال نگرانی فرمائی اور تربیت کی۔ اس کے بعد ہجرت کا مرحلہ آ گیا۔ ہجرت کا واقعہ ہوا تو ایک طرح سے سیدنا محمد ﷺ نے مدینے میں تمام مسلمانوں کو جمع فرمالیا مقامی قبائل میں دو قبائل (اوس اور خزرج) مسلمان ہو گئے تھے جبکہ تین یہودی قبائل اہل کتاب ہونے، آپ ﷺ کو پہچاننے اور چھ صدیوں کے انتظار کے باوجود دولت ایمان سے بہرور نہ ہوسکے۔ پھر مہاجرین صحابہ تھے جو مکہ سے آئے تھے اور ہر طرح سے آپ ﷺ کے جانثار اور ساتھی تھے۔

آپ ﷺ نے میثاقِ مدینہ کے ذریعے ایک عہد و پیمان لیا اور تمام چھ انسانی قبائل یا اکائیاں اس میں شامل ہوئیں اور آپ ﷺ کو ایک بے تاج بادشاہ (حکمران) کا درجہ حاصل ہو گیا۔

(ii) مکہ اور اہل مکہ جو تمام عرب کے پیشوا تھے اور آپ ﷺ کو مکہ سے نکالا تھا نتیجتاً وہ آپ کی زندگی اور آپ کے مشن کے سخت مخالف ہی نہیں آپ کے دشمن تھے۔

(iii) آپ ﷺ کی سیرت کو دیکھیں تو اس مرحلہ پر آپؐ کے مخالفین اور اہل ایمان کے درمیان تصادم کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو بدر سے شروع ہو کر فتح مکہ پر منتج ہوا اور اہل مکہ کی کمر ٹوٹ گئی اسلام غالب ہو گیا اور یوں پورے عرب پر اسلام کا غلبہ واقع ہو گیا۔ اسلام اپنے احکام کی

تنفیذ کے لیے پوری زندگی کے معاملات پر چھا جانے کے لیے ایک ریاست کا متقاضی ہے جو فتح مکہ سے آپ ﷺ کے قدموں میں آ گئی۔ آپ ﷺ نے اور آپ کے تربیت یافتہ قریبی ساتھیوں نے خلافت راشدہ کے عنوان پر قرآن مجید کے احکام کی عملی شکل دنیا کے سامنے رکھی اور اسلام کے دنیاوی پہلو ____ نظام حیات کے سارے گوشے واضح ہو گئے جس میں دنیاوی اعتبار سے امن، سکون، شریعت کی عملداری، شرم، حیاء، عفت، عصمت، عزت، احترام باہمی، پردہ الغرض انسانی داعیات میں انسانی فلاح و بہبود کی سارے دنیاوی شکلیں بھی موجود تھیں اور مرنے کے بعد قبر، حشر، حساب کتاب اور جنت کی کامیابی کے احکانات کے وعدے بھی تھے۔

لیکن ملک پاکستان کا 1930ء میں مطالبے، 1940ء میں قرارداد پاکستان اور 14 اگست 1947ء کو قیام پاکستان سے یکا یک ایک نیا میدان مسلمانانِ جنوبی ایشیا کے سامنے تھا جس میں:

(i) ملکی خزانے کا خالی ہونا، بھارت کا وسائل کی تقسیم میں بد دیانتی، فوج، فوجی ساز وں سامان، خزانہ میں پاکستان کے حصے کو دبا لینا، مہاجرین کی آمد کا گمبھیر مسئلہ، نئے ملک کے وسائل، ملک کے لیے قوانین شریعت کا موجود نہ ہونا، علامہ محمد اسد کی سربراہی میں ادارہ بننا اور ناکام کر دیا جانا، قائداعظم کی وفات اور بھارت جیسا دشمن کا پڑوسی ہونا، مسلمانوں کی طاقت برصغیر میں پہلے ہی 25% تھی جس میں سے علماء فضلاء کا بھارت میں رہ جانا اور پاکستان کے قیام میں شامل نہ ہونا ____ ایسے ہمالیہ جیسے مسائل تھے جس کا آج ہمیں اندازہ نہیں۔

(ii) ان حالات میں پاکستان (مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان) کا رُبع صدی زندہ رہنا ہمارے لیے موقع تھا مگر اپنوں اور پرایوں سے گلے شکوے اپنی جگہ ____ عملاً پاکستان میں نفاذ اسلام اور دور ملوکیت سے پہلے کے اسلام کا نقشہ قائم نہ ہوسکا اور آج قیام پاکستان کو (2019-1947) 72 سال گزر گئے ابھی ہنوز روز اوّل کی سی کیفیت ہے اور قابل افسوس بات یہ ہے کہ مسائل کے حل کے لیے دور دور تک بظاہر کوئی امید افزا صورت نظر نہیں آ رہی۔

(iii) قوم کی ذہنی تربیت کے ساتھ اسلامی تربیت ایک مسئلہ ہے، مغربی میڈیا نے ابلیسی ایجنڈے کے تحت اسلام سے ایک عام بیزاری کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ کھاؤ کماؤ عیش کرو کا ماحول پیدا کر کے سیکولر ازم اور لبرل ازم کے نظریات اب عام ہیں۔ پاکستان اپنے قیام کے

مقاصد سے دور ہو کر پہلے دولخت ہو چکا (1971ء میں) اب ابلیسی ایوانوں میں کیا مشورے ہیں وہ ماحول کی ہولنا کی سے ظاہر ہیں۔ بھارت جیسا ازلی دشمن ہی ہم پر ایک کاری وار کرنے کے بہانے ڈھونڈ ھ رہا ہے۔

(iv) عالمی سطح پر یورپی ممالک اور امریکہ ہمارے خلاف ہیں۔ پھر امریکہ کے پیچھے صیہونیت چھپی ہوئی ہے۔ اسرائیل ملک ہے جو ساری دنیا پر قابض ہونے کے لیے اپنے صد سالہ منصوبے کے آخری PHASE میں داخل ہو چکا ہے۔

(v) ملک پاکستان دنیا میں (واقعی) ایک منفرد ملک ہے جس سے

☆ اس کے سارے پڑوسی ممالک ناراض ہیں۔

☆ تمام ترقی یافتہ ممالک ناراض ہیں بشمول مسلمان ممالک کے

☆ جس سے دنیا کی عالمی سطح کی طاقتیں ناراض ہیں۔

☆ جس سے UNO ناراض ہے۔

☆ جس سے اس کے حکمران اور سابقہ حکمران بھی ناراض ہیں

☆ جس سے اس کے عوام ناراض ہیں۔

☆ جس کے معاشی حالات کی ابتری سے اس کے قرض خواہ IMF, W.B اور دیگر مالیاتی ادارے ناراض ہیں

الغرض روئے ارضی پر اس کا کوئی حقیقی دوست نہیں پھر بھی یہ ملک چل رہا ہے۔ حیرت ہے۔

حقیقتاً اس ملک کو معجزانہ طور پر بنانے والی ہستی 'اللہ تعالیٰ' ہی اس ملک کو چلا رہے ہیں اور زندہ رکھے ہوئے ہیں کہ اس ملک سے آئندہ آنے والے دور میں بڑا کام لینا ہے لہٰذا ____ آیئے سب مسلمانان پاکستان مل کر کسی مشترکہ بات پر آ جائیں اور ماضی کو بھلا کر آئندہ کا سفر شروع کر دیں شاید اللہ تعالیٰ ہماری غلطیوں، نادانیوں، کوتاہیوں سے صرف نظر فرما کر ہمیں منزلِ مراد سے ہمکنار فرما ہی دیں۔ وما ذالك على الله بعزيز

2

پس چہ باید کرد

WHAT TO DO?

پس چہ باید کرد ؟

WHAT TO DO?

الحمد للہ کہ آج بھی مسلمانانِ پاکستان میں ایک معتد بہ تعداد کو ماضی کے حالات کا ایک دھندلا سا تصور ذہن میں باقی ہے اس ملک کے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر میں قیامِ پاکستان کے مقاصد اس کے بانیان ـــــ علامہ اقبال اور قائداعظم محمد علی جناح اور آج تک کی غلطیاں یاد بھی ہیں اور ان پر نادم بھی ہیں۔ اس صورت حال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ملک کی دینی جماعتیں، رجالِ دین، رہنمایانِ قوم اور عام باعمل صالح مسلمان غور کریں کہ اب پاکستان کے مسائل کا حل کیا ہے؟

صاف ظاہر ہے کہ اگر آج ہم اس بات سے باہمی گفتگو کا آغاز کریں کہ پاکستان میں موجودہ حالات کا ذمہ دار کون ہے اس پکڑ وتو ہم ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے اور آپس میں دست بگریبان ہو جائیں گے اور خوشنما مستقبل کا خواب ذہن سے محو ہو جائے گا اور بہت سارا وقت پھر ضائع ہو جائے گا۔ نامعلوم پھر کتنے عرصے بعد ہم دوبارہ اس ایجنڈے پر انسانوں کی طرح مثبت اور قابل عمل سوچ کے ساتھ جمع ہوں گے۔

آیئے مشترکات کی طرف کہ مجوّز پاکستان، دوقومی نظریہ کوآخری اور حتمی شکل دے کر پاکستان کے جواز کے لیے بنیاد قرار دینے والے اور 1930ء میں تجویز دینے سے پہلے اور بعد میں اس کوعملی جامہ پہنانے کے لیے کوشاں شخص علامہ اقبال ہیں پھرانہیں ہی اس کی فکر دامن گیر ہوئی اور مسلم لیگ کی قیادت کے لیے قائداعظم محمد علی جناح کولندن سے واپسی پر آمادہ کیا۔ پھراس مردِمیدان نے علامہ اقبال کواپنا 'مرشد' رہنما اور محسن مان کر حصولِ پاکستان کی جدوجہد کا آغاز کیا اور چند سالوں میں ملک کے حصول کوممکن بنادیا۔

علامہ اقبال کی شخصیت قدیم وجدید اور تمام مکاتب فکر کے رجال دین کے نزدیک مفکر پاکستان اور اس کے لیے ابتدائی کام کرنے والے کی حیثیت سے متفق علیہ ہے۔

ملک ایران میں پاکستان کی طرح (یا اس سے بھی بڑھ کر) اقبال لاہوری کے نام ان کو پہچانا جاتا ہے اور حالیہ انقلابِ ایران کے لیے ان کے فکر سے رہنمائی لینے کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں بھی ان کے مقام ومرتبہ سے جزوی اختلاف کے باوصف قائداعظم کے دور کی مسلم لیگ سے وابستہ افراد میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی کہ علامہ اقبال ہی محور ومفکر پاکستان ہیں۔ اگر آج ہم آئندہ پاکستان کے بہتر مستقبل کے لیے کسی متفقہ ایجنڈے پر جمع ہوسکیں تو وہ اس کے علاوہ ممکن نہیں ہیں کہ علامہ اقبال ہی کے ذہن کے مطابق استحکامِ پاکستان کی بات کوآگے بڑھانے کی کوشش کی جائے اور ایک غیر جانبدار فورم ہو جہاں باہمی اختلافات طے کر کے آگے بڑھتے رہنے کا سفر جاری ہے۔

3

امکانات

3 امکانات

ہمارے نزدیک اس وقت ملک پاکستان کو موجودہ معاشی، سیاسی، انتظامی، قومی، لسانی، نظریاتی مسائل کے بحران سے نکالنے کے لیے مجوز و مفکر پاکستان کی طرف ہی لوٹنا ہوگا۔ اس مقصد کے لیے علامہ اقبال نے 1930ء کے خطبہ الٰہ آباد سے ماقبل اور مابعد کوششیں فرمائی تھیں کہ کسی طرح ایسی اسلامی فقہ ترتیب پا جائے جو ملک کے قیام کے وقت ہی نافذ کر دی جائے مگر بوجوہ وہ کام نہ ہوسکا۔

آج 72 سال بعد ہم 1947ء سے بہت مشکل صورت حال سے دوچار ہیں تاہم اب بھی ہم ملک میں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریتی فقہ مرتب کرلیں اس شرط کے ساتھ کہ دوسرے فقہی مسائل کا جہاں جہاں اختلاف ہو (وہ ابھی طے کرنے کی بجائے) اس کے لیے ایک عدالتی فورم سپریم کورٹ لیول پر ایک شریعت ایپلٹ بینچ قائم ہو جو بااختیار ہو اور مختلف فیہ مسائل میں علماء کے دلائل سن کر نافذ شدہ فقہ کی کسی دفعہ یا حصے کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کر کے قانون ساز اسمبلی کے حوالے کرے اور قانون ساز اس کو معینہ مدت میں مشورہ سے قانون پاس کر کے ملکی قانون کا حصہ بنا دے۔

(ا) فقہ اسلامی کا کینوس (CANVASS)

پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریتی فقہ کے نفاذ کی جب تجویز علامہ اقبال کے ذہن میں تھی یا آج ہم دہرا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ برخلاف مغربی رومن لاء (دیوانی اور فوجداری

قوانین)اسلامی فقہ حنفی میں

☆ دیوانی مقدمات کے ضابطے بھی ہیں۔

☆ فوجداری مقدمات کے ضابطے بھی ہیں۔

☆ اس میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کے طریق کار (PROCEDURES) بھی ہیں جو بہت اہم ہیں

☆ اس میں مالی معاملات (سود، جواء، سٹہ وغیرہ کے احکام) بھی اور مالیاتی حلال وحرام بھی ہیں۔

☆ اس میں کھانے پینے کی اشیاء میں حلال وحرام کے ضابطے بھی ہیں۔

☆ اس میں جدید دور کے CYBER CRIMES بھی آئیں گے۔

☆ اس میں آج کے بینکوں کے کھاتے اور انکے ذریعے لین دین کے ضابطے بھی آئیں گے۔

☆ اس میں عدالتوں کے ججوں کے اوصاف وشرائط بھی ہوں گی۔

☆ اس میں عدلیہ کے عملہ سے متعلق بھی احکام ہوں گے۔

☆ اس فقہ میں عدلیہ کے تربیتی اداروں کے لیے بھی ہدایات اور رہنما اصول ہوں گے۔

☆ اس فقہ میں فوج، بیوروکریسی، تفتیشی اداروں، پیرا ملٹری اداروں، پولیس وغیرہ کے تربیتی اداروں کے رہنما اصول اور کام کے دوران بھی رہنمائی کے لیے اسلامی اصولوں کا ذکر ہوگا۔

☆ اس فقہ میں انتخابات سے متعلق کمیشن کے بارے میں اسلامی ہدایات ہوں گی۔ انتخابی عملہ پولنگ ایجنٹ سامان کو جانے والے عملہ کی رہنمائی اور ذمہ داریوں کا تعین ہوگا۔

☆ اس فقہ میں یہ بھی طے ہوگا کہ جس قانوں ساز اسمبلی نے عدالتی حکم پر نئی قانون سازی کرنا ہے اس کے مقرر ممبران کی شرائط کیا ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

☆ ملکی نظامِ تعلیم اور اس کے تمام شعبے (از قسم سوشل سائنسز انجینئرنگ، میڈیکل ایروناٹکس وغیرہ) بھی اعلیٰ عدلیہ کے تحت آئیں گے جس کے تحت مختلف

کمیشن (الیکشن کمیشن کی طرح) جو براہ راست عدلیہ کی نگرانی میں ہوں اور عوامی شکایات ONLINE وصول کرکے ان کے ازالے کا دائمی حل جاری رہے گا۔ تاکہ دشمن اور اسلام دشمن عناصر کوئی راہ نہ پا سکیں۔

فکر اقبال کی روشنی میں ایسی فقہ تیار کی جائے (غیر سرکاری سطح پر ہو تو عوام اس کے نفاذ کے لیے جلد حرکت میں آسکتے ہیں سرکاری سطح پر پہلے ہی کام ہو چکا ہے۔ آئینی ادارہ اسلامی نظریاتی کونسل نے بہت کام کیا ہے مگر اس کام پر علماء کا کس حد تک اعتماد ہے وہ بھی اہم ہے اور اس کام کے نفاذ و قانون سازی کے لیے ضابطے اور طریق کار طے نہیں ہے لہٰذا یہ سارا کام الماریوں میں بند پڑا ہے۔ نتیجہ یہی ہے کہ چاہے غیر سرکاری سطح پر از سر نو کام ہو یا سرکاری سطح پر موجود کام کو اپنا کام سمجھ کر اس کے نفاذ کی کوشش کی جائے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک میں عوامی سطح پر 80% سے زیادہ عوام کی رائے پر مبنی فقہ کو ایک دفعہ نافذ کر دیا جائے اور اس میں ترامیم کے فورم طے کر لیے جائیں پھر ان تبدیلیوں کے قانون بننے کے طریق کار پر نیک نیتی سے عمل درآمد ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم حالیہ منحوس مغربی قانون اور اس کے دیوانی و فوجداری ضابطے (PROCEDURES) سے گلو خلاصی حاصل نہ کر لیں۔ فقہ حنفی اسلام سے باہر نہیں ہے (اختلاف ہو سکتا ہے) لیکن مغربی قانون سے ہزار درجے بہتر ہو گی۔

ب۔ اسلامی فقہ کے نفاذ کے ممکنہ راستے

پہلا راستہ: فقہ اسلامی تیار کر کے اس کے نفاذ کی زبردست تحریک

پرامن جمہوری مطالباتی تحریک (جیسے ختم نبوت ﷺ تحریک) جو مطالبہ کی منظوری تک مصروفِ عمل رہے۔ اس کے لیے اسلامی فقہ کی تیاری کے بعد مناسب موقع پر ملک بھر کی تمام دینی جماعتیں، جمعیتیں، ادارے اور اہم رجالِ دین اس کام میں حصہ لیں تاکہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

دوسرا راستہ: تبدیلی بذریعہ انتخابات

ملک میں جمہوری نظام ہے حکومتوں کی تبدیلی کے لیے باقاعدہ الیکشن ہوتے رہتے ہیں۔ کئی جماعتیں یہی منشور رکھتی ہیں کہ وہ اکثریت میں آکر ملکی قانون کو بدل دیں گی کیسے بدلیں

گی یہ ان کا دردسر ہے گذشتہ سات عشروں میں انتخابی سیاست کی جماعتیں اس راستے سے جدوجہد میں کس حد تک کامیاب ہیں یہ بات ذرا سا بھی پڑھا لکھا آدمی با آسانی سمجھ سکتا ہے کہ نتیجہ حوصلہ افزا بالکل بھی نہیں ہے۔

تیسرا راستہ: تبدیلی بذریعہ پرامن غیر مسلح احتجاجی تحریک

تیسرا ممکنہ طریقہ یہ ہے فقہ اسلامی کی تفصیلات طے کیے بغیر پرامن جمہوری اجتماعی تحریک ملک میں اسلامی قوانین کا نفاذ چاہیے ـــــ ایک زوردار تحریک چلے تحریک جب کامیاب ہوتو اس کے لیے بھی پہلے تیاری چاہیے کہ کرنا کیا ہے اور اقتدار میں آنے کے بعد اسلامی فقہ تیاری کے تمام مراحل سے گزرنا پڑے گا۔

ج۔ حاصل کلام

ہمارے نزدیک اقبال شناسی میں ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے حکمت اقبال کی بھرپور کماحقہ وضاحت کردی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ علامہ اقبال کے ماننے والوں، مداحوں، خوشہ چینوں اور علامہ اقبال سے متعلق اداروں جیسے اقبال اکیڈمی وغیرہ کے کارپردازوں کو آگے بڑھ کر حکومت پر مختلف انداز میں دباؤ ڈالنا چاہیے کہ اقبال کے نظریۂ خودی کے تحت تمام ملکی معاملات کو ازسرنو ترتیب دیا جائے تاکہ ملک خداداد پاکستان کو اپنے مقصد قیام سے ہمکنار کر دیا جائے اور مجوّز و مفکر پاکستان کو پاکستان کے اپنی منزل پر پہنچنے پر سکون میسر آسکے جس کے وہ مستحق ہیں، آمین۔

فَسَعْیًا ثُمَّ سَعْیًا ثُمَّ سَعْیًا
وَ مَا عِنْدِیْ سِوَا ذَاکَ الْمَقَالٗ
کوشش کرو، پھر کوشش کرو، پھر کوشش کرو
میرے پاس اس کے سوا کہنے کو اور کچھ نہیں ہے

4
سرزمین
مجدّدین امّت
(افغانستان تا برما)
کی مسلم بیداری کے
100 سال

اللہ تعالیٰ نے مغل بادشاہ اکبر کے مرتد ہونے اور سلطنت مغلیہ کے اسلام مخالف نظریات کے زیر اثر جانے کے خطرات سے نمٹنے کے لیے 1000ھ (1594ء) کے بعد مجدّدین اُمّت کا سلسلۃُ الذہب (سنہری سلسلہ) جنوبی ایشیا کے مقدر میں کر دیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہے آئندہ چار صدیاں مجددین امت جنوبی ایشیا میں آئے ہیں افغانستان سے برما تک کا یہ علاقہ مسلم اُمت کے شاندار مستقبل کی علامت بن گیا۔ چنانچہ برطانوی سامراج کے عین دورعروج میں علامہ اقبال جیسا نابغہ عصر انسان پیدا ہوگیا جس نے ایک طرف علی گڑھ کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان کا ذہنی رشتہ اسلام سے جوڑ دیا اور دوسری طرف اسلام کی تعلیمات کو عصر حاضر میں اعلیٰ علمی سطح پر پیش بھی کیا اور اسلام کے شاندار مستقبل کی نوید بھی سنائی مسلمانوں کے لیے آزاد وطن کے دوقومی نظریہ کی بنیاد پر حصول کا نعرہ لگایا اور مسلمانوں نے اسے ممکن بھی بنا دیا۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں علامہ اقبال کی نظم طلوعِ اسلام کے بعد کے عرصے میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے کیا کچھ حاصل کیا ہے وہ بھی بہت اہم ہے اور اس بیداری سے عالمی صہیونی استعمار کو بھی بہت سے DENT پڑ گئے ہیں وہ بھی بہت اہم ہیں۔ مختصر تذکرہ درج ہے:

(الف) قیام پاکستان 1947ء
سلطنت برطانیہ کا زوال

1930ء میں خطبہ الہ آباد میں پاکستان کے قیام کے مطالبہ کے جلد ہی بعد قائداعظم نے مسلم لیگ کو منظّم فرمایا۔ 1940ء میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی اور کئی مراحل سے گزر کر جمہوری انداز میں 14 اگست 1947ء کو (مطابق لیلتہ القدر 27 رمضان 1366ھ) پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔

قیامِ پاکستان سے جنوبی ایشیا میں برطانوی اقتدار کا سورج ڈوب گیا اور جلد ہی باقی برطانوی مقبوضات بھی آزاد ہو گئے عالمی برطانوی سامراج قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی زوال پذیر ہو کر بطور سپر پاور باقی نہ رہ سکا۔ اس کی جگہ امریکہ نے لے لی۔

(ب) USSR کی شکست 1990ء

جنوبی ایشیا کی مسلم بیداری کا اگلا معرکہ افغانستان اور پاکستان کے ذریعے برپا ہوا۔ USSR نے گرم پانیوں تک رسائی کے دیرینہ خواب کے پیش نظر افغانستان میں پہلے اپنے نظریات پھیلائے سوشلسٹ ذہن کے حکمران مسلط کر دیے اور پھر 1979ء میں افغانستان پر حملہ آور ہو کر قابض بھی ہو گیا۔ افغان قوم نے اس قبضہ کی مخالفت کی افغان مسلمان قریبی ملکوں میں ہجرت کر گئے اور USSR کے خلاف 'جہاد' شروع ہوا۔ بارہ سال کے معرکہ آرائی (جس میں پاکستان، اسلامی ممالک، امریکہ، UNO نے بھی حمایت کی) کے بعد USSR نے شکست کھائی۔ اس کے حمایت یافتہ حکمران قتل ہو گئے اور افغانستان پر غیر ملکی قبضہ ختم ہو گیا۔ بالآخر USSR اپنے گھر میں 1990ء میں تحلیل ہو کر 70 ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ جس میں اکثر مسلمان ریاستیں تھیں جو اب آزاد ہو گئی ہیں۔

(ج) پاکستان ایک ایٹمی طاقت 1998ء

جنوبی ایشیا میں واقع پاکستان ایک غیر ترقی یافتہ ملک نے خالصتاً اللہ تعالیٰ کی تائید سے مغربی طاقتوں کی رکاوٹوں کے باوجود مئی 1998ء میں ایٹمی دھماکہ کر کے اسلامی دنیا کی پہلی اور

عالمی سطح پر ساتویں یا آٹھویں طاقت کے طور پر اپنے آپ کو منوالیا۔

علامہ اقبال کا تجویز کردہ اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے خوابوں کی سرزمین پاکستان کے لیے یہ بہت بڑا اعزاز تھا بلکہ ہر پاکستانی کے لیے بھی اعزاز ہی تھا۔ اس ایٹمی طاقت کے حصول سے نہ صرف عالم اسلام کا سر بلند ہو گیا بلکہ پاکستان کا دفاع بھی مضبوط ہو گیا۔

د۔ USA کی افغانستان سے پسپائی، 2010ء کے بعد سے

جنوبی ایشیا میں شمال مغربی مسلم اکثریت کے علاقے اور افغانستان گذشتہ صدی میں عالمی طاقتوں کا قبرستان بن گیا۔ برطانیہ نے انیسویں صدی میں افغانستان پر چڑھائی کر کے ایک سبق سیکھا تھا۔ پھر USSR نے حملہ کر کے اس ملک پر قبضہ کرنا چاہا مگر ناکام رہا۔ برطانیہ کی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر غالباً 1982ء میں پاکستان آئی تھیں اور پشاور میں انہوں نے USSR کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ''ہم نے پچھلی صدی میں افغانستان میں ایک سبق سیکھا تھا اب USSR بھی جلد ہی یہ سبق سیکھے گا (کہ شکست سے دوچار ہوگا)''۔ USSR کے خاتمے کے بعد USA امریکہ نے پھر وہی غلطی کی کہ شاید میں کامیاب ہو جاؤں گا مگر افغان طالبان نے 2001ء سے حکومت چھوڑ کر غیر ملکی استعمار کا مقابلہ کیا اور دس سال بعد امریکہ بمع اتحادیوں (NATO) کے شکست پر شکست سے دوچار ہو رہا ہے اور اب باعزت واپسی کا راستہ بھی شاید مشکل سے ہی ملے۔

گویا جنوبی ایشیا میں افغانستان سے برما تک (جو کبھی برطانیہ کے زیر تسلط علاقہ تھا) کے مسلمانوں کی بیداری کی ایک صدی میں تین عالمی مغربی صہیونی سپر پاورز یکے بعد دیگرے شکست سے دوچار ہو کر اپنی عالمی حیثیت گنوا کر ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو گئیں۔

ہ۔ پاکستان کا مستقبل

علامہ اقبال کے اس ملک پاکستان (جو نظریۂ خودی کی بنیاد اور دو قومی نظریہ کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا) کا مستقبل بڑا تابناک ہے۔ اگرچہ گزشتہ 72 سالوں سے حالات دگرگوں ہیں اور مستقبل قریب میں بھی بہتری کے بظاہر حالات نظر نہیں آتے مگر اوپر درج واقعات سے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے کارنامے کچھ کم نہیں ہیں۔ پاکستان کی آزادی کے بعد اب تقریباً

60 مسلم اکثریت کے علاقے دنیا میں آزاد ممالک کی حیثیت سے ہیں۔اللہ نے چاہا تو جلد ہی یہ مسلمان اُمت اپنے فرض منصبی کو پہچانے گی اور اپنے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کرے گی۔ (ذیل میں 2018ء کی خصوصی اشاعت سے پاکستان کے مستقبل کے بارے میں دوصفحات شامل اشاعت کیے جارہے ہیں۔)

پاکستان ــــ مستقبل کا رول ماڈل

تین اسلامی مملکتوں کا ذکر اوپر آیا ہے یہ سب اہم ہیں مگر سعودی عرب کی بادشاہت میں مغربی دنیا اور اسلامی ممالک کے لیے کوئی ROEL MODLE نہیں ہے۔ افغان طالبان کی حکومت بھی اگرچہ اسلامی نقطہ نظر سے بہت کامیاب تھی مگر قبائلی معاشرہ تھا مغربی اور آج کی ترقی یافتہ دنیا کے لیے نمونہ نہیں بن سکی۔ ایران میں انقلاب آیا مگر بوجودہ وہ بھی نہ عالم اسلام کے لیے نمونہ (ماڈل) بن سکا نہ غیر مسلم دنیا کو متأثر کرسکا۔ان شاءاللہ اسلام کے صدرِ اوّل میں نظامِ عدلِ اجتماعی اسلام کے اصولِ حریت واخوت ومساوات کا کامل نمونہ نظریۂ خودی کی بنیاد پر مستقبل میں پاکستان بننے والا ہے۔

پاکستان معروف معنی میں علماء کے زیر اثر لوگوں نے نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذریعے قائم ہوا۔علی گڑھ نے ہراول دستے کا کام کیا۔سکولوں، کالجوں میں مسلمان گھرانوں کے بچوں نے پاکستان کے لئے گھر گھر کام کیا اور جدید تعلیم یافتہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کے پیغام کو عام کیا۔علی گڑھ کا نام آتے ہی جناب سرسید احمد خان کا نام آجاتا ہے اور مسلمانوں کے نزدیک سرسید احمد خان سے اسلامی عقائد کے باب میں اور قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے لغزشیں ہوئی تھیں۔ وہ سب کی سب نگاہوں میں گھوم جاتی ہیں۔ یہ تمام باتیں اپنی جگہ تاہم ہمارے نزدیک جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں یا علی گڑھ سے تعلیم یافتہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص احسان فرمایا تھا۔سرسید احمد خان کے افکار کی اصلاح کے لئے علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ کو مجدد بنا کر بھیجا ــــ کہ وہ بھی سکولوں کالجوں سے تعلیم یافتہ تھے۔مغرب کی یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرکے لوٹے تھے مگر پھر بھی قرآن وحدیث سے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اُنھیں وارفتگی کی حد تک عشق

تھا۔انھوں نے اسلام کی صحیح ترجمانی کی اور علی گڑھ سے تعلیم یافتہ حضرات یا سرسید احمد خان کے مکتب فکر کے لوگوں کی اصلاح فرمادی۔انگریز نے تو اسی جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے (جو بالعموم سیکولر اور لبرل ہوجاتا ہے۔) مرزا غلام احمد قادیانی کو جھوٹے دعویٰ نبوت کے ساتھ کھڑا کیا تھا کہ یہ سب جدید تعلیم یافتہ ادھر آجائیں گے۔

مگر اللہ تعالیٰ نے علامہ اقبال علیہ الرحمہ کی شکل میں علی گڑھ کے فکر کے لوگوں کے درمیان ایک مجدد پیدا کیا جس نے ان کے افکار کی صحیح خطوط پر رہنمائی کی اور تربیت فرمائی۔اس مقصد کے لئے کلامِ اقبال نے الہامی کلام ہونے کا کام کیا اور بڑے چھوٹوں سب کو متاثر کیا۔ علامہ اقبال نے علی گڑھ والوں کو مغربی افکار سیکولرازم اور لبرل ازم سے بھی بچایا اور قادیانی نبی کی پھیلائی ہوئی گمراہی سے بھی۔الحمد للّٰہ عَلٰی ذالك

◉ پاکستان کے مفکّر علامہ اقبال ہیں۔ ◉ علی گڑھ مکتب فکر کے لیے مصلح ومجدّد علامہ اقبال ہیں۔ ◉ عصر حاضر میں انقلابی فکر کے داعی علامہ اقبال ہیں۔

◉ قدیم وجدید علوم کا نقطہ اتصال علامہ اقبال ہیں۔

لہٰذا ــــــ سعودی عرب اور افغان طالبان کے اسلامی حکومت کے ماڈلز کے بعد پاکستان میں اسلامی حکومت کا ماڈل ابھی آنا ہے۔ یہاں پاکستان میں یہ انقلاب علامہ اقبال کے افکار پر آئے گا اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کی مساعی اور کوششوں سے آئے گا۔ان شاء اللہ

پاکستان میں فکر اقبال کے مطابق، اسلامی حکومت کا عصر حاضر میں یہ نمونہ صحیح اسلامی نمونہ ہوگا جس پر جاگیرداری، زمینداری، سرمایہ داری، خاندانی بادشاہت اور قبائلی معاشرہ ہونے کی چھاپ نہیں ہوگی ــــــ اور یقیناً اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق اور اُسوۂ رسول ﷺ کے عکس کامل کے طور پر 'درویشی کی حکمرانی' کی مثال ہوگی اور یقیناً خلافت راشدہ کا بھی صحیح نمونہ ہوگی۔ وماذالك علی اللّٰہ بعزیز

ضمیمہ جات

اُمت مسلمہ کے لیے نصف یوم کی مہلت

عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِی وَقَّاصٍ،

أَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ:

اِنِّیْ لَأَرْجُوْ أَنْ لَا تَعْجِزَ أُمَّتِی عِنْدَ رَبِّهَا أَنْ يُؤَخِّرَهُمْ نِصْفَ يَوْمٍ، قِيلَ لِسَعْدٍ: وَكَمْ نِصْفُ ذٰلِكَ الْيَوْمِ؟ قَالَ: خَمْسُ مِائَةِ سَنَةٍ

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''میں امید رکھتا ہوں کہ میری اُمت میرے ربّ سے آدھے دن کی مزید مہلت پالینے سے عاجز نہیں ہوگی۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا کہ آدھا دن کتنا ہوگا؟ انہوں نے فرمایا: پانچ سو سال کا''۔

ابوداؤد و مسند احمد، عن سعد ابن وقاص رضی اللہ عنہ

ISLAMIC EDUCATION

Journal of the All-Pakistan Islamic Education Congress

MARCH & APRIL
1968

IN THIS ISSUE

ALL PAKISTAN ISLAMIC EDUCATION CONGRESS
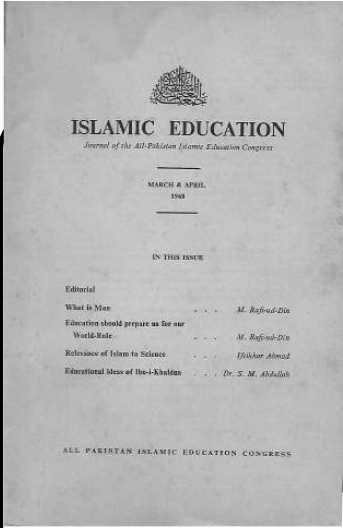
ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا جاری کردہ

ISLAMIC EDUCATION رسالے کے پہلے شمارے مارچ، اپریل 1968ء کا عکس۔ یہ شمارہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے مدیر حکمت بالغہ کو خود جولائی 68ء میں عطا فرمایا تھا جو اُن کے پاس اب تک محفوظ ہے۔

(ادارہ)

ایران کے مشہور شاعر

ملک الشعراء بہارؒ

کا علامہ اقبالؒ کو خراجِ تحسین

عصرِ حاضر خاصّۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں برگزشت

ترجمہ:
موجودہ زمانہ علامہ اقبال کا زمانہ ہے۔ وہ اکیلے ہی (دین کی خدمت میں) ہزاروں سے آگے نکل گئے۔

فِیْ مَدحِ النَّبیِّ صلی اللہ علیہ وسلم
زیں کہکشاں تا لا مکاں [1]
بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ
ہمہ نور [2] کرد ایں خاکداں
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
خُلقش [3] ہمے قرآن گشت
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
با رب [4] چوں باشی ہم زباں
صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ
شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار پر تضمین
[1] النجم 09:53 ۔ [2] المائدۃ 15:05۔
[3] مسند احمد، عن عائشہ رضی اللہ عنہا۔
[4] الاحزاب 56:33

بہ یارانِ طریق

بیا تا کارِ ایں اُمّت بسازیم
قمارِ زندگی مردانہ بازیم!
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر
کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم!

(اُمّت مُسلمہ اور ملّت کا درد رکھنے والو!) آؤ کہ اس اُمّت (کی بھلائی اور بیداری) کے لیے کام کریں اور جواں مردوں کی طرح (اس کام میں) سب کچھ جھونک دیں (تاکہ اللہ آخرت میں ہمیں سرخرو کردے) ہم مسلمانوں کے عوام وخواص کے سامنے یوں نالہ وفریاد کریں کہ مسلمان اہل علم کا دل نرم کردیں (کہ وہ بھی اس کام میں لگ جائیں)

اَلحَمدُ لِلّٰہ

ماہنامہ
حکمتِ بالغہ
جھنگ

اشاعت کے 13 سال 13 خصوصی اشاعتیں

2007ء	حقیقت انسان نمبر	صفحات 96
2008ء	حقیقت علم نمبر	صفحات 96
2009ء	احیاء العلوم نمبر	صفحات 96
2010ء	دو قومی نظریہ اور پاکستان کا نظریاتی نظامِ تعلیم نمبر	صفحات 128
2011ء	حقوقِ نسواں نمبر	صفحات 112
2012ء	یاجوج ماجوج نمبر	صفحات 152
2013ء	الصلوٰۃ والسلام علیٰ رسول اللہ ﷺ	صفحات 160
2014ء	جنوبی ایشیا میں ہندو مسلم نظریاتی کشاکش......	صفحات 168
2015ء	حکمت اقبال ہی نظریۂ پاکستان ہے	صفحات 248
2016ء	اِحیائے فکرِ اقبال نمبر	صفحات 224
2017ء	بادشاہ، پرنس اور ارب پتی یا درویش حکمران	صفحات 280
2018	وسائل رزق پر قبضہ، ارتکاز دولت ......اور	صفحات 304
2019	ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی اقبال شناسی	صفحات 336

خود مطالعہ کریں ـــ دوستوں کو تحفہ دیں ـــ محدود تعداد میں دستیاب ہیں

مکتبہ قرآن اکیڈمی جھنگ

لالہ زار کالونی نمبر 2، ٹوبہ روڈ جھنگ
047-7630861-63
0336-6778561